تحریر
استاذ احمد حسین یعقوب
نظریہ عدالت صحابہ
ترجمہ علامہ جواد
تنظیم المکاتب لکھنؤ

باسمہ سبحانہ

نظریۂ عدالتِ صحابہ

ترجمہ: علامہ السید ذیشان حیدر جوادی

تحریر: استاذ احمد حسین یعقوب

ناشر:

تنظیم المکاتب۔ گولہ گنج۔ لکھنؤ ۱۸ انڈیا

نام کتاب : ــــــــــــ نظریۂ عدالتِ صحابہ
مصنف : ــــــــــــ استاذ احمد حسین یعقوب
مترجم : ــــــــــــ علّامہ السیّد ذیشان حیدر جوادی
کتابت : ــــــــــــ جے۔احمد
سنہ طباعت : ــــــــــــ اکتوبر ۱۹۹۶ء
تعداد : ــــــــــــ ایک ہزار
ناشر : ــــــــــــ تنظیم المکاتب۔گولہ گنج۔لکھنؤ انڈیا

مراکز حصول :

۱۔ دفتر تنظیم المکاتب، گولہ گنج، لکھنؤ ۱۸۔یوپی (انڈیا)
۲۔ جامعہ انوار العلوم، مرزا غالب روڈ، الہ آباد
۳۔ جامعہ جوادیہ، پرہلاد گھاٹ، بنارس
۴۔ مولانا انیس الحسن صاحب قبلہ، A-1 نیو شوکت سوسائٹی، ۱۹ نوروجی ہل روڈ ڈونگری، بمبئی ۹
۵۔ مولانا محمد علی آصف صاحب قبلہ، غازی پور ڈاک خانہ گوگواں، ضلع مظفر نگر
۶۔ تنظیم المکاتب معاون کمیٹی۔ہمدانیہ کالونی بمنہ، سری نگر۔کشمیر

فہرست مضامین

باسمہٖ سبحانہٗ

عرضِ تنظیم

ترجمہ نگاری بظاہر بہت آسان کام ہے لیکن حقیقتاً ایک ایسی ذمہ داری ہے جس کا ادا کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ خود اپنے خیالات کو قلمبند کرنے سے کہیں زیادہ مشکل مرحلہ ہے کہ دوسروں کے خیالات کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا جائے۔

صحیح ترجمہ اسی وقت ممکن ہے جب ترجمہ نگار متعلقہ زبانوں سے واقف ہی نہیں اس کا مزاج آشنا بھی ہو، اور ان باتوں کو بھی اپنی گرفت میں لے سکے جو بین السطور میں پوشیدہ ہوتی ہیں بلکہ اسلوب نگارش اور طرز تحریر کے ذریعے مصنف جس خاص "تاثر" کی تخلیق کرتا ہے اسے بھی دوسری زبان میں منتقل کرنا جانتا ہو۔

لغت کی مدد سے یا ترجموں کے ذریعہ ترجمہ کر لینا بہت آسان ہے مگر اس طرح اصل تصنیف پر کتنا ظلم ہوتا ہے اس سے ارباب نظر ناواقف نہیں۔ کبھی کبھی ترجموں میں ایسی باتیں بھی نظر آتی ہیں جن کا اصل تصنیف میں دور دور پتہ نہیں ہوتا، اور ان حقائق سے ترجمے محروم رہ جاتے ہیں جو اصل تصنیف کی جان ہوتے ہیں۔

اس میں دو رائے نہیں کہ سرکار علامہ جوادی کے ترجمے، ترجمہ بھی ہوتے ہیں اور ترجمانی بھی۔ وہ اصل تصنیف کے مرقومات کے ساتھ اس کی اصل "روح" کو بھی دوسری زبان میں منتقل کر دینے کا ہنر جانتے ہیں۔

تصنیفات کی طرح ان کے ترجموں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ انھوں نے "مومن قریش"، جیسی کتاب کا بھی ترجمہ کیا ہے جو تاریخی ادب کا شاہکار ہے اور ہمارے اقتصادیات۔ جیسی تصنیف، کا بھی ترجمہ کیا ہے، جو فلسفۂ اقتصاد کے موضوع پر عہد آفریں کتاب

ہے۔ وہ موضوع کے مطابق اپنا انداز تحریر بدلنے پر بھی قادر ہیں۔ ان کے ترجموں کا پڑھنے والا ان کی تحریر کے ذریعے اصل کتاب کی روح تک پہونچ جاتا ہے۔ عربی اور فارسی کے علمی سرمائے کو اردو میں منتقل کرکے وہ اردو داں طبقے پر مسلسل احسان کر رہے ہیں۔

زیر نظر کتاب علامہ احمد حسین یعقوب کی معرکۃ الآراء تصنیف "نظریۂ عدالت صحابہ،، کا معرکۃ الآراء ترجمہ ہے۔ عدالت صحابہ کا بے منطق نظریہ بلکہ مفروضہ جس کی تائید کے لئے نہ عقل عامہ تیار ہے نہ قرآن و حدیث۔ مگر شاطران مذہب کے ساتھ سادہ لوح مسلمان بھی اسے صدیوں سے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ بنیادی حیثیت سے یہ موضوع نیا نہیں ہے مگر تاریخی واقعات کی تطبیق اور تاریخی حقائق کی تبیین نئے انداز سے کی گئی ہے۔ اس لئے یہ کتاب علمی دنیا کے لئے یقیناً ایک نیا تحقیقی تحفہ ہے۔ اس کتاب کے مصنف ایک ماہر قانون داں ہیں، ان کی تحریر کا انداز بھی قانونی ہے۔ اس انداز نگارش کو علامہ جوادی نے ترجمے میں بھی ملحوظ رکھا ہے۔

اردو داں طبقے پر علامہ جوادی کا یہ ایک اور احسان ہے کہ انھوں نے اس علمی سرمائے کو علمی دیانت اور ادبی احتیاط کے ساتھ عربی سے اردو میں منتقل کر دیا ہے۔ اللہ ان کی توفیقات میں اضافہ فرماتا رہے اور ان کی گردش قلم کے نتائج ہمارے سامنے آتے رہیں۔

ادارہ فخر ملت الحاج ملا اصغر علی ایم ایم جعفر صاحب صدر خوجہ شیعہ اثناعشری ورلڈ فیڈریشن کا شکر گذار ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داری قبول فرمائی ہے، خدا ان کی اس سعی بلیغ کو قبول فرمائے۔

ادارہ بارگاہ الٰہی میں نذرانۂ تشکر ادا کرتے ہوئے فخر کے ساتھ یہ کتاب قوم کے سامنے پیش کر رہا ہے۔

(ادارہ)

گفتارِ مترجم

مالک کائنات کی قدرت کاملہ کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ مُردہ زمینوں سے زندہ سبزہ ایجاد کرتا ہے اور اس کی رحمت عامہ کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے۔

زیر نظر کتاب کے مصنف علاّمہ احمد حسین یعقوب اسی حقیقت کی زندہ ترین مثال ہیں کہ موصوف عالم اسلام کے "طبقہ سواد اعظم" سے تعلق رکھتے تھے لیکن انھوں نے اپنی ذاتی تحقیق اور اپنے وسیع تر مطالعہ کی بنا پر مذہب اہلبیتؑ اختیار کرلیا اور ایک عرصہ سے اسی جادۂ حق پر گامزن ہیں۔

اس ذیل میں آپ نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں اور ان میں یہ کتاب کئی اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مصنف موصوف علمی استعداد کے اعتبار سے ایک بلند پایہ وکیل ہیں اور مسائل پر جرح و تنقید کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں جس کا اندازہ کتاب کے ہر مطالعہ کرنے والے کو بخوبی ہوسکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے اگرچہ اُس عام موضوع پر قلم اٹھایا ہے جس پر عربی، فارسی میں بھی بہت لکھا گیا ہے اور اردو میں بھی بے پناہ لٹریچر موجود ہے لیکن اس کے باوجود آپ نے گفتگو کا ایک نیا رُخ پیدا کرلیا ہے جس سے موضوع کا بخوبی ادراک کیا جاسکتا ہے اور عالم اسلام میں پائے جانے والے اختلافات کا مکمل اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

صحابیت کی تقدس کے نام پر کتنے فتنے اٹھائے گئے اور کس کس طرح موت کا

بازار گرم کیا گیا اور بالخصوص ایک قوم کو توہین صحابہ کا مجرم قرار دے کر کس کس طرح موت کے گھاٹ اُتارا گیا۔ یہ تاریخ کا انتہائی المناک اور غم انگیز باب ہے۔

علامہ موصوف نے اسی انتہائی خطرناک موضوع پر قلم اُٹھایا ہے لیکن نہایت درجہ احتیاط اور دیانت داری کے ساتھ کہ نہ کسی مسلمان کے جذبات مجروح ہونے پائیں اور نہ حقائق کا خون ناحق ہونے پائے۔

کتاب کی تمام بحثوں میں سب سے زیادہ وقیع اور تحقیقی بحث سقیفہ سے متعلق ہے جس کے بارے میں عام مورخین اور مصنفین نے ہمیشہ یہ تصور دیا ہے کہ رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں کا ایک اجتماع خلیفۂ رسولؐ کے بارے میں ہوا تھا جس میں ہر فریق نے اپنے دلائل پیش کئے تھے اور بالآخر مہاجرین کے دلائل غالب آگئے تھے اور حضرت ابوبکر خلیفۂ رسولؐ مقرر ہو گئے تھے۔

حالانکہ آپ کی تنقید نے یہ بالکل واضح کر دیا ہے کہ یہ صرف ایک تاریخی ڈھکوسلہ ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ دراصل نہ کہیں کوئی اجتماع ہوا تھا اور نہ اس کا کوئی ایجنڈا تھا۔ نہ کسی طرح کا مباحثہ ہوا تھا اور نہ کوئی فریق کسی پر غالب آگیا تھا۔

سعد بن عبادہ مریض تھے اور چند انصار ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت عمر اعلان غدیر کے بعد سے مسلسل اس وقت کا انتظار کر رہے تھے جب رسول اکرمؐ کے اعلان ولایت کو منسوخ کر کے اپنی برادری کے کسی شخص کو خلیفۂ رسول نامزد کر دیں اور اس سلسلہ میں ایک ایک لمحہ کا حساب کئے ہوئے تھے یہاں تک کہ رسول اکرمؐ نے لشکر اسامہ میں جانے کا حکم بھی دے دیا اور نہ جانے والوں پر لعنت بھی کر دی لیکن آپ نے مدینہ چھوڑنے کا ارادہ نہیں کیا اور مسلسل حالات کا جائزہ لیتے رہے۔

انصار کے اس اجتماع کو دیکھ کر آپ نے اپنے دو ساتھیوں کو ساتھ لیا اور اس اجتماع میں پہونچ گئے۔ وہاں پہونچکر خلافت کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ لوگوں نے کہا کہ یہ مسئلہ تو غدیر خم میں طے ہو چکا ہے۔

آپ نے فوراً فرمایا کہ:

"عرب ایک خاندان میں رسالت اور خلافت کو نہیں دیکھ سکتے ہیں لہٰذا اسلام خطرہ میں ہے اور اسے خطرہ سے بچانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ خلیفہ اس گھرانے سے باہر کا کوئی شخص ہو اور اس کام کے لئے ہر خاندان اور ہر قبیلہ کو موقع دینا چاہیے۔"

گویا کہ اسلام عربوں کے خاندان کا کوئی مذہب ہے اور اس میں ان کی پسند اور ناپسند بھی کوئی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ بہر حال چند عدد موجود افراد میں تکرار ہوگئی اور فی الفور ابو بکر کا نام پیش کر دیا گیا اور اس کی دلیل بھی وہی قرار دی گئی جس کا چند لمحہ پہلے انکار کیا گیا تھا۔ یعنی "قرابت رسولؐ"۔ اور حضرت ابو بکر کو خلیفہ نامزد کر دیا گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ خلیفہ کے انتخاب کا اجتماع تھا تو ایک لاکھ ۲۴ ہزار اصحاب میں سے صرف چند عدد اصحاب کی شرکت کے کیا معنی ہیں؟

کیا مہاجرین میں تین افراد کے علاوہ کوئی چوتھا اس بات کا اہل نہیں تھا کہ اسے شرکت کی دعوت دی جاتی۔؟

اور کیا انصار کی کُل تعداد صرف انگلیوں پر گنی جانے والی تھی اور باقی افراد کسی اور علاقہ میں آباد تھے۔؟

اور کیا بنی ہاشم اس قابل نہیں تھے کہ انھیں اس انتخاب کی اطلاع کی جاتی۔ چاہے وہ شرکت کرتے یا نہ کرتے۔؟

یہ سوالیہ نشانات اس بات کی دلیل ہیں کہ انتخاب خلیفہ کے نام پر کوئی جلسہ نہیں ہوا تھا بلکہ ہوشیار مہاجرین نے اپنے پرانے منصوبہ کی بنا پر اس مختصر سے اجتماع کو غنیمت جانا اور باقی لوگوں کو "وفات پیغمبرؐ" کے قول کی بنا پر قتل کی دھمکی دے کر اندھیرے میں رکھا اور اسطرح ایک "ناگہانی" انتخاب ہوگیا جس کا اسلام اور روح اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور اس کی بہترین دلیل یہ ہے کہ آج بھی دشمنانِ اسلام اسی "اسلام سقیفہ" کی پشت پناہی کر رہے ہیں اور ان سے "غدیری اسلام" برداشت نہیں ہو رہا ہے۔

مصنف نے اس مسئلہ کو نہایت درجہ خوبصورتی کے ساتھ اور تحقیقی انداز سے پیش کیا

ہے کہ ہر با انصاف پڑھنے والا حقائق پر غور کرنے پر مجبور ہو جائے اور اسے "زر خرید مورخین" کی دیانت داری اور حقیقت نگاری کا مکمل اندازہ ہو جائے۔

میرے خیال میں اس موضوع پر اس انداز سے اس سے قبل نہیں لکھا گیا ہے لٰہذا یہ کتاب قابل قدر، قابل تحسین اور قابل استفادہ ہے۔ مسلمانانِ عالم سے گذارش ہے کہ ٹھنڈے دل سے اس کتاب کا مطالعہ کریں اور یہ سوچیں کہ مال و دولت، جاہ و حشم، کرسی و اقتدار، منصب و جاگیر کو دوام نہیں ہے۔ دوام صرف ایمان صحیح اور عمل صالح کو ہے اور بارگاہِ احدیت میں یہی چیزیں کام آنے والی ہیں۔

رب کریم تمام مسلمانوں کو شعور دین اور بصیرت یقین عطا فرمائے اور ان حقائق پر سنجیدگی سے غور کرنے کی توفیق دے۔

والسّلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

★ ——————— جوادی

بسمہ سبحانہ

مقدمہ

خدایا۔ ! میں تیری وہ تعریف کر رہا ہوں جو تیرے علم محیط اور تیری رحمت واسعہ کے اعتبار سے بے پناہ ہے اور تیری ربوبیت اور میری عبودیت کے شایان شان ہے۔

اور اسی کم وکیف کے ساتھ تجھ سے استغفار بھی کر رہا ہوں جیسا کہ تو نے خود ارشاد فرمایا ہے اور تیری بارگاہ میں توسل کا بھی طلبگار ہوں کہ تو اپنے کرم سے میرے تمام گناہوں کو معاف کردے گا جس کا تو نے وعدہ بھی فرمایا ہے ۔ اور تیرا وعدہ غلط نہیں ہوتا ہے۔

مالک ۔ ! میں تیرے عظیم نام، بلند مرتبہ، مکمل کلمات کے وسیلہ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ اپنے رسول حضرت محمدؐ پر رحمت نازل فرما جنھیں تو نے اسلام جیسا دین دے کر بھیجا تو انھوں نے اس کی مکمل وضاحت اور تشریح کی اور پھر ماننے والوں کو تیری بارگاہ تک پہونچانے کا کامل انتظام کیا۔

خدایا۔ ! پیغمبر اسلامؐ اور ان کی پاکیزہ آل پر رحمت نازل فرما جو صاحبان فضل وتقویٰ اور نجوم امان وہدایت ہیں۔ وہ ایسے نجات کے سفینے ہیں جنھیں تو نے مخصوص فضائل عنایت فرمائے ہیں اور تمام اہل ملت پر مقدم رکھا ہے اور ان پر صلوات کو نماز واجب کا اہم رکن قرار دیا ہے تاکہ ان کی منزلت کی مسلسل یاد دہانی ہوتی رہے۔ (اگر یہ یاد دہانی فائدہ بخش ہو سکے ۔ اور یاد دہانی صرف صاحبان ایمان کو فائدہ پہونچاتی ہے۔)

امابعد۔ مالک کائنات کا وہ حقوقی نظام جسے اسلام نے پیش کیا ہے۔ اپنے اجمال وحقیقت اور اپنی تفصیل وتشریح میں ایک مکمل الٰہی منصوبہ ہے جسے نہایت درجہ استحکام کے ساتھ تیار کیا گیا ہے اور اس کا مقصد نوع بشر کو سیدھے راستہ کی ہدایت کرنا اور اسے دنیا وآخرت میں ہر طرح کی سعادت سے بہرہ ور کرنا ہے۔

یہ نظام اپنی طبیعت اور اپنی خدائی تکوین کے اعتبار سے جزم ویقین اور علم وقطع کی بنیادوں پر قائم ہے اور اس کا حساب دنیا کے دوسرے حقوقی نظاموں جیسا نہیں ہے جن کی اساس صرف ظن وتخمین پر قائم ہے اور ان کا قطع ویقین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اور اس حقیقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ نظام صرف قواعد ونظریات کی حد تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے عالم تطبیق میں بھی قدم رکھا ہے اور نظر سے عمل تک کا راستہ طے کر کے کلمہ کو حرکت کی شکل دے دی ہے اور نہایت درجہ خوبصورتی کے ساتھ دھیرے دھیرے میدان عمل میں یوں قدم رکھا ہے کہ ایک دن اس کی حیثیت ایک پیغام کی تھی جس کے مُبلّغ سرکارِ دو عالمؐ تھے اور ایک دن ایک حکومت کی ہو گئی جس کی قیادت سرکارِ دو عالمؐ فرما رہے تھے۔ اور اس انطباق کے نتیجہ میں ایک امت وجود میں آگئی جو خیر امت کہے جانے کے قابل تھی اور ایک حکومت قائم ہو گئی جو بے مثل وبے نظیر تھی۔

رسول اکرمؐ ابھی بستر مرگ پر تھے اور آپ کے انتقال کو چند ہی لمحہ گذرے تھے کہ کشمکش اور سیاسی انحرافات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور اسی کے ساتھ حقائق کی پردہ پوشی اور سلامتی کے مظاہرہ کا کاروبار بھی شروع ہو گیا۔ اربابِ سیاست کا خیال تھا کہ وہ اس پردہ پوشی کے ذریعہ حالات پر قابو پالیں گے اور انحرافات کا سلسلہ پہلی ہی منزل پر رُک جائیگا اور نہ کسی کو خبر ہو سکے گی اور نہ کوئی طعنے دے سکے گا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا اور انحرافات کا سلسلہ ادوار تاریخ کے ساتھ چلتا رہا اور ہر تباہی کے بعد ایک نئی تباہی سامنے آتی رہی یہاں تک کہ اسلام کا سیاسی نظام صرف ایک ڈھانچہ بن کر رہ گیا جس کا نام دینِ اسلام تھا اور پھر عثمانی سلطنت کے زوال کے ساتھ وہ بھی ختم ہو گیا اور یہ نام بھی پردۂ راز میں چلا گیا۔

اب مسلمانوں کو ہوش آیا بھی تو امت اسلامیہ ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی اور اس کے مقدر میں حیرت وبربادی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اب اگر وہ متحد ہونا بھی چاہتی تو کوئی امکان نہ تھا کہ بقول استاد عقاد:۔ "حکومتِ اسلامی" حکومتوں میں تبدیل ہو چکی تھی اور حریم اسلام کی حیثیت اس دسترخوان کی تھی جس پر ساری قومیں نظریں جمائے ہوئے ہوں۔ سارے ماحول پر جنگل کا نظام غالب تھا۔ مادیت اپنے پنجے گاڑ چکی تھی۔ زمانہ سراب کے پیچھے دوڑتا رہا اور پھر

بھی یہ خیال تھا کہ بہتے ہوئے ناسور کے روکنے کا علاج دریافت ہو گیا ہے اور ساری دنیائے بشریت کو اسی راستہ پر آجانا چاہیئے جہاں مہربانی کے نعرے لگائے جا رہے ہیں اور مریض کو زبردستی مفروضہ دوا پلائی جا رہی ہے۔

ابھی مسرت کے نغمے اور فرحت کے طبل کی آواز موقوف نہیں ہونے پائی تھی کہ دنیا پر یہ واضح ہو گیا کہ جس کو علاج تصور کیا تھا وہ صرف ایک وہم تھا اور اس کا علاج سے کوئی تعلق نہیں تھا جیسا کہ ماضی قریب میں اشتراکیت کے بارے میں دیکھا جا چکا ہے۔

یہ انحرافات کیوں پیدا ہوئے؟۔ ان کا سلسلہ مختلف ادوار تاریخ میں کیوں چلتا رہا؟ اسلام کا سیاسی نظام ایک ڈھانچہ بن کر کیوں رہ گیا؟ اور اس کی واقعیت و معنویت کا خاتمہ کیوں ہو گیا؟ پروردگار کے حقوقی نظام کا عمل کیوں معطل ہو گیا اور عالم بشریت اسلام کے واقعی علاج اور اس کے حقوقی نظام سے استفادہ سے کیوں محروم ہو گیا؟۔

ان تمام مصائب و آلام کا راز کہاں چھپا ہوا ہے اور ان تمام بلاؤں کا سرچشمہ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ خود نظام تو نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ وہ مالک کا بنایا ہوا ہے اور اس کی صفت محکم اور مستحکم ہوتی ہے اور اس میں کسی طرح کے نقص کا امکان نہیں ہوتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تباہی کا کل راز ان افراد کے اندر پوشیدہ ہے جنھوں نے اسلام کی سیاسی تاریخ تشکیل دی ہے اور اس کی قیادت کا کام سنبھالا ہے یا اس امت میں پوشیدہ ہے جس نے ان کے ساتھ مل کر اس تاریخ کو تیار کیا ہے ــــ یا دونوں ہی اس تباہ کاری کے ذمہ دار ہیں۔

عالم اسلام کے تمام مذہبی گروپ جو اندھی تقلید کے قائد اعظم ہیں اور امت میں آلام و محن کی تجارت کر رہے ہیں۔ انھوں نے تمام اوراق کو مخصوص مقاصد کے تحت خلط ملط کر دیا ہے اور پوری طاقت سے لوگوں کو یہ سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ ان کی اسلامی فکر ہی اصل میں اسلام ہے اور ان کی فکر اور اسلام کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ گویا کہ یہ ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں اور ان کی حقیقت ایک ہی ہے۔

حالانکہ ہر صاحب عقل جانتا ہے کہ اسلام خدائی تخلیق ہے اور فہم اسلام فکر بشر کا

نتیجہ ہے اور دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ دوسری طرف ان گروہوں نے یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کی وہ سیاسی تاریخ جسے وفات پیغمبرؐ کے بعد مسلمانوں نے تیار کیا ہے اور جس کا سلسلہ سلطنت عثمانیہ کے زوال کے ساتھ تمام ہو گیا، وہی سیاسی نظام ہے جسے مالک کائنات نے اپنے پیغمبرؐ پر عالم بشریت کی سیاسی قیادت کے لئے نازل کیا تھا اور یہ لوگ اپنے ان بیانات میں بالکل سنجیدہ نظر آتے ہیں حالانکہ انھوں نے اس کوشش کے ذریعہ فہم اور مفہوم کے فرق کو مٹا دیا ہے اور فرع کو اصل سے آگے بڑھا دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اللہ کا بنایا ہوا حقوقی نظام ان اجتہادات میں تبدیل ہو گیا ہے جو اس کے زیر سایہ پیدا ہوئے ہیں اور اسلامی گروہ ان اجتہادات سے دل تنگ ہونے کے بجائے اس اصل نظام سے دل تنگ ہونے لگے جس کو سمجھنے کے لئے اجتہاد کا دروازہ کھولا گیا تھا۔

اصلی اسلام پر مسلسل دباؤ کا نام فکر کی کشادگی ہو گیا اور اہل نظر کو دعوت دی جانے لگی کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ صرف شرط یہ ہے کہ وہ فکر احزاب کی فکر سے مختلف نہ ہو ورنہ اس کا اعلان بھی ممنوع قرار پا جائے گا۔ خدا جانے کہ اس صورت حال میں حریت فکر کے نعرہ کی تصدیق کون کرے گا اور کس طرح کرے گا۔؟

یہ ہے دینی گروہوں کا تحفہ عصر جدید کے لئے ۔! کہ جو اسلام عالم بشریت کو آزاد کرانے اور اس کے تمام ضروریات و مسائل کا علاج کرنے کے لئے آیا تھا وہ اپنے ماننے والوں ہی کے لئے دل تنگی کا سبب بن گیا اور انھیں کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا ۔ یہ ہے مسلمانوں کا مبلغ علم ۔ اور پھر بھی ان کا تصور یہ ہے کہ وہ کوئی نیک کام انجام دے رہے ہیں۔

میں نے اس کتاب میں تمامتر کوشش کی ہے کہ میں یہ بات واضح کر سکوں کہ جس نظام کو خدا نے نازل کیا تھا وہ اور تھا اور جو کچھ ہم سمجھ رہے ہیں وہ کچھ اور ہے ۔ اور پیغمبر اسلامؐ کے بعد پیدا ہونے والی تباہیوں کا راز دین کے اندر پوشیدہ نہیں تھا اور نہ الٰہی نظام میں کسی طرح کا نقص یا عیب تھا اس کا تمامتر سبب وہ مسلمان تھے جنھوں نے نعمت الٰہی میں تبدیلی پیدا کر دی اور قانون کو خواہش کے سانچہ میں ڈھال دیا۔ مصیبت کی جڑ یہاں ہے اور خدا تک جانے کا راستہ یہیں سے ملتا ہے ۔

اپنی بحث کو اصولی، بنیادی اور آسان تر بنانے کے لئے میں نے اس کتاب کو چار حصّوں پر تقسیم کر دیا ہے:

پہلے حصہ میں صحابیت کے مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں اس مفہوم کی تاریخی جڑوں کو تلاش کیا گیا ہے۔ تیسرے حصہ میں اسلامی مرجعیت کی تشریح کی گئی ہے۔ اور چوتھے حصہ میں سیاسی قیادت سے بحث کی گئی ہے اس لئے کہ دینی مرجعیت سیاسی قیادت سے گہرا ارتباط رکھتی ہے اور ایک کے بغیر دوسرے کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔

کتاب کا مطالعہ کرنے والا انسان اس امر کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ تمام بحثیں ایکدوسرے سے مکمل طور پر مربوط ہیں اور میں نے ہر مسئلہ میں پہلے اہلسنت کی رائے کو پیش کیا ہے کہ یہی مشہور اسلامی فکر ہے جس کے اصحاب نے طول تاریخ میں اسلام کی قیادت کا کام انجام دیا ہے اور اس رائے کو بھی ان کی معتبر مآخذ سے حاصل کیا ہے۔ اس کے بعد اہل تشیع کی رائے کا تذکرہ کیا ہے کہ یہ بھی ایک اسلامی فکر ہے جس نے ہر دور میں رائج الوقت نظام سے اختلاف کیا ہے اور اس رائے کو بھی ان کی معتبر کتابوں سے اخذ کیا ہے۔ اس کے بعد عاشقانِ حق و حقیقت کے سامنے ہر موضوع سے متعلق اسلام کی رائے کا بھی اظہار کر دیا ہے تاکہ لوگوں کو یہ اندازہ ہو جائے کہ اسلامی فکر کس جماعت کے ساتھ ہے اور صاحبانِ حق و حقیقت کو کس راستہ کو اختیار کرنا چاہیئے۔

خدا کا شکر ہے کہ میری یہ بحث شکل، موضوع اور منہج ہر اعتبار سے میرے علم کے مطابق فرید روزگار ہے اور اس دور میں کسی عرب اہلسنت نے پہلی مرتبہ اس قدر تام و کامل اور سنجیدہ موضوعی بحث کی ہے اور اس قدر معلومات اور مراجع و مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔

میں ان تمام مباحث میں بنی ہاشم سے بالعموم اور آل محمدؐ سے بالخصوص اپنی محبّت کو پوشیدہ نہیں رکھ سکا اور نہ مجھے اس سلسلہ میں کسی ملامت کی پرواہ ہے۔ اس لئے کہ میری نظر میں یہ حضرات قرآن کے ساتھ ثقلین کا ایک حصہ ہیں اور ان دونوں کے بغیر ہدایت کا حصول ناممکن ہے جیسا کہ نصوص قطعیہ میں واضح کیا جا چکا ہے۔

ان کی محبّت پر کوئی کیا ملامت کرے گا جب کہ یہ حضرات بنص پیغمبرؐ "سفینۂ نجات" اور "نجوم امان و ہدایت" ہیں اور یہی امت کے تمام مسائل کا واحد حل ہے۔ رسول اکرمؐ کی

حیثیت تمام عالم اسلام میں ایک مشترک حیثیت ہے لہٰذا اگر محبت و قیادت کو انھیں کی اولاد میں رکھا جائے گا تو تمام پاکیزہ نفوس کو اطمینان حاصل ہوگا اور تمام خبیث نفوس سے حرص و طمع کے جذبات نکل جائیں گے اور باہمی مقابلہ کے بجائے سکون و استقرار کی حکومت ہوگی۔

اولاد رسولؐ کے اسلام پر احسانات کے بارے میں اتنا ہی کافی ہے کہ انھوں نے رسول اکرمؐ کی حمایت و حفاظت کی ہے اور تین سال تک شعب ابی طالب کے محاصرہ میں پیغمبر اکرمؐ کا ساتھ دیا ہے جب کہ عالم عربیت کا اجتماعی مطالبہ صرف یہ تھا کہ بنی ہاشم محمدؐ کو عرب کے حوالے کر دیں یا کم سے کم اپنی حمایت کو واپس لے لیں تاکہ عرب ان کی زندگی کا خاتمہ کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ اگر بنی ہاشم نے اس مطالبہ کو منظور کر لیا ہوتا تو اسلام کا نام و نشان بھی نہ ہوتا اور مرسل اعظمؐ اسی طرح درجۂ شہادت پر فائز ہو جاتے جس طرح انبیاء کرام قتل ہوتے رہے تھے۔

اس کے بعد بنی ہاشم کے مجاہدات اور ان کی قربانیوں کا انکار بھی ناممکن ہے کہ یہ ایک "مشت نمونہ از خروارے" ہے جو ان سے میری عقیدت و محبّت کی بنیاد ہے اور جس کے بعد کسی کو میری ملامت کرنے کا حق نہیں ہے۔

خدایا! تو میرے ظاہر و باطن سے باخبر ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ میں صرف تیری رضا کا طلبگار ہوں۔ اگر اپنے مقصد تک پہونچ گیا تو یہ تیرا کرم ہے تو بہترین مولا اور بہترین مددگار ہے۔ اور اگر کہیں لغزش ہو گئی تو یہ میری اپنی کمزوری ہوگی۔

پھر بھی میری التماس یہی ہے کہ میرے اس عمل کو اپنی ذات کے لئے خالص اور محمدؐ و آل محمدؐ کی بارگاہ میں میرا ایک حقیر ہدیہ قرار دیدے بلکہ ہر ہاشمی اور مطلبی فرد کے لئے ایک نذرانۂ عقیدت بنا دے۔ میرا یہ عمل وہ کار خیر قرار پائے جو غلطیوں کا ازالہ کر سکے اور مجھے تیری بارگاہ سے قریب تر بنا سکے اور میری آخری گذارش بھی ہے کہ ساری تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو عالمین کا پالنے والا ہے۔

المولّف

بابِ اوّل

مفہومِ صحابہ وصحابیت

فصل اول

مفہوم صحابہ وصحابیت

۱۔ صحابہ کے لغوی معنی

ا۔ کتب لغت میں

لفظ اصحاب یا صحابہ عربی قواعد کے اعتبار سے صحب، یصحب۔ صُحبۃً یا صَحَابۃً سے نکلا ہے جس کے معنی ساتھ رہنے، معاشرت، رفاقت، مجالست، اطاعت اور مشایعت کے ہیں۔

۔ صاحب ساتھ رہنے والے، مطیع، ہمنشیں، رفیق، ذمہ دار اور نگراں کو کہا جاتا ہے۔

۔ کسی مذہب کے ماننے والے کو بھی لفظ صاحب سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسے اصحاب امام صادقؑ، اصحاب ابو حنیفہ، اصحاب شافعی وغیرہ۔

۔ اصطحاب باہمی مصاحبت کا نام ہے اور اونٹ کے لئے یہ لفظ اطاعت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے[۱]

ب۔ قرآن کریم میں

مالکِ کائنات نے قرآن کریم کو واضح عربی زبان میں نازل کیا ہے اور وہ اپنی

---

[۱] تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیں۔ لسان العرب جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور ۱/۵۱۹، تاج اللغۃ اسماعیل بن حماد الجوہری ص ۱۶۱-۱۶۲، تاج العروس محمد مرتضیٰ الحسینی زبیدی ۱۸۶/۲، المعجم الوسیط ابراہیم مصطفیٰ ۱/۵۰۹-۵۱۰، قاموس المحیط فیروز آبادی مجدی بن محمد یعقوب، مختارات الصحاح ابوبکر رازی ص ۳۵۶۔

جامعیت کے ایک رُخ سے عربی زبان کا بھی تنہا مرجع ہے جس سے یقینی طور پر زبان کے مفاہیم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس مالک کائنات کا کلام ہے جس سے بہتر کوئی زبان کے دقیق ترین نکات کا جاننے والا نہیں ہے۔

۔ قرآن مجید میں اس سلسلہ میں حسب ذیل تعبیرات پائی جاتی ہیں" تصاحبنی۔ صاحبھما۔ صاحب، صاحبۃ، اصحاب، اصحابھم۔ اور ان کلمات کی ۹۷ مقامات پر تکرار ہوئی ہے لیکن یہ قابل توجہ بات ہے کہ اس قدر کثیر مقامات کے باوجود کہیں لفظ صحابہ یا صُحبت استعمال نہیں ہوا ہے۔

ج۔ آیات اور معانی لغویہ

قرآن مجید کے استعمالات کا مکمل جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں لغت کے تمام معانی پائے جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے صحبت کو ایک رُخ بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کے مختلف رُخ بھی ہو سکتے ہیں اور ممکن ہے کہ کوئی ایک ایسے جامع معنی بھی ہوں جس میں خیر یا شر کے تمام رُخ جمع ہو جائیں۔

د۔ صحبت کی مختلف شکلیں

۔ مصاحبت کبھی مومن اور مومن کے درمیان ہوتی ہے۔ (سورہ کہف آیت ۲۶، تفسیر ابن کثیر ۳/۹۲-۹۳)

۔ کبھی فرزند اور مختلف العقیدہ والدین کے درمیان ہوتی ہے۔ (سورہ لقمان آیت ۱۵، ابن کثیر ۳/۴۴۴)

۔ کبھی دو رفقاءِ سفر کے درمیان ہوتی ہے۔ (نساء ۳۶۔ ابن کثیر ۱/۴۹۴)

۔ کبھی ایک تابع اور ایک متبوع کے درمیان ہوتی ہے۔ (توبہ ۴۰۔ ابن کثیر ۲/۳۵۸)

۔ کبھی ایک مومن اور ایک کافر کے درمیان ہوتی ہے۔ (کہف ۳۴-۳۷، تفسیر ابن کثیر ۳/۸۳)

۔ کبھی ایک کافر اور دو کافرین کے درمیان ہوتی ہے۔ (قمر ۲۹۔ تفسیر ابن کثیر ۴/۲۵۶)

۔ کبھی نبی اور قوم کے درمیان ہوتی ہے کہ نبی قوم کو خیر کی طرف کھینچتا ہے اور قوم نبی

کو شر کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ (نجم ۲۔ سبا ۱۴۔ تفسیر ابن کثیر ۳/ ۵۴۳، ۴/ ۲۴۶)
۔ کبھی یہ مصاحبت اضطراری ہوتی ہے۔ (یوسف ۴۱۔ تفسیر ابن کثیر ۲/ ۴۷۹)
۔ کبھی ایک فاسد کے دوسرے فاسد کی اقتدار کے انداز سے ہوتی ہے۔ (ذاریات ۵۹۔
تفسیر ابن کثیر ۲/ ۲۳۸)
۔ کبھی یہ صحابیت عقیدۂ الٰہیہ کی اطاعت اور اس کی سیاسی قیادت کی مطلق محبّت کے انداز سے ہوتی ہے جس طرح آل محمدؑ نے عقیدہ الٰہیہ کی مطلق اطاعت کی ہے اور پیغمبر اکرمؐ کی سیاسی قیادت کا مطلق اتباع کیا ہے اور اس راہ میں عظیم قربانیاں دی ہیں یا پھر حضورؐ کے مخلص اصحاب نے آپ کی اطاعت و محبّت کا اظہار کیا ہے کہ گویا صحابیت کا محور ایک عام مرکز ہے جس کی بنیاد عقیدہ، قیادت اور اعلیٰ اقدار پر قائم ہے جن کی تنفیذ اور مخصوص معاشرہ پر حکمرانی کے لئے قائد ساری کوششیں صرف کر دیتا ہے۔ (سلسلۂ مقالات جریدہ اللواء اردن ۹۱-۹۲ء)

۲۔ صحابہ کے اصطلاحی معنی

ابن حجر عسقلانی کا بیان ہے کہ "صحابی ہر وہ شخص ہے جس نے ایمان کے ساتھ حضور کی زیارت کی ہو اور پھر اسلام ہی پر دنیا سے رخصت ہو گیا ہو۔" (الاصابہ فی تمییز الصحابہ احمد بن علی بن محمد بن علی الکنانی العسقلانی الشافعی المعروف بابن حجر ص ۱۰)

۱۔ اس تعریف کی توضیح

۱۔ اس تعریف میں ہر زائر پیغمبرؐ شامل ہے چاہے دیر تک خدمت پیغمبرؐ میں رہا ہو یا مختصر صحبت رہی ہو۔

۲۔ اس تعریف میں روایت کرنے والے اور نہ کرنے والے دونوں شامل ہیں۔

۳۔ اس تعریف میں حضرت کے ساتھ جہاد کرنے والے اور نہ کرنے والے دونوں شامل ہیں۔

۴۔ اس تعریف میں وہ زائر بھی شامل ہے جسے شرف ہم نشینی نہ حاصل ہو۔

۵۔ اس تعریف میں وہ بھی شامل ہے جو نابینا ہونے کی بنا پر حضرت کو نہ دیکھ سکا ہو۔

دوسری طرف ایمان کی قید سے حسب ذیل افراد خارج ہو گئے:

۱۔ جن لوگوں نے دوسروں پر ایمان کے ساتھ حضرت سے ملاقات کی جیسے اہل کتاب قبل بعثت۔

۲۔ ان لوگوں کا داخلہ بھی زیر بحث ہے جنھیں بعثت سے پہلے یہ ایمان حاصل تھا کہ عنقریب بعثت ہونے والی ہے جیسے بحیرۂ راہب وغیرہ۔

۳۔ البتہ وہ تمام مکلف داخل ہوگئے جو صاحبانِ ایمان تھے چاہے انسان ہوں یا جنات۔

۴۔ ابن اثیر کا ابو موسیٰ پر یہ اعتراض کہ انھوں نے بعض جنات کو دفتر صحابیت سے برخاست کر دیا ہے غلط نہیں ہے۔

۵۔ ابن حزم کا کہنا ہے کہ اگر کوئی جنات کے صحابہ سے اخراج پر اجماع کا دعویٰ کرے تو اس نے امت پر افترار کیا ہے اس لئے کہ خود پروردگار نے بعض جنات کے قرآن سُن کر ایمان لانے کی خبر دی ہے۔

۶۔ ملائکہ کا مسئلہ البتہ زیر بحث ہے۔ فخر الدین رازی نے اسرار التنزیل میں اجماع کا دعویٰ کیا ہے کہ حضور ملائکہ کے واسطے رسول نہیں تھے۔ حالانکہ یہ بیان قابلِ اعتبار نہیں ہے اس لئے کہ شیخ تقی الدین سبکی نے آپ کے ملائکہ کی طرف رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور مختلف دلائل بھی قائم کئے ہیں۔

۷۔ اسلام پر مرنے کی شرط سے وہ تمام لوگ خارج ہوگئے جنھوں نے ایمان کے ساتھ ملاقات کی لیکن بعد میں مرتد ہو کر مرگئے جیسے کہ عبید اللہ جحش جو ام حبیبہ کا شوہر تھا۔ انھیں کے ساتھ اسلام لایا۔ حبشہ کی طرف ہجرت کی اور وہاں جا کر عیسائی ہوگیا اور پھر مرگیا یا عبد اللہ بن خطل جو غلاف کعبہ سے وابستہ ہونے کی حالت میں قتل کیا گیا ہے۔

۸۔ البتہ وہ لوگ داخل ہوگئے جو مرتد ہونے کے بعد دوبارہ واپس آگئے اور حالت اسلام پر مرگئے چاہے دوبارہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں — اور یہی بات صحیح اور قابل اعتماد ہے جس کی پہلی شق میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہے اور دوسری شق کے بارے میں اگرچہ بعض علمار نے اختلاف کیا ہے لیکن یہ اختلاف ناقابلِ قبول ہے اس لئے کہ علمار اہلِ حدیث کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ابن قیس صحابہ میں ہے اور اس کی حدیثیں صحاح اور مسانید میں موجود ہیں اگرچہ وہ مُرتد ہونے کے بعد خلافت ابوبکر میں دوبارہ اسلام میں داخل ہوا تھا۔

ب۔ ابن حجر کی نظر میں اس تعریف کی اہمیت

یہ تعریف اس صحیح مسلک کی بنا پر ہے جسے محققین کرام۔ بخاری اور ان کے شیخ احمد بن حنبل وغیرہ نے اختیار کیا ہے۔ اگرچہ اس کے مقابلہ میں دیگر نادر اقوال بھی ہیں۔ مثلاً:

۱۔ صحابیت میں چار اوصاف میں سے کسی ایک کا ہونا ضروری ہے:

ا۔ زمانۂ صحابیت طویل ہو۔

ب۔ اس کی روایت محفوظ کی گئی ہو۔

ج۔ اس کے غزوات کا ذکر ہو۔

د۔ وہ رسول اکرمؐ کے سامنے شہید ہو جائے۔

۲۔ صحابیت میں بالغ ہونے کی شرط ہے یا کم سے کم مختصر مجالست ہو۔

۳۔ صحابیت کے لئے صرف حضورؐ کو دیکھ لینا کافی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ سن تمیز کو پہونچ گیا ہو ورنہ چھوٹے بچہ کی رویت کو دیکھنا نہیں کہا جاتا ہے۔ البتہ اگر حضورؐ نے اسے دیکھ لیا ہے تو اس اعتبار سے اسے صحابی کہا جا سکتا ہے اگرچہ اپنے دیکھنے کے اعتبار سے وہ تابعی ہی رہے گا۔

صرف کلام یہ رہ جاتا ہے کہ اگر کسی نے حضورؐ کو مرنے کے بعد دفن سے پہلے دیکھ لیا ہے جیسے کہ ابو ذویب الہذلی الشاعر کے بارے میں کہا جاتا ہے تو اس کا شمار اصحاب میں ہوگا یا نہیں۔ یہ مسئلہ محل نظر ہے اور افضل یہی ہے کہ اسے داخل نہ کیا جائے۔

ج۔ وسائل معرفت صحابہ

بہترین بات یہ ہے کہ تواتر کے ذریعہ اس کی صحابیت ثابت ہو یا اس کے بعد شہرت عام کے ذریعہ۔ یا کسی صحابی کے بیان کے ذریعہ ہو کہ فلاں شخص بھی صحابی ہے یا کسی تابعی کا بیان ہو بشرطیکہ اس مسئلہ میں ایک آدمی کا قول معتبر ہو جیسا کہ حق یہی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ ثابت العدالۃ ہے اور وہ خود یہ کہے کہ میں صحابی ہوں تو اس کا قول بھی معتبر ہے۔

عدالت کی شرط آمدی وغیرہ نے اس لئے ضروری قرار دی ہے کہ صحابی بہر حال عادل ہوتا ہے تو اگر صرف اس کے کہنے سے اسے صحابی مان لیا گیا تو گویا اسے عادل مان لیا گیا اور عدالت صرف اپنے ادعا سے ثابت نہیں ہوتی ہے۔ اس کے لئے الگ سے ثبوت درکار ہے۔

اس سے بالاتر ہمعصر ہونے کا مسئلہ ہے کہ اس کا ہجرت سے ۱۱۰ سال بعد کے اعتبار سے کیا جائے گا کہ بعض افراد نے اس سے زیادہ مدت گذرنے کے بعد صحابیت کا دعویٰ کیا تو علماء نے اسے رد کر دیا کہ جب تک کسی کی عدالت ثابت نہ ہو جائے اس کی صحابیت ثابت نہیں ہو سکتی ہے جیسا کہ آمدی نے بیان کیا ہے۔

د۔ ساری قوم صحابہ ہے

یہ بات طے شدہ ہے کہ دعوت پیغمبر اسلامؐ جس کے نتیجہ میں ایک حکومت قائم ہوئی اور اس کی ریاست و قیادت دس سال تک خود سرکار دو عالمؐ کے ہاتھوں میں رہی جس میں آپ نے اسلام کے سیاسی نظام کی بنیادیں مستحکم فرمائیں اور اسلامی قوانین کو نظریہ سے تطبیق کی منزل تک پہونچایا اور اسلام کی عمومی روح کو مکمل طور سے واضح فرما کر ایک حکومت قائم کر دی جس کے عموماً تین ارکان تھے:

۱۔ قوم ۲۔ علاقہ جہاں قوم رہتی ہے ۳۔ نظام جو قوم کی قیادت کرے

ابن حجر کی گذشتہ تعریف کی بنا پر صحابیت کے لئے دو امور کا ہونا ضروری ہے۔

ا۔ رسول اکرمؐ سے ملاقات۔ چاہے وہ مجالست کے ذریعہ ہو یا گفتگو کے ذریعہ یا مشاہدہ کے ذریعہ کہ اگر کسی شخص نے حضور کو دیکھ لیا ہے یا اس کی شیر خواری کے دور میں حضور نے اسے دیکھ لیا ہے تو وہ صحابی ہے اس لئے کہ مشاہدہ کی نسبت حضور کی طرف موجود ہے۔

ب۔ رسول اکرمؐ پر ایمان۔ ابن حجر کی اس رائے کی بنا پر ایمان کی تحقیق ضروری ہے اور یہ امر قلبی ہے جس کا ادراک انسان کے امکان سے باہر ہے لہذا ابن حجر کا فرض تھا کہ اس عمومیت کا اعلان کرے کہ یا واقعی مومن ہو یا کم سے کم ایمان کا اظہار کرے اس لئے کہ عبد اللہ بن ابیٔ رئیس منافقین تھا لیکن اس کے باوجود اس کا شمار اصحاب میں ہے جیسا کہ خود حضور نے فرمایا تھا کہ "جب تک ہمارے سامنے رہے گا ہم ہمنشینی کا بہترین برتاؤ کرتے رہیں گے۔"

(طبقات ۲ / ۵۶)

یہی حال عبد اللہ بن ابی سرح کا ہے جو رسول اکرمؐ کا کاتب تھا پھر اس نے افتراپردازی

شروع کر دی اور حضورؐ نے اس کے خون کو مباح کر دیا چاہے غلاف کعبہ سے کیوں نہ وابستہ ہو لیکن فتح مکہ کے موقع پر عثمان نے اس کی سفارش کی اور وہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ اور اس طرح صحابی بھی ہو گیا چاہے لوگ پسند کریں یا نہ کریں۔ (معارف ابن قتیبہ ص ۱۳۱، ۱۴۱)

یہی حال حکم بن العاص کا ہے کہ اسے رسول اکرم نے مدینہ سے نکال دیا اور اس کے داخلہ کو حرام کر دیا لیکن رسول اکرمؐ کے بعد عثمان نے ابوبکر سے سفارش کی کہ اسے داخلہ دیدیا جائے۔ انھوں نے بھی انکار کر دیا تو دور عمر میں سفارش کی اور انھوں نے بھی انکار کر دیا تو اپنے دور خلافت میں نہایت درجہ اعزاز و احترام کے ساتھ واپس لے آئے اور یہ کہہ کر ایک لاکھ بھی عنایت فرمایا کہ یہ صحابی ہے۔ (معارف ابن قتیبہ ص ۵۷ - ۱۳۱)

مختصر یہ ہے کہ صحابی ہونے کے لئے واقعی ایمان کی شرط نہیں ہے۔ صرف اظہار ایمان کافی ہے اور یہی ضروری ہے کہ وقت آخر تک صاحب ایمان رہے یا کم سے کم ایمان کا اظہار کرتا رہے کہ حقائق کا علم صرف پروردگار کو ہے۔

ان تمام تفصیلات کی بنیاد پر جب ہم حضورؐ کی دعوت اور پھر حضور کی حکومت اور آپ کے غزوات پر نظر ڈالتے ہیں اور لوگوں کی بیعت عام اور پھر حج و عمرہ اور فتح مکہ و حجۃ الوداع کے مناظر دیکھتے ہیں اور یہ اندازہ کرتے ہیں کہ سرکار کی حکومت کا سارے جزیرۃ العرب میں پھیل جانا ہر شخص کے لئے موقع فراہم کر دیتا ہے کہ حضور سے ملاقات کرلے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ سنہ ۱۰ھ تک مکہ اور طائف میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو دائرہ اسلام میں داخل نہ ہو گیا ہو اور حجۃ الوداع میں شریک نہ ہوا ہو بلکہ بعض حضرات نے تو اوس و خزرج کے بارے میں بھی یہی دعویٰ کیا ہے کہ حضورؐ کے آخری دور حیات تک سب مسلمان ہو گئے تھے اور ان میں کوئی بھی کفر کا اظہار نہ کرتا تھا۔ (اصابہ فی تمیز الصحابہ ص ۱۶)

تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ساری قوم یہاں تک کہ بچے بھی صحابہ کرام میں شامل ہو گئے تھے اس لئے کہ ظن غالب یہی ہے کہ سب نے حضور کو دیکھا ہوگا اور لوگ ولادت کے بعد بچّوں کو برکت حاصل کرنے کے لئے حضورؐ کی خدمت میں لائے ہوں گے تاکہ ان کا نام تجویز فرمائیں جیسا کہ روایات میں وارد بھی ہوا ہے کہ لوگ بچّوں کو برکت کی غرض سے

حضورؐ کی خدمت میں لایا کرتے تھے بلکہ بعض مورخین کا بیان ہے کہ جو بچہ بھی پیدا ہوتا تھا اسے حضور کے سامنے ضرور لایا جاتا تھا۔ (اصابہ ص ۷)

پھر جب ہم اس امر کا بھی لحاظ کرتے ہیں کہ حضورؐ کے دور حکومت میں حاکم و محکوم کے مادی امتیازات ختم ہو گئے تھے اور آپ تنہا بازار جایا کرتے تھے اور اپنے امور خود انجام دیا کرتے تھے تو اس کا واضح سا مطلب یہ بھی ہے کہ ہر شخص کے امکان میں تھا کہ حضورؐ کی زیارت کر لے یا آپ سے گفتگو کر لے یا آپ کی بزم میں حاضر ہو جائے جس کے نتیجہ میں ساری قوم صحابہ قرار پا گئی کہ حکومت کے ہر باشندے نے اپنے حاکم سے ملاقات کی ہے یا ان کا مشاہدہ کیا ہے یا ان سے گفتگو کی ہے یا ان کی بزم میں حاضری دی ہے۔

صحابیت کے لغوی اور اصطلاحی معنی پر تمام اسلامی فرقوں کا اتفاق ہے۔ اختلاف صرف عدالت اور عدم عدالت کے بارے میں ہے کہ اہلسنّت تمام صحابہ کو بلا استثنار عادل مانتے ہیں اور دوسرے فرقوں کا خیال یہ ہے کہ عدالت کے لئے دوسرے شرعی لوازم اور صفات بھی ہیں جن کے بغیر انسان عادل نہیں ہو سکتا ہے۔ لہذا اگر صحابی میں یہ کمالات پائے جاتے ہیں تو وہ عادل ہے ورنہ عادل نہیں ہے اور اس سلسلہ میں آیات و روایات اور عقل و منطق کی رو سے مختلف دلائل بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔

نظریۂ عدالت صحابہ اور اہلسنت

اہلسنت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ تمام صحابہ عادل ہیں اور اس مسئلہ میں بقول ابن حجر چند منحرف اور بدعتی افراد کے علاوہ کسی نے اختلاف نہیں کیا ہے۔ صحابہ کی پاکیزگی اور قدسیت کا ایمان ضروری ہے اس لئے کہ ان کے بارے میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ سب اہل جنّت ہیں اور کوئی ایک بھی جہنم میں جانے والا نہیں ہے۔ (اصابہ ص ۹-۱۰)

صحابہ سے مراد بھی وہ تمام افراد ہیں جن کا تذکرہ ابن حجر کی تعریف صحابیت کی تحلیل کے ذیل میں کیا جا چکا ہے۔

خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ صحابہ کرام کی عدالت پروردگار کی طرف سے ان کی طہارت، پسندیدگی اور عدالت کے اعلان سے ثابت ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: "تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے منظر عام پر لایا گیا ہے"۔ "ہم نے تم کو امت وسط قرار دیا ہے"۔ "اللہ صاحبان ایمان سے اس وقت راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے"۔ "سابقین مہاجرین وانصار میں سے اور نیکی میں ان کا اتباع کرنے والے وہ افراد ہیں جن سے خدا راضی ہے اور وہ خدا سے راضی ہیں"۔ "پیغمبرؐ! آپ کے لئے خدا اور آپ کا اتباع کرنے والے مومنین ہی کافی ہیں"۔ "فقراء و مہاجرین کے لئے ہے جنھیں ان کے دیار اور اموال سے نکال باہر کر دیا گیا ہے کہ وہ فضل و رضائے الٰہی کے طلبگار ہیں اور خدا و رسول کی مدد کرتے ہیں اور درحقیقت یہی اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں"۔ اس کے علاوہ متعدد آیات اور کثیر روایات ہیں جن میں صحابہ کے فضائل کا ذکر کیا گیا ہے۔ (اصابہ ص ۹-۱۰)

عدالت صحابہ کا مفہوم اور اہلسنت

اہلسنت کے نزدیک عدالت صحابہ کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے بھی رسول اکرمؐ کا زمانہ درک کر لیا ہے اور ان کے عہد مبارک میں پیدا ہو گیا ہے اس کے لئے کذب وافترا کا امکان نہیں ہے اور نہ اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے چاہے وہ ہزاروں افراد کا قاتل ہو اور بدترین منکرات انجام دے رہا ہو اور اسی بنیاد پر بنی امیہ کا پہلا طبقہ جن میں ابوسفیان اور اس کی اولاد۔ بنی مروان مع حکم بن عاص (راندۂ درگاہ رسالتؐ) مغیرہ بن شعبہ، عبداللہ بن مغیرہ (جو وقت وفات پیغمبر اسلامؐ دس سال کی عمر کا تھا اور اس کی طرف بہت سی روایات منسوب کی گئی ہیں جو اس کی کتاب "الصادقۃ" میں موجود تھیں) سب کے سب عادل ہیں اور ان کی روایات صحیحہ ہیں چاہے ان روایات کا تعلق علیؑ اور اہلبیتؑ کی مذمت ہی سے کیوں نہ ہو اور ان میں ابن ملجم جیسے افراد کی مدح ہی کیوں نہ کی گئی ہو۔ ان روایات کا قبول کرنا ضروری ہے اور ان کا رد کرنا حرام ہے کہ ان کے

راوی عادل ہیں اور عادل غلط بیانی نہیں کر سکتا ہے۔

اس کے بعد تیس سال تک معاویہ کے دور حکومت میں اس کا اتباع کرنے والے اور اس کی ہمنشینی کرنے والے سب حق و ہدایت پر ہیں یہاں تک کہ جن لوگوں نے امام حسنؑ کو زہر دیا اور امام حسینؑ کو قتل کیا اور کوفہ وغیرہ میں بے شمار جرائم انجام دئے وہ سب بھی اہل حق و ہدایت تھے کہ رسول اکرمؐ نے ان کے بارے میں فرمادیا تھا کہ "میرے اصحاب ستاروں جیسے ہیں ان میں سے جس کی اقتدا کرلو گے ہدایت پا جاؤ گے۔"

اگرچہ ائمہ اہل حدیث نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے اور ابن تیمیہ تک نے اسے غلط قرار دیا ہے۔ (کتاب آراء المسلمین فی التقیہ والصحابہ وصیانۃ القرآن الکریم سید مرتضیٰ الرضوی ص ۸۱ - ۸۲ - ۹۱)۔

مخالفین کی سزا

اہلسنت کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص صحابہ کی اس مطلق عدالت کا قائل نہیں ہے اور کسی بھی صحابیٔ رسول کی تنقیص کرتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے۔ صحابہ میں کسی کی بھی توہین کرنے والے افراد کافر ہیں اور ان کی تنقیص زیادہ اہم ہے۔ (اصابہ ص ۱۷ - ۱۸)

"جو صحابہ میں عیب تلاش کرے اور ان کی تنقیص کرے اس کے ساتھ کھانا پینا بند کردو اور اس کے جنازہ پر نماز نہ پڑھو۔" (الکبائر للحافظ الذہبی ص ۲۳۸)۔

اس تشدد کا راز یہ ہے کہ سنت رسولؐ اور قرآن حق ہے اور ہم تک یہ دونوں صحابہ کے ذریعہ پہونچے ہیں لہذا جو لوگ صحابہ کی توہین کرتے ہیں گویا کتاب و سنت کے گواہوں کو باطل کرکے کتاب و سنت کا اعتبار ختم کردینا چاہتے ہیں اور ایسے لوگ زندیق ہیں۔ (اصابہ ۱۷ - ۱۸)

یاد دہانی

صحابہ سے اہلسنت کی مراد وہ تمام افراد ہیں جو ابن حجر کی تعریف میں شامل ہیں جن کا سلسلہ خدیجہ۔ علیؑ۔ زید بن حارثہ۔ ابوبکر سے شروع ہو کر اس آخری بچہ تک پہونچ جاتا ہے جس نے رسول اکرمؐ

کو دیکھا ہے یا رسول اکرمؐ نے اسے دیکھا ہے۔ اس بنا پر ضروری ہے کہ ایک مرتبہ پھر ابن حجر کی تعریف کا تجزیہ ذہن نشین کر لیا جائے۔

غلو میں قدرے تخفیف

شرح البرہان میں مازری کا بیان ہے کہ "ہم جب صحابہ کو عادل قرار دیتے ہیں تو اس سے مراد ہر وہ شخص نہیں ہوتا ہے جس نے کسی ایک دن حضور کو دیکھ لیا ہے یا کبھی بھی زیارت کر لی ہے یا کسی غرض سے حضور کی خدمت میں حاضر ہو گیا تھا اور کام تمام کر کے چلا گیا تھا۔ بلکہ اس سے مراد وہ افراد ہیں جنھوں نے مسلسل ساتھ اختیار کیا ہے۔ حضور کا احترام کیا ہے۔ آپ کی نصرت کی ہے اور اس نور کا اتباع کیا ہے جو حضور کے ساتھ نازل ہوا ہے کہ یہی لوگ کامیاب ہیں۔ (اصابہ ص ۱۹)

تخفیف کی مخالفت

مذکورہ تغییر در حقیقت غالبیت کی بنیاد پر ہے ورنہ صحابہ سے مراد تمام وہ افراد ہیں جنھوں نے بالقوۃ یا بالفعل جہاد اور انفاق کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مازری کے بیان سے کسی نے اتفاق نہیں کیا ہے بلکہ افاضل کی ایک جماعت نے اس کی تردید کی ہے۔ چنانچہ شیخ صلاح العلائی کا بیان ہے کہ یہ ترمیم انتہائی عجیب و غریب ہے جس سے بہت سے مشہور اصحاب صحابیت اور عدالت سے خارج ہو جاتے ہیں جیسے وائل بن حجر۔ مالک بن الحویرث۔ عثمان بن عاص وغیرہ جو حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صرف تھوڑی دیر مقیم رہ کر واپس چلے گئے یا وہ لوگ جن سے صرف ایک حدیث روایت کی گئی ہے اور ان کی مدت اقامت معلوم نہیں ہے۔ بنا بریں قابل اعتبار وہی مسلک جمہور کا ہے جس میں تمام صحابہ کو عادل قرار دیا گیا ہے۔ (اصابہ ص ۱۹)

تعمیم کے اثرات

عدالت کے مسئلہ میں صحابیت کو عام کر دینے کا پہلا اثر اندھی مساوات کی شکل

میں ظاہر ہوا جہاں سارے اصحاب عدالت کے اعتبار سے برابر ہو گئے اور خانہ نشین مجاہد راہ خدا جیسا ہو گیا۔ عالم جاہل جیسا ہو گیا۔ مکمل ادراک کے ساتھ اسلام لانے والا جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھنے والا جیسا ہو گیا۔ سابق لاحق جیسا ہو گیا۔ انفاق کرنے والا بخیل جیسا ہو گیا۔ گنہگار اطاعت گذار جیسا ہو گیا۔ طفل ممیز مرد رشید جیسا ہو گیا۔ ہر معرکہ میں اسلام سے جنگ کرنے والا اسلام کی طرف سے جہاد کرنے والا جیسا ہو گیا۔ یا واضح لفظوں میں ہر معرکہ میں اسلام کی طرف سے جہاد کرنے والے علیؑ اور اسلام کے خلاف ہر جنگ کی قیادت کرنے والے ابو سفیان میں کوئی فرق نہیں رہ گیا اور وہ بالکل معاویہ بن ابی سفیان جیسے ہو گئے بلکہ اسلام کی راہ میں قربان ہو جانے والے سید الشہداء حمزہ اور ان کے قاتل وحشی میں کوئی فرق نہیں رہ گیا اور اسی طرح عثمان بن عفان جن کا شمار "عشرہ مبشرہ" میں کیا جاتا ہے ان کی حیثیت بالکل ان کے چچا حکم بن عاص (راندہ رسولؐ) جیسی ہو گئی اور عبداللہ بن ابی سرح جس کے قتل کا حضورؐ نے بہر حال حکم دیا تھا بالکل ابو بکر جیسا ہو گیا اور رئیس منافقین عبداللہ بن ابی بالکل عمار یاسر جیسا ہو گیا۔ اس لئے کہ سب صحابہ ہیں اور سب صحابہ عادل اور جنتی ہوتے ہیں اور کوئی جہنم میں نہیں جا سکتا ہے۔

(کنز العمال ۱۱/۳۵۸-۳۶۱)

سوال اور استنتاج

کیا واقعاً یہ بات معقول ہے کہ جاہل و عالم۔ قاعد و مجاہد۔ مسلم حقیقی و مستسلم۔ قاتل و مقتول۔ سابق و لاحق۔ منفق و بخیل۔ عاصی و مطیع۔ مخلص و منافق۔ صادق الایمان اور ریاکار سب ایک جیسے ہو جائیں۔؟

کیا واقعاً معاویہ علیؑ جیسا ہو سکتا ہے۔؟

خدا گواہ ہے۔ نہ شریعت اس مساوات کو قبول کرتی ہے اور نہ عقل و منطق۔ یہ وہ صریحی ظلم اور بد ترین خلط ملط ہے جس سے عقل بھی بیزار ہے اور فطرت سلیم بھی اسے برداشت نہیں کر سکتی ہے۔ (ملاحظہ ہو ہماری کتاب "النظام السیاسی فی الاسلام ص ۱۰۶)

رائے اہلسنت کی تنقید

اتفاق واختلاف ۔ صحابہ کے لغوی اور اصطلاحی معانی کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ امت اسلامیہ کے سامنے اس امر کا کوئی بدل نہیں ہے کہ صحابہ کے دائرہ کو اسی قدر وسیع رکھا جائے کہ اس میں واقعی مسلمان اور اظہار اسلام کرنے والے دونوں داخل رہیں اور اس میں کوئی اختلاف بھی نہیں ہے۔

اختلاف صرف مسئلہ عدالت میں ہے کہ اہلسنت اسی وسیع دائرہ کو عدالت میں بھی داخل کر دینا چاہتے ہیں اور دوسرے فرقہ اس عمومیت کو منظور نہیں کرتے ہیں۔

اتحاد کی کوشش

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اہلسنت کے بیان کئے ہوئے معنی کے اعتبار سے حکومت پیغمبرؐ کی تمام رعایا اور سرکار کی اطاعت گذار تمام امت صحابہ میں داخل ہے۔ اور یہی وہ افراد ہیں جو آیات قرآنی میں مخاطب بنائے گئے ہیں۔ انھیں پر احکام الٰہیہ منطبق کئے گئے ہیں۔ ان میں جس نے بھی اسلام کا اعلان کر دیا ہے اور کلمہ پڑھ لیا ہے وہ حضور کی حکومت کا ایک باشندہ ہو گیا ہے اور اس کے بعد اسرار کا جاننے والا پروردگار ہے وہ آنکھوں کے اشارے اور دلوں کے راز کو جانتا ہے اور وہی اس اسلام پر اجر و ثواب دینے والا ہے۔

اسی اعتقاد کی بنیاد پر حضور ظاہر پر اکتفا کر لیا کرتے تھے اور باطن کے معاملہ کو خدا پر چھوڑ دیتے تھے۔ انسان کے سلوک کا فیصلہ مستقبل کے ذریعہ، اسلامی معاشرہ کی تاثیر کے ذریعہ اور اسلامی معرکوں میں اس کی شرکت کے ذریعہ کیا جاتا تھا۔ حضور نے کسی منافق کو منافق نہیں کہا بلکہ ہمیشہ دعا کرتے رہے کہ خدا اس کے باطن کی اصلاح کر دے اور اسے ہدایت دیدے جب کہ قرآن مجید کی آیتیں مسلسل منافقین کی مذمت کر رہی تھیں اور ان کے اسرار کو واضح کر کے واقعیات کا علاج کر رہی تھیں کہ بعض اوقات بعض صحابہ کے شخصی حالات کا انکشاف بھی ہو گیا اور ان پر حد بھی جاری کر دی گئی۔

شریعت اسلامیہ نے بر و تقویٰ کے صفات اور فسق و فجور کے علامات مقرر کر دیے ہیں کہ جس میں جس طرح کے اوصاف پائے جاتے ہوں اسے اسی جماعت سے ملحق کر دیا جائے اور صفات کا اندازہ بھی میدانِ زندگی میں انسان کے سلوک اور برتاؤ سے کیا جائے۔ کفر سے معرکہ آرائی صرف حیاتِ پیغمبرؐ تک محدود نہیں تھی بلکہ انسان ہمیشہ اپنی فطرت کی بنا پر اپنے اعتقاد کی عملی ترجمانی کرتا رہتا تھا چاہے یہ راز جلدی کھل جائے یا دیر میں۔؟

رسول اکرمؐ کے انتقال کے بعد ہر مسلمان اپنی حقیقت سے باخبر تھا کہ اس کی جگہ منزل تقویٰ میں ہے یا خرابہ فسق و فجور میں۔ اور سماج بھی تقریباً ہر شخص کی جگہ سے باخبر تھا۔ حالانکہ سماج بھی مسلمان اور مدینہ کا سماج تھا جس میں ہر شخص لغت اور اصطلاح کے اعتبار سے صحابی تھا لیکن عذاب خدا سے کون بچا سکتا ہے اور انجام بخیر کی معنویت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہ کرام کا معاشرہ خود بخود دو حصوں پر تقسیم ہو گیا:

۱۔ افاضل صحابہ۔ وہ نیک کردار افراد جن کے کاندھوں پر حکومت اسلامی کا بوجھ تھا اور جنھوں نے کفر کی طرف سے ہر استہزاء اور اذیت کو برداشت کیا تھا یہاں تک کہ امر الٰہی ظاہر ہو گیا اور ان لوگوں نے امر خدا سے تمسک اختیار کیا۔ رسول اکرمؐ اور ان کے چاہنے والوں سے محبت کی اور ریسمان ہدایت سے تمسک رکھتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہ افراد یقیناً عادل ہیں اور اس سے کسی اسلامی فرقہ کو انکار نہیں ہے۔

۲۔ بقیہ اصحاب۔ ان کے درجات ہیں جنھیں صرف خدا جانتا ہے۔ ان میں بچے بھی ہیں اور منافقین بھی۔ منافقین وہ اشرار ہیں جنھیں خدا نے جہنم کے آخری طبقہ میں قرار دیا ہے حالانکہ یہ بھی اسلام کا اظہار کرتے تھے اور اس دور کے معیار کی بنا پر صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔

اس تقسیم کا فائدہ

افاضل صحابہ کی معرفت اسلام کا اہم ترین مسئلہ ہے کہ انھیں حضرات نے قائد کی مکمل بیعت کی ہے اور یہی اہل شوریٰ کے ارکان ہیں اور یہی اسلامی اوامر کے نافذ کرنے والے ہیں اور یہی قائد کی واقعی حکومت ہیں اور یہی سماج کو ذکر خدا کی قبولیت اور احکام شریعت کی

تطبیق کے لئے تیار کرنے والے ہیں، انھیں کے ذریعہ بیعت عام کی زمین ہموار ہونے والی ہے کہ ان کی رضا سے عوام الناس کی رضا اور ان کی ناراضگی سے امت کی ناراضگی وابستہ ہے کہ اگر یہ معرفت حاصل ہوگئی تو ان کے لئے بھی نجات ہے اور امت کے واسطے بھی اور اگر یہ معرفت حاصل نہ ہو سکی تو یہ بھی پیچھے رہ جائیں گے اور امت بھی تباہ ہو جائے گی اور مسئلہ غلبہ کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔

فی الحال اس تقسیم کا فائدہ یہ ہے کہ ماضی کا معروضی مطالعہ کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ امت کے اختلاف، ان کے کلمہ کے انتشار، اور ان کی حکومت کے زوال کا سبب کیا ہے تاکہ مستقبل کو روشن بنایا جا سکے اور اقدامات کو منظم کیا جا سکے کہ شرعی مطالبات کی روشنی میں یہی واحد راستہ ہے جس سے امت کو دوبارہ متحد کیا جا سکتا ہے اور ان کی وہ حکومت قائم کی جا سکتی ہے جس کی بنیاد شرعی احکام پر قائم ہو اور جس کے ذریعہ شریعت کے مدعا کو نافذ کیا جا سکے اور دوبارہ زوال کے امکانات نہ ہوں۔

اس کے بعد یہ تفصیل اس لئے بھی ضروری ہے کہ افضل کی معرفت حاصل ہو جائے اور وہ شخص نظر میں آجائے جو عمومی ذمہ داریوں کی ادائیگی کا اہل ہو کہ قرآن مجید نے امانتوں کو ان کے اہل کی طرف واپس کرنے کا حکم دیا ہے اور طبری نے اس کی تفسیر یہی کی ہے کہ اس سے مراد حکومت کو اس کے اہل کے حوالہ کرنا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ کام تفاضل کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے آیت کا حکم صحابۂ کرام نے سُنا ہے اور ان کے علاوہ اس کا مخاطب کون ہو سکتا ہے۔؟

تفاضل سنت الٰہیہ ہے

باہمی افضلیت کا تعین ایک سنت الٰہیہ اور دستور زندگی ہے جس کے ذریعہ انسان اپنی طبیعت کی بنا پر آگے بڑھتا ہے اور اعلیٰ درجات کمال کو حاصل کر لیتا ہے۔

باہمی تفاضل درحقیقت انسان کے فطری طور پر قدرت، قوت اور فہم ادراک میں اختلاف کا نتیجہ ہے اور اسی کے ذریعہ سیاسی اور وظائفی عدالت کا تعین ہوتا ہے کہ کونسا

شخص کس جگہ کے لئے مناسب ہے اور کون کس مقصد کو بہتر طریقہ سے ادا کر سکتا ہے۔

تفاضل درحقیقت ایک شرعی وسیلہ ہے جس کے ذریعہ تفضیل حاصل ہوتی ہے اور تفضیل جزائے عمل ہونے کے علاوہ ایک خدائی محرک بھی ہے جس سے انسان ترقیوں کے راستہ پر گامزن ہوتا ہے۔

تفاضل کی شرعی دلیل

تفاضل درحقیقت ایک ایسا وسیلۂ معرفت ہے جس کی تائید شریعت اسلام نے بھی کی ہے اور روحِ اسلام نے بھی۔ احکام کے اعتبار سے اعلان ہوتا ہے "خدا نے جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو گھر بیٹھنے والوں پر فضیلت دی ہے"۔ "یہ سب رسول ہیں جن میں ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے"۔ "اے بنی اسرائیل! ہم نے تم کو عالمین پر فضیلت دی ہے"۔ "ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی ہے اور داؤد کو زبور عنایت کی ہے"۔ "اسماعیل، الیسع، یونس، لوط"۔ آخرت درجات اور تفضیل کے اعتبار سے بلند ترین مقام ہے"۔ "تم میں فتح سے پہلے جہاد اور انفاق کرنے والا بعد والے جیسا نہیں ہے بلکہ اس کا درجہ بہت عظیم ہے"۔

خود رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ "جس شخص نے کسی قوم پر کسی شخص کو مسلط کر دیا اور اس سے بہتر شخص موجود تھا تو اس نے خدا اور رسولؐ کے ساتھ خیانت کی ہے"۔

طبقات صحابہ

حقیقت امر یہ ہے کہ صحابۂ رسول اکرمؐ عقلی اور شرعی اعتبار سے ایک درجہ کے افراد نہیں تھے۔ انھیں میں صادقین تھے جن کے صدق کے بھی درجات تھے۔ اور انھیں میں اہل طاقت تھے جن کی طاقت کے درجات تھے۔ اور انھیں میں ضعفاء تھے جن کے ضعف کے بھی درجات تھے اور انھیں میں منافقین تھے جن کے نفاق کے درجات تھے جس کا بہترین شاہد خود رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ جب لوگوں نے عبداللہ بن ابی کے قتل کا مشورہ دیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ جب تک ہمارے درمیان ہم حسن صحبت کا مظاہرہ کرتے رہیں گے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسے

بھی صحابیت کا درجہ حاصل تھا حالانکہ وہ رئیس منافقین بھی تھا۔

ہم اگر اہلسنت کے ساتھ حرفی فہم کے قائل ہوجائیں تو حیات انسانی اور فکر بشر دونوں جمود کا شکار ہوجائیں گے اور زندگی سے حرکیت کا خاتمہ ہوجائے گا۔ ان حضرات نے اگرچہ تمام صحابہ کے عادل ہونے کا راستہ اختیار کیا ہے لیکن اس کے بعد بھی ضمناً اس امر کا اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ یہ تعمیم غیر واقعی اور غیر منطقی ہے بلکہ مقاصد شریعت سے متضاد ہے، اور اسی لئے صحابہ کو مختلف طبقات پر تقسیم کیا گیا ہے جس کی بنیاد پر کسی صحابی کا کسی ایک طبقہ میں ہونا خود اس کی حیثیت کو محدود کردے گا اور اسے وہی کام حوالہ کیا جاسکتا ہے جس کا وہ اہل ہو۔ اور یہ مسئلہ بھی صرف اجتہادی نہیں ہے بلکہ ان طبقات کے اشارے قرآن وسنت میں واضح طور پر پائے جاتے ہیں۔

ابن سعد نے طبقات میں صحابہ کے پانچ طبقات قائم کئے ہیں اور حاکم نے مستدرک میں ان طبقوں کو بارہ تک پہونچا دیا ہے۔ (تاریخ الخلفاء ص ۲۲۷)

طبقات صحابہ اور مستدرک حاکم

طبقہ اول۔ وہ صحابہ جو مکہ میں ہجرت سے پہلے اسلام لے آئے تھے جیسے "خلفاء راشدین"۔

طبقہ دوم۔ اصحاب دار الندوہ۔

طبقہ سوم۔ مہاجرین حبشہ۔

طبقہ چہارم۔ اصحاب بیعت عقبہ اولیٰ۔

طبقہ پنجم۔ اصحاب عقبہ ثانیہ۔

طبقہ ششم۔ مہاجرین کا پہلا گروہ جو حضور کی ہجرت کے بعد مدینہ پہونچا۔

طبقہ ہفتم۔ اہل بدر۔

طبقہ ہشتم۔ جن لوگوں نے بدر اور حدیبیہ کے درمیانی وقفہ میں ہجرت کی۔

طبقہ نہم۔ اہل بیعت رضوان۔

طبقہ دہم۔ جنھوں نے حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان ہجرت کی جیسے خالد بن ولید اور عمرو بن عاص۔

طبقہ یازدہم ۔ طلقاء جو فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے جیسے ابوسفیان اور معاویہ وغیرہ۔
طبقہ دوازدہم ۔ وہ اطفال جنہوں نے حضور کو روز فتح مکہ دیکھا ہے۔

اسلام قبول کرنے والوں میں سب سے پہلے خدیجہ ہیں اور اس کے بعد علیؑ جیسا کہ مورخین کا بیان ہے کہ دوشنبہ کے دن حضور نے رسالت کا اعلان کیا اور منگل کے دن پہلے علیؑ نے اسلام کا اعلان کیا اس کے بعد زید بن حارثہ نے اور پھر ابوبکر نے۔ (تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۲۲۷)

صحابہ کی طبقاتی تقسیم درحقیقت باب تفاضل کا آغاز ہے کہ یہ بات انتہائی غیر منطقی ہے کہ پہلے مرحلہ پر اسلام لانے والا انسان اس کے جیسا قرار دے دیا جائے جو طلقاء میں ہو اور روز فتح مکہ اسلام لے آئے۔

خود حضرت "فاروق" نے بھی اس دن اس حقیقت کا احساس کیا تھا جب عطایا کی تقسیم کا قانون مقرر فرما رہے تھے اور یہ طے کیا تھا کہ عطایا کی تقسیم طبقات کے اعتبار سے ہونی چاہیئے اور یہ ناممکن ہے کہ پہلے دن اسلام لانے والے کو آخری دن اسلام لانے والے کے برابر کر دیا جائے یا ہر معرکہ میں اسلام کے خلاف معرکہ آرائی کرنے والے اور گرفتار ہو کر اسلام لانے والے کو اس کے برابر قرار دے دیا جائے جس نے ہر معرکہ میں اسلام کی طرف سے جہاد کیا ہے یہاں تک کہ خدا نے اسلام کو غالب بنا دیا ہے۔

خود سقیفہ بنی ساعدہ میں مہاجرین کی دلیل انصار کے مقابلہ میں یہی تھی کہ مہاجرین روئے زمین پر سب سے پہلے عبادت خدا کرنے والے ہیں یعنی ایمان میں سابق ہیں۔ یہ رسول اکرمؐ کے عشیرہ و قبیلہ والے اور ان کے امور کے زیادہ حقدار ہیں اور ان سے مقابلہ سوائے ظالم کے کوئی نہیں کر سکتا ہے اور عرب اس بات کو برداشت نہ کریں گے کہ نبی کا تعلق مہاجرین سے ہو اور خلیفہ انصار میں سے ہو جائے۔

(طبری ۱۹۸/۷، الامامۃ والسیاسۃ، شرح النہج ۳۲۶/۲)

کیا یہ ساری باتیں نظریہ تفاضل کی عملی تطبیق نہیں ہیں اور کیا ان سے تمام صحابہ کے علی الاطلاق عادل اور ہم رتبہ ہونے کا تصور فنا نہیں ہو جاتا ہے۔ اسی لئے انصار نے مہاجرین کی دلیل قربت و قرابت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ کہہ دیا تھا کہ ہم علیؑ کے علاوہ کسی کی

بیعت نہ کریں گے۔ (طبری ۷/ ۱۹۸، الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ، شرح نہج البلاغہ ۲/ ۳۲۶)

اور جب امام علیؑ نے اپنی دلیل کو قوم کے سامنے پیش کیا تو بشیر بن سعد جس نے انصار کے اجماع کو توڑ کر ابو بکر کی بیعت کر لی تھی۔ اس نے بھی واضح لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اگر انصار نے یہ بات ابو بکر کی بیعت سے پہلے سُن لی ہوتی تو دو آدمی بھی آپ کے بارے میں اختلاف نہ کرتے۔

ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں اس وقت تک ممکن نہیں ہیں جب تک نظریہ تفاضل کی اصالت کو تسلیم نہ کر لیا جائے اور اعلم، افضل، انسب کی تقدیم کے اصول کو ضروری نہ قرار دے دیا جائے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ نظام تفاضل نظریہ عدالت صحابہ سے سو فیصدی متصادم ہے اور عدالت صحابہ کے بعد اس نظام کی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے کہ تمام صحابہ عدالت کے اعتبار سے مساوی ہیں تو تفریق اور تفضیل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اسلام کا نظامِ تفاضل

اسلام نے اختلاف سے بچنے، ہوا و ہوس کے دور رکھنے اور جبر و قہر سے امت کے سر پر مسلّط ہو جانے کے خطرات سے تحفظ کے لئے ناقابلِ انکار و تاویل نصوص کے ذریعہ تفاضل کا نظام معین کر دیا تھا اور اس کے پانچ ارکان قرار دیدئے تھے تاکہ فضیلت و عدالت کے امتیازات قائم ہو جائیں اور منازل خیر کی طرف آگے بڑھنے کے راستے مکمل ہو جائیں۔

یہی ارکان خمسہ در حقیقت مرد مسلمان کے درجہ کا تعین کرتے ہیں اور انھیں سے اس کے اعتبار کی حیثیت کا تقرّر کیا جاتا ہے کہ منازل و درجات کے بارے میں ہر سوال کا جواب انھیں ارکان خمسہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور اعلم و افضل و انسب کے دریافت کرنے کا یہی واحد علمی اور منطقی راستہ ہیں۔

اگر صحابہ سب برابر سے عادل تسلیم کر لئے جائیں اور ان میں آپس میں کوئی فرق نہ رہ جائے تو نظام تفاضل کی ضرورت ہی کیا ہے اور اس کے حدود کے معین کرنے اور

احکام وضع کرنے کا واقعی داعی اور محرک کیا ہے۔؟

تفاضل کے ارکان یا عدالت کے راستے

الٰہی نظام زندگی کے احکام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں تفاضل کے پانچ ارکان ہیں اور انھیں موازین کے ذریعہ مرد مسلم کے اعتبار کا حجم طے کیا جاسکتا ہے اور اس کی منزلت کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

رکن اوّل ۔ پاکیزہ قرابت دار ۔ یہی حضرات ہیں جو امت کی روحانی اور سیاسی قیادت کرنے والے ہیں اور انھیں کو رسول اکرمؐ کے بعد امت اسلامیہ کا رہنما قرار دیا گیا ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہی حضرات کیوں ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک فضل الٰہی ہے وہ جسے چاہتا ہے عنایت کر دیتا ہے۔ ورنہ یہ سوال بھی ہوگا کہ نزولِ وحی حضرت محمد مصطفیؐ ہی پر کیوں ؟ رسالت کے لئے انھیں کا انتخاب کیوں ؟ اس سے پہلے حضرت موسیٰ و عیسیٰ کا انتخاب کیوں ؟ یہ امور در حقیقت خدا کے ہاتھ میں ہیں اور کسی بندہ کو اس مقام پر زبان کھولنے کا حق نہیں ہے۔

پیغمبر اکرمؐ کے یہ قرابت دار نصوص صریحہ کی بنا پر مرکز دائرۂ اسلام، سفینۂ نجات، باب حطہ، نجوم ہدایت، سابق الایمان، اتقیٰ واعلم، سب سے پہلے مصائب برداشت کرنے والے اور امت کے لئے واجب الطاعۃ والمحبۃ ہیں۔

ان کا سربراہ ہر دور میں امت کا امام، قائد اور مرجع ہوتا ہے یعنی پہلے نبی اس کے بعد کتاب، پہلے ہادی اس کے بعد ہدایت! بھلا خدا نے کب کسی رسالت کو بغیر رسول کے بھیجا ہے اور کب کسی کتاب کو بغیر کسی انسان کے نازل کیا ہے۔ قرابتداران پیغمبر اسلامؐ ہی در حقیقت ولایت کا مرکز و محور ہیں اور انھیں کے گرد قیادت و مرجعیت گردش کر رہی ہے۔

رکن دوم ۔ سبقت فی الایمان۔

رکن سوم ۔ تقویٰ

رکن چہارم ۔ علم

رکن پنجم۔ رسول اکرمؐ کی طرف سے تعیین اور امت کی طرف سے کھلے دل سے بغیر کسی جبر و اکراہ اور ترغیب و ترہیب کے بیعت۔

موازین مذکورہ کے بارے میں فیصلہ

یہ موازین درحقیقت موضوعی موازین ہیں جن کا سرچشمہ شریعت اور صرف شریعت ہے۔ انھیں موازین سے انسانی عدالت کے خطوط واضح ہوتے ہیں اور ان کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ صورت حال اور نظام الٰہی کے درمیان سازش کی ایک کوشش ہے اور کچھ نہیں ہے۔

مذکورہ بالا قوانین و موازین ہر دور میں قابل اعتراف رہے ہیں یہانتک کہ نظام خلافت میں بھی انھیں کو حجت قرار دیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر ابوبکر کی دلیل سقیفہ میں انصار کے مقابلہ میں یا عمر کا احتجاج انصار کے مقابلہ میں یا ابوعبیدہ کا استدلال انصار کے مقابلہ میں۔ سب کی بنیاد یہی ایک شے تھی یعنی قرابت پیغمبر اور بس۔ (الامامۃ والسیاسۃ ۵۔۷۔۸)

۱۔ "عرب انھیں کو خلیفہ بنائیں گے جو پیغمبرؐ کے قرابت دار ہوں گے"۔ یا "پیغمبرؐ کے قبیلہ والے میراث و سلطنت کے زیادہ حقدار ہیں"۔ (یہ قرابت کا معیار ہے)

۲۔ "مہاجرین سب سے پہلے عبادت خدا کرنے والے ہیں"۔ (یہ ایمان و تقویٰ کا معیار ہے)

۳۔ حضرت عمر کا عطایا کی تقسیم میں امتیاز۔ (یہ تمام موازین کا عملی اعتراف ہے) —— فتوح البلدان بلاذری۔

سوالات

اگر صحابہ سب عادل اور سب جنتی ہیں اور کسی کا داخلہ جہنم میں ممکن نہیں اور خدا نے سب کو مساوی قرار دیا ہے۔ تو کیا سبب تھا کہ انصار کو خلافت نہ مل سکی ؟ اور امت کی اکثریت نین مہاجرین کے بیانات سے مطمئن ہوگئی اور خلافت مہاجرین میں آگئی۔ ؟

"مشہور خلیفۂ عادل" حضرت عمر نے عطایا کی تقسیم میں امتیازات کیوں قائم کیے، بعض صحابہ پر حد کیوں جاری کی گئی۔؟

کیا عدالت شعار انسان جسے جنت کی ضمانت حاصل ہو وہ بھی چوری کر سکتا ہے۔؟

مسلمانو! تم حضرات شیخین سے زیادہ دین سے باخبر نہیں ہو۔ ان کی فقہ تمہارے واسطے حجت ہے۔ تم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ ان سوالات کے جوابات فراہم کرے؟

اندھی تقلید ہدایت کا راستہ نہیں بن سکتی ہے۔؟

پروردگار کا ارشاد ہے کہ اندھی تقلید جہنم کا راستہ ہے۔ اللہ نے ہر انسان کو عقل دی ہے تاکہ اسے اطاعت کی راہ میں استعمال کرے اور مقاصد شریعت کی معرفت حاصل کرے۔ (النظام السیاسی فی الاسلام ص ۱۰۱)

فصل سوم

نظریۂ عدالت صحابہ کی ابتدائی تردید

اہلِ سنت کے دلائل کی دو تردیدیں:

ا۔ شہادت وشہود سے متعلق

"کہا جاتا ہے کہ قرآن وسنت کی بقا صحابہ کرام کے ذریعہ ہے لہذا ان کا غیر عا[illegible] مان لینا کتاب وسنت کو بے اعتبار بنا دینا ہے اور یہ کفر ہے۔"

گذارش یہ ہے کہ قرآن کریم ذکر حکیم ہے اور ارشاد پیغمبرؐ اسی کا بیان اور اس کی تفسیر وتشریح ہے جو اسی کے لوازم میں شامل ہے۔ قرآن حکیم کی بقا کی ضمانت مالک کائنات نے لی ہے۔ "ہم نے ذکر کو نازل کیا ہے اور ہمیں اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"۔ لہٰذا قرآن کریم خدائی ضمانت میں ہے اس کی بقا یا حفاظت میں صحابہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ دین الٰہی ضمانت الٰہی سے محفوظ ہے اس کے لئے نہ شہود درکار ہیں اور نہ صحابہ۔ اللہ خود شاہد ہے اور وہی اس کے اثبات کا ذمہ دار ہے۔ رسول اکرمؐ نے بھی اس وقت تک دنیا سے سفر نہیں کیا ہے جب تک کہ دین کا اکمال اور نعمت کا اتمام نہیں ہوگیا ہے لہذا مسلمین کے لئے شاہد رسول اکرمؐ ہیں اور عام انسانوں کے لئے شاہد تمام مسلمان ہیں۔

کتاب الٰہی پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ کسی انسان کی مجال نہیں ہے کہ اس میں ایک حرف کی کمی یا زیادتی کر سکے یا کسی طرح کی تبدیلی پیدا کر سکے۔ آیات کے مجموعہ اس اہتمام کے ساتھ نازل ہوتے تھے کہ کس مجموعہ کو کس سورہ میں رکھنا ہے اور سرکار دو عالمؐ اسی کے مطابق ہدایت فرمایا کرتے تھے اور مسلمان اسی مقام پر محفوظ کر لیا کرتے تھے۔ حضور قرآن مجید کو مکمل طور سے مرتب کرا کے دنیا سے تشریف لے گئے ہیں۔ بعض مسلمانوں کے خیال

کے برخلاف قرآن ہرگز لوگوں کے سینوں میں محفوظ نہیں تھا بلکہ ایک مکمل کتاب کی شکل میں موجود تھا جس کے بعد سارے صحابہ کو عادل مان لینا اس کی حفاظت وضمانت میں کوئی اضافہ نہیں کرسکتا ہے اور فقط مخلصین کو عادل کہہ دینا اس کی ضمانت میں کوئی کمی نہیں کرسکتا ہے کہ حفاظت قرآن کے نام پر صحابہ کی عدالت کا نظریہ قائم کرلیا جائے۔ حفاظت قرآن مالک کائنات کا کرم ہے اور اس پر شکریہ کا حقدار وہی رب العالمین ہے۔ فخر محمدؐ وآل محمدؑ اور ان صحابہ مخلصین کا ہے کہ جو آل محمدؐ کے گرد جمے رہے کہ اگر آل محمدؐ نے حضور کو کفار کے حوالے کردیا ہوتا یا اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہوتا تو کفار قریش نے اسی طرح حضورؐ کی زندگی کا خاتمہ کردیا ہوتا جس طرح دوسری امتوں نے اپنے انبیاء کے ساتھ برتاؤ کیا تھا۔ ہمیں یہ سوال کرنے کا حق ہے کہ جب بنی ہاشم شعب ابوطالب کی زندگی گذار رہے تھے اور بے پناہ مصائب ومظالم کا سامنا کررہے تھے۔ بھوک کی شدت سے درخت کے پتے چبا رہے تھے اور بچے پیاس کی شدت سے ریت چوس رہے تھے اس وقت یہ صحابہ کرام کہاں تھے اور ان کے خدمات کہاں تھے؟ کیا اس صورت حال کے باوجود یہ ممکن ہے کہ محاصرہ کرنے والوں کو ان کے برابر کردیا جائے جو محاصرہ میں زندگی گذار رہے تھے (آخر تمھیں کیا ہوگیا ہے تم کیسے فیصلے کررہے ہو؟)۔

دوسری تردید

یہ کہنا کہ "صحابہ میں سے کسی ایک کی تنقید کرنے والا بھی زندیق اور کافر ہے"۔ کسی بنیاد پر قبول کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس لئے کہ اسلام آسمانی ادیان میں آخری دین ہے اور یہ دین الٰہی کی آخری شکل ہونے کے اعتبار سے اس انداز سے پیش کیا گیا تھا کہ ہر شخص اپنے فہم کے مطابق اس سے استفادہ کرسکے۔

صحیح ترین مفہوم وہ ہے جو مقصود الٰہی کے مطابق ہو اور جس سے ارادہ الٰہی کا مکمل اندازہ ہوتا ہو جس کا ادراک کرنا ایک فنی کام ہے جو ہر شخص کے بس کا نہیں ہے ورنہ کتابوں کے ساتھ مرسلین اور ہدایت کے ساتھ ہادیوں کی کوئی ضرورت نہ ہوتی اور ایمانی حکومتوں کے لئے انبیاء کرام جیسے قائدوں کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ اسلام

ایک الگ شے ہے اور ہماری سمجھ ایک الگ شے ہے جو ہماری ثقافتوں اور صلاحیتوں کے اعتبار سے مختلف ہے۔ اس اختلاف فکر و فہم کو نہ زندقہ کہا جا سکتا ہے اور نہ کفر۔ ورنہ خود صحابہ میں بھی ایسے افراد موجود ہیں جنھوں نے خود رسول اکرمؐ کی عدالت پر اعتراض کیا ہے۔ کیا ابن الخویصرہ کا یہ قول یاد نہیں ہے کہ "محمد انصاف کرو۔ خدا کی قسم تم نے یہ تقسیم رضائے خدا کے مطابق نہیں کی ہے"۔ لیکن اس کے باوجود حضورؐ نے اسے زندیق اور کافر نہیں فرمایا ہے بلکہ صرف یہ فرمایا ہے کہ "اگر میں انصاف نہیں کروں گا تو کون کرے گا۔

کیا صحابی کا درجہ سرکار دو عالمؐ سے بھی بلند تر ہے اور جب سید البشرؐ آپ کے عقیدہ کے مطابق یہ فرما سکتے ہیں کہ "میں ایک بشر ہوں جس سے صحیح، غلط دونوں کام ہو سکتے ہیں" تو صحابہ سب کے سب کیسے عادل ہو جائیں گے اور ان پر اعتراض یا تنقید کرنے والا کس طرح کافر ہو جائے گا۔

دلائل اہلسنت کی واقعی تردید

اہلسنت اس امر پر اتفاق کئے ہوئے ہیں یا اتفاق کا اظہار کرتے ہیں کہ "رسول حق ہے۔ قرآن حق ہے۔ رسولِ اکرمؐ کا پیغام حق ہے اور صحابہ کرام اس کے پہونچانے والے اور شاہد ہیں لہٰذا جو لوگ ان پر تنقید کرتے ہیں وہ ہمارے گواہوں کو منزل شہادت سے ساقط کرنا چاہتے ہیں اور کتاب و سنت کو معطل کر دینا چاہتے ہیں لہٰذا یہ لوگ زندیق اور کافر ہیں۔"

(اصابہ ابن حجر عسقلانی ص ۱۷-۱۹)

"جو ان میں عیب تلاش کرے یا ان کی تنقیص کرے اس کے ساتھ کھانا پینا بند اور اس کی نماز جنازہ حرام"۔ (کتاب الکبائر للحافظ الذہبی ص ۲۳۸)

دلیل کا سرسری مُطالعہ

۱۔ خلط مبحث

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نبی برحق ہے۔ قرآن برحق ہے اور پیغامِ رسالت

بالکل صحیح ہے اور اس مسئلہ میں کوئی اختلاف بھی نہیں ہے بلکہ یہ سارے عالم اسلام کا مشترک عقیدہ ہے کہ اہلسنت بھی اسی کے قائل ہیں اور اہل تشیع بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں اور سب دین الٰہی سے برابر کی نسبت رکھتے ہیں اور دین الٰہی کو دو عناصر سے مرکب تسلیم کرتے ہیں :

۱۔ ذات پیغمبر اسلامؐ، اقوال واعمال و تقریر پیغمبر اسلامؐ۔

۲۔ کتاب خدا۔

اختلاف ان دونوں کے سمجھنے میں ہے۔ اختلاف ان کے ماننے میں نہیں ہے لہٰذا ایمان کو فہم وادراک سے مخلوط کر دینا ایک غیر منطقی عمل ہے۔ دین ایک ثابت مرکز ہے اور ہمارا ادراک ایک متحرک و متغیر عمل ہے جو افراد اور حالات سے بدلتا رہتا ہے۔ فرد کا فرد سے اختلاف اور جماعت کا جماعت سے اختلاف۔ جس کا جس قدر علم، فہم اور تقویٰ ہوگا اس کا ادراک اسی اعتبار سے قابلِ اعتماد ہوگا۔ اگر کسی بھی نص کا ایک مفہوم لازم ہوتا تو مالک نے اسی کو فرض کر دیا ہوتا اور پھر اجماع کی بھی ضرورت نہ ہوتی بلکہ فہم کی بھی ضرورت نہ ہوتی۔ خدا نے آیات نازل کی ہوتیں اور اسی نے ہر ایک کے دماغ میں ایک ہی مفہوم ڈال دیا ہوتا جو بہر حال نہیں ہوا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم ایک نص سے ایک مفہوم اخذ کرتے ہیں اور دوسرا شخص دوسرا مفہوم اخذ کرتا ہے اور دونوں اپنے مفہوم کو مقصود الٰہی قرار دیتے ہیں تو یہ گویا ایک اعتبار سے تجدید نظر کی دعوت ہوتی ہے کہ انسان اپنے مفہوم کے بارے میں دوبارہ غور کرے کہ کہیں یہی مفہوم تو غلط نہیں ہے۔ نہ یہ کہ ہر شخص اپنے مفہوم کو مفہوم الٰہی قرار دیدے اور ایک ایک نص کے متعدد واقعی مفاہیم ہو جائیں اور اس طرح اسلام کی اساس اختلاف وافتراق قرار پا جائے اور ہر قوم اپنا مفہوم لے کر الگ ہو جائے۔

امت کی مصلحت، وحدتِ کلمہ اور وحدت مفہوم میں ہے اور ہم آپ میں اگر اخلاص عمل پایا جاتا ہے تو ہماری آپ کی کوئی مصلحت نہیں ہے۔ اصل مصلحت اسلام کی ہے اور اس کا دار و مدار احکام الٰہیہ کے واقعی مفہوم کے ادراک اور اس پر عملدرآمد

پر ہے۔

یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ ہم مختلف اچھے بُرے مقاصد سے حاصل ہونے والے مفاہیم کو دین سے مخلوط کر دیں اور پھر یہ دعویٰ کریں کہ یہی مفاہیم اصل دین ہیں اور جو ہمارے فہم سے اختلاف کرے گا اسے سزا دی جائے گی اور اس طرح ہم اتباع کے دائرہ سے نکل کر تشریع کی منزل میں داخل ہو جائیں۔

اپنے فہم وادراک سے اختلاف کرنے والے کو کافر بنا دینا یا اس کے ساتھ کھانا پینا بند کر دینا اور اس کی نماز جنازہ کو حرام قرار دے دینا ایک ایسا فیصلہ ہے جو دینِ خدا کو پسند نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی سند ہے۔ یہ درحقیقت ملکِ غیر میں تصرف اور دینِ خدا میں دخل اندازی ہے جو دنیاوی طور پر ایک باطل اور مہمل تصور ہے جس کی اسلام میں ذرّہ برابر کوئی قیمت اور اہمیت نہیں ہے۔

۲۔ کلمات برائے تلقین

ا ـ اسلام ایک مخصوص لفظ ہے جس کے ایک محدود معنی ہیں یعنی ذاتِ رسولِ اکرمؐ (اقوال، افعال۔ تقریر) اور قرآن کریم۔

اسلام رسول اکرمؐ کا دیا ہوا وہ حقوقی مکمل نظام ہے جسے مالک نے بذریعہ وحی انھیں عنایت فرمایا اور انھوں نے بذریعہ تعلیم امت کے حوالے کر دیا یہ وہ عقیدۂ الٰہیہ ہے جسے مالک نے اپنا اور اپنے اطاعت گذار بندوں کا دین قرار دیا ہے اور یہ ایک مستقل شے ہے جس کا کسی فرد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ب۔ صحابہ کرام جنھوں نے اس دین کا اتباع کیا ہے اور رسول اکرمؐ کے ساتھ دعوت سے دولت تک کے ہر مرحلہ پر رہے ہیں اس دین کے پیرو شمار ہوتے ہیں۔ ان کا اصل دین یا اس کے اجزاء سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ج ـ مسلمان وہ ہیں جنھوں نے اسلام کا اتباع کیا ہے اور اس پر ایمان رکھتے ہیں لیکن وہ بھی اسلام نہیں ہیں۔ صرف اسلام کے پیرو ہیں اور عقیدہ ومعتقد یا قانون وقوم

اور قاضی و متقاضی میں بے پناہ فرق پایا جاتا ہے۔

۳- پس پردہ؟

اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت اسی میں ہے کہ مسلمان اس کے واقعی مفہوم کو سمجھیں جو ارادۂ الٰہی سے وابستہ ہے اور اس کے لئے مخصوص صلاحیت اور ملکہ کی ضرورت ہے جس کی اہمیت کا احساس ہر مسلمان کو ہے اور سب کا مدعا بھی وہی واقعی مفہوم ہے لیکن افسوس کہ بعض مسلمانوں نے اپنی ذات کو اسلام بنا دیا اور حد سے آگے بڑھ کر اپنے اجتہاد کو اسلام قرار دے کر ترغیب یا ترہیب کے ذریعہ دوسروں پر بھی مسلط کرنا شروع کر دیا اور اس طرح حقیقتِ شریعت کے ادراک کے راستے بند کر دئے اور یہ اعلان کر دیا کہ ہماری رائے ہی اصل دین ہے اور اس کا مخالف زندیق ہے۔ اس کا بائیکاٹ کرنا ضروری ہے۔

یہ بات ان کے حقوق میں ہرگز شامل نہیں تھی اور نہ ان کی رائے اور ان کے اجتہاد کی مخالفت کا نام دین سے اختلاف تھا لیکن اس کے باوجود ایسا ہوا۔ گویا کہ ان حضرات نے دین کی آڑ لے کر اپنی رائے کو مقدم کرنا چاہا اور اس طرح پس پردہ کام شروع ہو گیا۔ ورنہ کھلی ہوئی بات ہے کہ میری رائے سے آپ کا اختلاف نہ آپ کو کافر بنا سکتا ہے اور نہ میری رائے کو مرجع مسلمین قرار دے سکتا ہے۔ یہ تو ایک ترجیح بلا مرجح اور تقنیع بلا سند کا عمل ہے جس کے ذریعہ ان افراد کی خدمت کی گئی ہے جنھوں نے امت پر غلبہ حاصل کر کے اسے احزاب اور گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا اور اپنے ساتھ ان علماء سوء کو بھی لے لیا تھا جو ہر دور میں امت کے باہمی افہام و تفہیم اور وحدت کلمہ کے مخالف رہے ہیں اور ان کا کاروبار صرف یہ رہا ہے کہ "یہ رافضی ہے"۔ "یہ شیعہ ہے"۔ "یہ سنی ہے"۔ "یہ جعفری ہے"۔ "یہ مالکی ہے"۔ اور یہ سب کافر اور زندیق ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسے مہمل الفاظ کو نہ ذوق سلیم قبول کرتا ہے اور نہ فطرت سلیمہ۔ ان باتوں کو تو اہل کتاب کے کفار بھی تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ یہ مہملات دراصل تنگ نظری کی مختلف تعبیریں ہیں جو اخوت اسلامی کے بھی خلاف ہیں اور روح اسلام کے بھی۔ خدا بہتر جانتا ہے

کہ اس انداز فکر نے کس قدر اذیت ناک تعصب پیدا کیا ہے اور کس قدر انتشار کو ہوا دی ہے۔
ذہبی نے ثقہ راویوں کے حالات میں جو رسالہ تصنیف کیا ہے اس میں ابو عمر بن عبدالبر کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ محمد بن وضاح کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے کہ میں نے یحییٰ بن معین سے امام شافعی کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ ثقہ نہیں ہیں جب کہ یحییٰ بن معین کا شمار جرح و تعدیل کے ائمہ میں ہوتا ہے اور وہ اس فن میں سند تسلیم کئے جاتے ہیں۔ یہی حال امام بخاری کا ہے کہ انھوں نے امام جعفر صادقؑ کی روایات کو نقل نہیں کیا ہے اور ان سے کمتر افراد کے روایات کو نقل کیا ہے جب کہ امام جعفر صادقؑ مذہب اہلبیتؑ کے موسس۔ ائمہ اربعہ کے استاد، بے نظیر عالم، چار ہزار فقیہ اور محدث افراد کے معلم اور ان سب سے بالاتر ائمہ اہلبیتؑ میں چھٹے امام تھے اور ان کا سلسلہ حضرت علی بن ابیطالبؑ تک پہونچتا ہے (جعفر بن محمد بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالبؑ)۔ اس کے باوجود بخاری نے ان کی توثیق نہیں کی ہے اور تمام اہلبیتؑ کی روایات سے گریز کیا ہے جب کہ اہلبیت علیہم السلام کا شمار اصحاب میں بھی ہوتا ہے اور اصحاب سب کے سب عادل ہیں۔

نظریۂ عدالت صحابہ کی موضوعی تردید

اہلسنت کا عمومی ایمان اسی نظریہ پر ہے کہ تمام صحابہ بلا استثناء عادل ہیں جب کہ یہ نظریہ دراصل اربابِ سیاست و تغلب کی ایجاد ہے اور اس کا بھی ایک مخصوص مقصد اور ہدف ہے۔ ارباب سیاست نے اس نظریہ کو غافل مسلمانوں کے دماغوں میں اُتار دیا اور اسے اسلام کا جزو لاینفک بنا دیا کہ گویا یہ اسلام کی ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے جس سے انحراف یا اس میں شک و شبہ انسان کو زندیق و کافر اور قابل مقاطعہ بنا سکتا ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ صحبتِ پیغمبرؐ ایک شرف عظیم اور منزلت جلیلہ ہے لیکن لغوی اور اصطلاحی اعتبار سے اس کا دائرہ ان تمام مسلمانوں کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے جنھوں نے رسول اکرمؐ کے دور میں زندگی گذاری ہے اور گویا کہ حضورؐ کی حکومت کا ہر باشندہ صحابی ہے۔ اس لئے کہ صحابیت کا دارومدار تین ۳ باتوں پر ہے:

۱۔ حضور اکرمؐ کی زیارت۔

۲۔ ایمان صادق یا اظہار ایمان۔ جو مومنین مخلصین کو بھی شامل ہے اور ان منافقین کو بھی شامل ہے جنھوں نے جملہ وسائل سے اسلام سے جنگ کی ہے اور جب ہر طرف سے مجبور و محصور ہو گئے تو اسلام قبول کر لیا اس لئے کہ اسلام کے علاوہ تمام دروازے بند ہو چکے تھے تو فوراً اسی دروازہ سے داخل ہو گئے۔ اس کے بعد اللہ ان کی نیتوں کو بہتر جانتا ہے۔

۳۔ حالت اسلام میں موت۔

ظاہر ہے کہ مومنین مخلصین اور منافقین ریاکار جن کے دلوں تک ایمان کی رسائی نہیں ہوئی ہے سب ایک درجہ کے افراد نہیں تھے کہ سب کو برابر کا عادل قرار دے دیا جائے بلکہ بعض ایسے افراد تھے جو اپنے کفر کو چھپائے ہوئے تھے اور ایمان کا اظہار کر رہے تھے اور یہی وہ منافقین تھے جنھوں نے حضورؐ کے دور میں زندگی گذاری ہے اور حضور کا انتقال ان کے دور صحابیت میں ہوا ہے۔

قرآن مجید نے ان افراد کے نفاق اور تمرد کا انکشاف کیا ہے اور ان کی غداری کا واضح تذکرہ کیا ہے کہ یہ وعدہ کر کے مخالفت کرنے والے۔ بات کر کے جھوٹ بولنے والے۔ فتنوں کے متلاشی۔ حضور کے حق میں موذی اور امور دین و دنیا کو منقلب کر دینے والے ہیں۔

اسلام کا پرچم روز بروز بلندی پر لہراتا جا رہا تھا اور اس کی حکومت میں وسعت پیدا ہوتی جا رہی تھی یہاں تک کہ جب اسلام کی ہیبت سارے جزیرۃ العرب پر چھا گئی اور اللہ نے دین کو کامل بنا دیا اور حضور اکرمؐ جوارِ رحمتِ الٰہی میں پہونچ گئے تو بھی یہ منافقین اپنے نفاق پر قائم رہے اور مسلمانوں میں ایمان اور فداکاری کے درجات و منازل باقی رہ گئے۔

عجب عجیب

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بغیر کسی مقدمہ کے یا سیاسی مقدمات کی بنا پر حکومت پیغمبرؐ کے

تمام باشندے عادل ہو گئے۔ اس لئے کہ سب صحابہ تھے۔ سب نے حضور کو دیکھا تھا یا حضور نے انھیں دیکھا تھا اور سب نے اسلام و ایمان کا اظہار کیا تھا اور سب اسی ایمان پر دنیا سے چلے گئے حالانکہ عدالت صحابہ کا نظریہ اموی دور حکومت میں ایجاد ہوا ہے جب تک صحابہ کی ساری نسل کا خاتمہ نہیں ہوا تھا اور گویا کہ خاتمہ بالخیر کا جائزہ لینے سے پہلے ہی سب کو عادل قرار دے دیا گیا اور اس طرح یہ نظریہ مختلف بنیادوں پر ناقابل قبول قرار پا گیا۔

اسباب تردید

۱۔ یہ نظریہ نصوص قرآنی کے خلاف ہے۔
۲۔ یہ نظریہ سنت رسولؐ میں قول، فعل اور تقریر پیغمبرؐ سب کے خلاف ہے۔
۳۔ یہ نظریہ حقائق تاریخ کے خلاف ہے۔
۴۔ یہ نظریہ روح اسلام۔ حسن خاتمہ اور ہدف زندگی کے خلاف ہے۔

تفصیلاتِ اسباب تردید

۱۔ مخالفت نصوص قرآنیہ

•۔ منظرِ نفاق

پیغمبر اسلامؐ کے دور حیات میں نفاق ایک نمایاں عنصر تھا اور منافقین ایک اچھی خاصی طاقت شمار کئے جاتے تھے۔ یہ لوگ بظاہر صاحبانِ ایمان تھے۔ زبان سے توحید اور رسالت کی گواہی دیا کرتے تھے اور مسلمانوں جیسے تمام کلمات کو اپنی زبان سے دُہرایا کرتے تھے۔ قرآن مجید کا بیان ہے کہ :

"کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا اور رسول پر ایمان لائے ہیں۔ حالانکہ یہ خدا اور صاحبانِ ایمان کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کی تمامتر خواہش یہ ہے کہ ان کی بات تسلیم کر لی جائے۔ اسی لئے صاحبانِ ایمان سے ملاقات کے وقت برابر یہ کہا کرتے تھے کہ ہم بھی صاحب ایمان ہیں۔"

نفاق کا یہ کاروبار صرف زبان کی حد تک محدود نہیں تھا بلکہ عملی طور پر بھی یہ لوگ نماز، روزہ اور انفاق کا عمل انجام دیا کرتے تھے اور اگر کبھی جہاد میں نہ جا سکے تو معذرت کیا کرتے تھے اور اپنے مزعومہ عقیدہ کی تکرار کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ انسان کا سلوک جلد یا بہ دیر اس کے عقیدہ کی علامت بن جاتا ہے۔ حقائق کا علم پروردگار کو ہے اور رسول اکرمؐ کا بھی یہ طریقہ کار تھا کہ ظاہر کی بنا پر برتاؤ کیا کرتے تھے اور باطن کے معاملات کو پروردگار کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ ذاتی طور پر بھی آپ بیحد رؤف اور مہربان تھے اور حسن اخلاق کی بنا پر انسانیت کا نمونۂ کامل تھے۔ لیکن جب منافقین کا طرز عمل حد سے آگے بڑھ گیا تو آیات نے نازل ہو کر ان کی حقیقت کو بے نقاب کر دینا ضروری قرار دے دیا:

"یہ لوگ صاحب ایمان نہیں ہیں۔ صرف خدا اور اہل ایمان کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں"۔

"جب یہ اپنے شیاطین کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمھارے ہی ساتھ ہیں۔ ہم تو خالی مذاق اڑاتے ہیں"۔

"یہ نماز بھی کسلمندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور انفاق بھی ناگواری کے ساتھ انجام دیتے ہیں"۔

"یہ نکلنا چاہتے تو اس کا انتظام کرتے لیکن خدا کو بھی ان کا قیام پسند نہیں تھا لہٰذا اس نے بھی انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا"۔

"مسلمانو! یہ اگر تمھارے ساتھ نکلتے بھی تو تمھیں اور وحشت زدہ کر دیتے اور تمھارے درمیان فتنوں کی دوڑ دھوپ شروع کر دیتے اور بعض لوگ قبول بھی کر لیتے"۔

"یہ لوگ قسم کھاتے ہیں کہ تمھیں میں سے ہیں حالانکہ ہرگز تم میں سے نہیں ہیں۔ صرف تفرقہ پسند افراد ہیں"۔

"ان میں سے بعض لوگ اجازت طلب کر رہے ہیں کہ کہیں فتنہ میں نہ مبتلا ہو جائیں حالانکہ یہ فتنہ میں گر پڑے ہیں"۔

پروردگار کا قطعی فیصلہ

جب مالک کائنات نے ان کی حقیقت کو بے نقاب کر دیا اور ان کے باطن کو ظاہر کر دیا تو اپنا وہ عادلانہ فیصلہ بھی سنا دیا جو ان کے جرائم اور ان کی افترا پردازی کے مناسب حال تھا اور پیغمبرؐ کو حکم دے دیا کہ وہ انھیں اس الٰہی قرار داد سے آگاہ کر دیں اور اس کے صدور کے اسباب بھی واضح کر دیں:

"پیغمبرؐ! آپ کہہ دیجئے کہ خوشی سے انفاق کرو یا جبراً انفاق کرو خدا تمھارے اعمال کا قبول کرنے والا نہیں ہے۔" (توبہ ۵۳)

کیوں؟ اس لئے کہ یہ خدائے تعالیٰ اور صاحبانِ ایمان کو دھوکہ دے رہے ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ ایمان بالکل غیر واقعی اور استہزا رہے یہ واقعاً خدا اور رسول کے منکر ہیں اگرچہ اپنے ایمان کا خیال رکھے ہوئے ہیں۔

پیغمبرؐ نے بھی اس قرار الٰہی اور اس کے اسباب و اعتبارات سے لوگوں کو باخبر کر دیا اور تمام حقائق کو سماج کے سامنے رکھ دیا۔ یہ اور بات ہے کہ اپنی بے مثال مہربان طبیعت کی بنا پر استغفار اور طلب ہدایت بھی فرما رہے تھے جس کے بعد پھر اعلان ہو گیا کہ "آپ ستّر مرتبہ بھی استغفار کریں تو خدا انھیں بخشنے والا نہیں ہے کہ انھوں نے خدا و رسولؐ کا انکار کیا ہے اور اللہ فاسقوں کی ہدایت نہیں کرتا ہے۔" (سورۂ توبہ ۸۰)

نظریہ عدالت صحابہ اور قرآن مجید کے تصادم کی مثالیں

● مثال اوّل

ارشاد خداوندی ہے: "ان میں سے بعض نے خدا سے عہد کیا کہ اگر وہ اپنے فضل سے مال عنایت کر دے گا تو راہِ خدا میں صدقہ دیں گے اور صالحین میں داخل ہو جائیں گے۔ لیکن جب خدا نے اپنا فضل شامل حال کر دیا تو بخل کرنے لگے اور کنارہ کشی کے انداز سے منہ موڑ لیا۔ خدا نے بھی ان کے دلوں کے نفاق کو قیامت تک کے لئے ان کے

پیچھے لگادیا ہے کہ انھوں نے خدا سے کئے ہوئے وعدہ کی خلاف ورزی کی ہے"۔ (توبہ، ۱۷۸)

ان آیات کا قصہ یہ ہے کہ ثعلبہ نامی صحابی نے رسول اکرمؐ سے درخواست کی کہ خدا کی بارگاہ میں مال کے لئے دعا فرمادیں۔ آپ نے فرمایا کہ قلیل مال جس پر شکر ادا کیا جائے اس کثیر سے بہتر ہے جو برداشت نہ ہو سکے۔ ثعلبہ نے اصرار کیا اور کہا کہ جس خدا نے آپ کو نبی بنایا ہے اس کی قسم اگر آپ کی دعا سے مال مل گیا تو میں ہر صاحب حق کو اس کا حق دے دوں گا۔ آپ نے دعا کر دی کہ "خدایا! ثعلبہ کو مال دیدے"۔ پروردگار نے دعا قبول کر لی اور مال دے دیا لیکن جب حضور نے زکوٰۃ کا مطالبہ کیا تو اس نے بخل کا راستہ اختیار کیا اور کہنے لگا کہ یہ زکوٰۃ ایک قسم کا جزیہ ہے اور میں جزیہ نہیں دے سکتا ہوں۔ پھر جب رسول اکرمؐ کا انتقال ہوگیا تو ثعلبہ نے مال زکوٰۃ ابوبکر کے پاس بھیجا انھوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ پھر دور عمر میں عمر کے پاس بھیجا اور انھوں نے بھی انکار کر دیا یہاں تک کہ عثمان کے زمانے میں وہ خود ہی ہلاک ہوگیا۔ (فتح القدیر شوکانی علی بن محمد ۲/۱۸۵، تفسیر ابن کثیر اسماعیل بن کثیر الدمشقی ۲/۳۷۳، تفسیر خازن علاء الدین علی بن ابراہیم بغدادی ۲/۱۲۵، تفسیر محمد بن الحسن مسعود الفرا بغوی ۲/۱۲۵ برحاشیہ تفسیر خازن، تفسیر طبری محمد بن جریر طبری ۶/۱۳۱)

● مثال دوم

ارشاد باری ہوتا ہے: "کیا صاحب ایمان اور فاسق برابر ہو سکتے ہیں۔ صاحبان ایمان وعمل صالح کے لئے جنتیں ہیں جو ان کے اعمال کا انعام اور تحفہ ہیں اور فاسقوں کا ٹھکانا جہنم ہے جہاں سے جب بھی نکلنا چاہیں دوبارہ واپس کر دئے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ اس آگ کا مزہ چکھو جس کا تم مسلسل انکار کر رہے تھے"۔ (سورہ سجدہ)

آیات مذکورہ میں مومن سے مراد علیؑ بن ابی طالب ہیں اور فاسق سے مراد ولید بن مغیرہ ہے جو کوفہ میں عثمان کا والی تھا اور پھر مدینہ میں معاویہ اور اس کے بیٹے یزید کا گورنر رہا۔[1]

---

[1] شواہد التنزیل حاکم حسکانی حنفی ص ۴۴۵، ۴۵۳، ۶۱۰، ۶۲۶، مناقب ابن مغازلی شافعی ص ۳۲۴، ۳۷۰، ۳۷۱، تفسیر طبری ۲۱/۱۰۷، کشاف زمخشری ۳/۵۱۴، فتح القدیر شوکانی ۴/۲۵۵، تفسیر ابن کثیر (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

• مثال سوم

" اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ کے خلاف افترا کرے جب کہ اسے اسلام کی دعوت دی جارہی ہے اور اللہ ظالم قوم کی ہدایت نہیں کرتا ہے۔" (سورہ صف)

یہ آیت عبداللہ بن ابی سرح (عثمان کے والیٔ مصر) کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے خدا پر افترا کیا تو رسول اکرمؐ نے اس کے خون کو مباح کر دیا چاہے غلافِ کعبہ ہی سے وابستہ کیوں نہ ہو، جیسا کہ صاحب السیرۃ الحلبیہ نے باب فتح مکہ میں نقل کیا ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر عثمان اسے امان دلوانے کے لیے لائے اور حضورؐ نے سکوت اختیار فرمایا کہ شائد اسی دوران اسے کوئی قتل کر دے لیکن جب کوئی غیرت دار نہ پیدا ہوا تو حضورؐ نے امان دے دی (جس کا انجام ولایت مصر کی شکل میں ظاہر ہوا)۔

مثالوں کا تجزیہ

۱۔ تینوں افراد کے بارے میں حکم خدا

ثعلبہ کے بارے میں پروردگار نے نفاق کا فیصلہ کیا اور اسے جھوٹا قرار دیا۔

ولید بن عقبہ کو فاسق اور جہنمی قرار دیا اور طے کر دیا کہ جہنم سے نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

۳/۶۲۴، اسباب النزول واحدی ص ۲۰۰، اسباب النزول سیوطی برحاشیہ تفسیر جلالین ص ۵۵۰، احکام القرآن ابن عربی ۳/۱۴۸۹، شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ۲/۸۰، ۶/۲۹۲، کفایۃ الطالب گنجی شافعی ص ۱۴۰، الدر المنثور سیوطی ۵/۱۷۸، ذخائر العقبیٰ طبری شافعی ص ۸۸، مناقب خوارزمی حنفی ص ۱۹۷، نظم درر السمطین زرندی حنفی ص ۹۲، تذکرہ خواص الامہ للسبط ابن الجوزی الحنفی ص ۲۰۷، زاد المسیر ابن جوزی حنبلی ۶/۳۴۰، انساب الاشراف بلاذری ۲/۱۴۸، ۱۵۰، تفسیر خازن ۳/۴۷۰، ۵/۱۸۷، معالم التنزیل بغوی الشافعی برحاشیہ خازن ۵/۱۸۷، السیرۃ الحلبیہ للحلبی الشافعی ۲/۸۵، تخریج الکشاف بذیل الکشاف ۳/۲۴۴، احقاق الحق ۳/۲۷۳، فضائل الخمسہ ۱/۲۶۸، المراجعات ص ۴۴۔

عبداللہ بن ابی سرح کے بارے میں واضح کر دیا کہ یہ افترا پرداز ہے اور کتابِ خدا میں تحریف کرنا چاہتا ہے جو کائنات کا سب سے بڑا ظلم ہے اور ایسے ظالم کی ہدایت کا کوئی امکان نہیں ہے۔

۲۔ تینوں کے بارے میں حکم اہلسنت

یہ سب اصحاب ہیں اور ان میں صحابیت کے تمام شرائط پائے جاتے ہیں، لہٰذا یہ سب عادل ہیں۔ ان کا جھوٹ بولنا ناممکن ہے۔ ان کا تقدس ثابت ہے۔ یہ اہل جنت ہیں۔ ان کا جہنم میں داخلہ محال ہے۔ بھلا یہ جہنم میں کس طرح جا سکتے ہیں جب کہ عبداللہ بن ابی سرح حضرت عثمان کی طرف سے والیٔ مصر اور ان کا وزیر ہے۔ ولید بن عقبہ والیٔ کوفہ ہے اور اس نے صبح کی نماز چار رکعت پڑھائی ہے بلکہ مسلمانوں کے مطالبہ پر اضافہ کے لئے بھی تیار تھا۔ وہ عثمان کا وزیر بھی تھا اور معاویہ کی طرف سے مدینہ کا والی بھی تھا۔

ان حضرات کی تنقیص کرنے والا زندیق ہے اور اس کا بائیکاٹ کرنا واجب ہے بلکہ اس کی نماز جنازہ بھی حرام ہے۔

۳۔ کس کی تصدیق کی جائے؟

پریشانی کی بات یہ ہے کہ دونوں میں کس کی بات مانی جائے۔ حکم خدا کو تسلیم کیا جائے یا اندھی تقلید کا اتباع کیا جائے۔ حکم خدا کا اتباع کرنا ہے تو نظریہ عدالت صحابہ کو مہمل قرار دینا ہوگا اور اسے خصوص قرآنی اور احکام الٰہی سے متصادم تسلیم کرنا ہوگا۔

۲۔ نظریہ عدالت صحابہ سنت نبوی سے بھی متصادم ہے

• مثال اول

ذوالثدیہ عبادت گذار صحابہ میں تھا اور لوگوں کو اس کی عبادت و مشقت پر حیرت ہوتی تھی لیکن رسولِ اکرمؐ فرمایا کرتے تھے کہ اس کے چہرہ سے شیطنت کے آثار نمایاں ہیں اور ابوبکر کو حکم بھی دیا تھا کہ اسے قتل کر دیں لیکن انھوں نے حالت نماز میں دیکھ کر چھوڑ دیا تو عمر کو بھیجا لیکن وہ بھی واپس چلے آئے۔ اس کے بعد حضرت علیؑ کو بھیجا لیکن وہ اتنی دیر میں

وہاں سے جا چکا تھا۔ (اصابہ ۱/۲۳۹)
نہروان کے موقع پر یہی شخص خوارج کا راس و رئیس تھا۔ (آرار علمار المسلمین السید مرتضیٰ الرضوی)

- مثال دوم

صحابہ کا ایک گروہ تھا جو کسی نہ کسی کے گھر میں اجتماع کر کے لوگوں کو اسلام سے روکا کرتا تھا تو حضور نے اس کے گھر کو جلا دینے کا حکم دے دیا۔ (سیرت ابن ہشام ۲/۲۳۵)

- مثال سوم

قزمان بن الحرث نے احد میں حضور کے ساتھ جنگ کی تو اصحاب نے کہنا شروع کر دیا کہ اس نے ہم سب سے بہتر کارنمایاں انجام دیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ لیکن یہ اہل جہنم میں ہے۔ لوگوں کو حیرت ہوئی اور جب وہ زخمی ہو کر میدان میں گرا تو لوگوں نے مبارکباد دی کہ ابو الغیداق! جنت مبارک ہو۔ آپ نے فرمایا کہ حرمل کے باغات! خدا کی قسم اس نے احساب کی بنیاد پر جنگ کی ہے۔ (اصابہ ۲/۲۳۵، آرار علمار المسلمین ص ۱۲۷)

- مثال چہارم

حکم بن عاص بن امیہ بن عبد شمس (عثمان کا چچا اور مروان بن الحکم کا باپ) پر رسول اکرمؐ نے لعنت کی اور اس کے صلب پر بھی لعنت کی اور فرمایا کہ میری امت کے لئے اس کے صلب سے پیدا ہونے والے کی طرف سے ویل ہے۔ حضرت عائشہ نے خود مروان سے فرمایا تھا کہ میں گواہی دیتی ہوں کہ رسول اللہ نے تیرے باپ پر اس وقت لعنت کی ہے جب تو اس کے صلب میں تھا۔ اس کے بعد آپ نے اسے طائف کی طرف نکال باہر کر دیا اور مدینہ میں اس کا داخلہ حرام کر دیا۔

حضور کے انتقال کے بعد عثمان نے اسے لانا چاہا لیکن ابوبکر نے انکار کر دیا پھر دور عمر میں کوشش کی لیکن انھوں نے بھی رد کر دیا۔ یہاں تک کہ عثمان کا اپنا دور آیا تو وہ نہایت ہی اعزاز و احترام کے ساتھ مدینہ میں داخل کیا گیا اور اسے ایک لاکھ درہم سے بھی نوازا گیا اور اس کے فرزند مروان کو مخصوص ارکانِ حکومت میں شامل کر لیا گیا

جس کے نتیجہ میں خلیفہ کا قتل واقع ہوگیا اور خلافت راشدہ خانماں خراب ہوگئی۔ مروان ابتدا میں باطل کا سررشتہ تھا اور آخر میں خلیفۃ المسلمین ہوگیا۔ شاعر نے خوب کہا ہے:

اللہ ہی اس قوم کا ہے مالک و مختار
سررشتہ باطل ہو جہاں حاکم و سردار

(مروج الذہب)

• مثال پنجم

وہ افراد جنہوں نے مسجد ضرار کی تعمیر کی تھی اور اس کے ذریعہ صاحبان ایمان میں تفرقہ پیدا کرنا چاہا تھا اور اس تعمیر سے تقرب الٰہی کا اظہار کر رہے تھے وہ بھی صحابہ کرام کی ایک جماعت تھی جن کی تعداد بارہ افراد کی تھی۔ (سیرت ابن ہشام)

• مثال ششم

حلبی کی روایت ہے کہ رسول اکرمؐ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "خدایا! فلاں فلاں پر لعنت فرما۔" (السیرۃ الحلبیہ ۲/۲۳۴)

بخاری کا بیان ہے کہ مجھ سے سالم نے اپنے والد کے حوالے سے بیان کیا کہ انھوں نے رسول اکرمؐ کو اس عالم میں دیکھا ہے کہ آپ نماز فجر میں آخری رکعت کے رکوع سے سر اٹھانے کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ "خدایا! فلاں فلاں پر لعنت فرما۔"

سیوطی کا بیان ہے کہ احمد۔ بخاری۔ ترمذی نسائی۔ ابن جریر۔ بیہقی سب نے ابن عمر سے روایت کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے روز احد فرمایا تھا کہ خدایا! ابوسفیان پر لعنت فرما۔ حرث بن ہشام پر لعنت فرما۔ سہیل بن عمرو پر لعنت فرما۔ صفوان بن امیہ پر لعنت فرما۔"

سیوطی ہی کا بیان ہے کہ ترمذی۔ ابن جریر۔ ابن ابی حاتم نے ابن عمر سے نقل کیا ہے کہ حضور چار افراد کے لئے بد دعا فرمایا کرتے تھے اور نماز صبح میں فرمایا کرتے تھے کہ "خدایا! فلاں فلاں پر لعنت فرما۔" (در منثور ۵/۷۱)

نصر بن مزاحم المنقری نے عبد الغفار بن القاسم۔ عدی بن ثابت کے ذریعہ براء بن عازب سے نقل کیا ہے کہ ابوسفیان اور معاویہ حضورؐ کے سامنے آئے تو آپ نے فرمایا کہ

"خدا تابع اور متبوع دونوں پر لعنت فرمائے۔ خدایا اقیص سے انتقام لینا"۔ ابن برار نے اپنے والد سے دریافت کیا کہ یہ اقیص کون ہے تو انھوں نے فرمایا کہ معاویہ (واقعۃ صفین تحقیق وشرح الاستاذ عبدالسلام محمد ہارون)

نصر ہی نے علی بن الاقمر کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضور نے ابوسفیان کو اس عالم میں دیکھا کہ وہ سوار تھا۔ معاویہ آگے آگے تھا اور اس کا دوسرا بھائی پیچھے پیچھے۔ تو آپ نے فرمایا "خدا راکب و قائد و سائق تینوں پر لعنت کرے"۔ نصر نے علی بن الاقمر سے پوچھا کہ آپ نے خود سنا ہے؟ فرمایا بے شک ورنہ میرے کان بہرے ہو جائیں۔ (واقعۃ صفین ص ۲۲۰)

محمد بن ابی بکر نے معاویہ کو خط لکھا کہ تجھے اپنی اوقات معلوم ہے اور تو اس شخص سے مقابلہ کرتا ہے جو نیت میں اصدق الناس اور ذریت میں افضل الناس ہے۔ وہ زوجہ کے اعتبار سے بھی خیر الناس ہے اور ابن عم کے اعتبار سے بھی افضل الناس ہے۔ اس کے بھائی نے روز موتہ اپنی جان قربان کر دی ہے اور اس کا چچا روز احد سید الشہداء تھا اور اس کے باپ نے ہمیشہ رسول اکرمؐ سے دفاع کیا ہے جب کہ تو لعین بن لعین ہے۔ تو اور تیرا باپ دونوں ہمیشہ رسول اکرمؐ کی ہلاکت کے خواہاں اور نور خدا کے خاموش کرنے کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ اس کام کے لئے تم نے لشکر اکٹھا کئے ہیں اور بیشمار مال صرف کیا ہے، قبائل کو جمع کیا ہے اور اسی راہ میں تیرا باپ مر گیا اور تو اسی کا جانشین ہے۔

(مروج الذہب مسعودی ۱۴/۳)

معاویہ نے بھی اس لعنت کی تردید نہیں کی ہے اگرچہ اس خط کا بہت بلیغ جواب دیا ہے۔ (مروج الذہب ۳/۱۵-۱۶)

مذکورہ مثالوں کا تجزیہ

حیات مرسل اعظمؐ کی مذکورہ چھ مثالیں "نظریہ عدالت صحابہ" سے مکمل طور پر متصادم ہیں اور ان مثالوں کے ہوتے ہوئے اس نظریہ کا کوئی موضوع نہیں رہ جاتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جسے رسول اکرمؐ واجب القتل قرار دیں وہ بھی عادل ہو؟ یا جن کے گھروں

میں آگ لگا دینے کا حکم دے دیں وہ بھی عادل ہوں ؟ یا جن کی جنت کو حرمل کے باغات قرار دیں اور ان کے قتال کو احساب کی بنیاد پر قرار دیں وہ بھی عادل ہوں ؟ یا جن پر اور ان کے صلب میں رہنے والی اولاد پر لعنت کریں وہ بھی عادل ہوں ؟ یا جو مسجد ضرار بنا کر مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا چاہتے ہوں وہ بھی عادل ہوں ؟

عدالت صحابہ کا علی الاطلاق عقیدہ سنت شریفہ سے مکمل طور پر متعارض ہے اور سنت شریفہ مکمل طور پر عدالت کی منکر ہے صرف فکر و نظر سے بیگانہ اندھی تقلید کرنے والے افراد ہی اس عدالت مطلقہ کے قائل ہو سکتے ہیں ورنہ امت کو یہ سوچنا ہے کہ اسے حضرت محمد مصطفٰےؐ کے ساتھ رہنا ہے یا اندھی تقلید کے ساتھ ۔؟

جہاں تک افاضل صحابہ کا تعلق ہے ۔ ان کی عدالت میں کوئی شک نہیں ہے ۔ کلام صرف عمومی عدالت میں ہے اور عمومی عدالت کا عقیدہ سنت شریفہ سے مکمل طور پر متعارض اور متصادم ہے ۔

۳۔ نظریۂ عدالتِ صحابہ اور تاریخی حقائق

● ۔ مثال اول

معاویہ نے مسلمانوں سے بیعت ۔ قتل و غارت، سب و شتم انصار رسولؐ ۔ استغلال اموال مسلمین کے ذریعہ حاصل کی اور ۲۰ سال تک شام کی حکومت کے دوران مال مسلمین کو اپنی حکومت کے استحکام کے لئے اور مزاج شریعت کے خلاف استعمال کرتا رہا ۔ اس نے بیعت کرنے والوں کے لئے ایک وظیفہ "رزق بیعت" کے نام سے معین کر دیا تھا جو نئے خلیفہ کی بیعت کرنے والوں کو دیا جاتا تھا ۔ (نظام الحکم للقاسمی ص ۲۸۲)

معاویہ نے اپنے فرزند یزید کے لئے جبریہ بیعت لیتے وقت اور اپنے وصیت نامہ میں یہ وضاحت کر دی تھی کہ میرا تمام تر مقصد ملک دنیا ہے اور اسی بنیاد پر اس نے یزید کے عیاشانہ اعمال ۔ بد اخلاقی اور بے دین طرز عمل کے باوجود اسے صحابہ رسولؐ پر حاکم بنا دیا تھا ۔

• ۔مثال دوم

معاویہ نے اپنے فرزند یزید کو وصیت کی کہ "اگر اہل مدینہ قیام کریں تو مسلم بن عقبہ کو بھیج دینا"۔ مسلم بن عقبہ کے ساتھ پاکیزہ کردار صحابہ کی ایک فہرست بھی تھی تاکہ ایک ایک کر کے سب کا خاتمہ کر دے۔ چنانچہ ابن عقبہ مدینہ میں داخل ہوا اور وہ اعمال انجام دئے جس سے آسمان لرز جائے۔ مروان جیسا رہنمائے لشکر رہنمائی کر رہا تھا اور مسلم کا لشکر اس کے احکام کو نافذ کر کے بے رحمی کے ساتھ مسلمانوں کا خون بہا رہا تھا۔ اس وصیت پر عمل درآمد کا مختصر نتیجہ یہ ہوا:

- اہل بدر کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا۔
- قریش اور انصار کے ... ۷ افراد تہ تیغ کر دئے گئے۔
- عوالی اور عوام عرب میں سے دس ہزار افراد قتل کر دئے گئے۔

یہ سب کچھ سنہ ۶۳ھ میں واقعہ حرہ میں پیش آیا جس کے بعد عبداللہ بن عمر نے اعلان کر دیا کہ "ہم غلبہ حاصل کرنے والے کے ساتھ ہیں"۔ اور یہ ایک دستوری قاعدہ بن گیا جس کی بنیاد پر وہ علیؑ اور معاویہ کے معرکہ میں بھی غیر جانبداری کے ساتھ غلبہ کا جائزہ لیتے رہے تھے۔
(الامامۃ والسیاسۃ)

• ۔مثال سوم

معاویہ نے بُسر بن ارطاۃ کو سنہ ۴۰ھ میں تین ہزار کے لشکر کے ساتھ مدینہ روانہ کیا۔ بُسر مدینہ پہونچ کر منبر پر گیا اور اہل مدینہ کو قتل کی دھمکی دی جس کے بعد لوگ بیعت معاویہ کے لئے تیار ہو گئے۔ اس کے بعد بُسر مکہ اور یمن کی طرف گیا۔ وہاں والیٔ یمن عبیداللہ بن عباس موجود نہ تھے۔ ان کے دو کمسن فرزند عبدالرحمٰن اور قثم موجود تھے۔ بسر نے ان دونوں کو ان کے ماموں سمیت قتل کر دیا اور اس کے علاوہ مدینہ میں بیشمار اہل مدینہ اور جرف میں بیحساب رجال ہمدان کو قتل کیا۔ صنعاء میں وہاں کے افراد کا قتل عام کیا اور جس شخص کے بارے میں یہ سُن لیا کہ وہ علیؑ کا دوستدار ہے یا ان کی طرف رجحان رکھتا ہے اسے بھی قتل کر دیا۔
(الامامہ والسیاسۃ، مروج الذہب مسعودی ۲۶/۳)

عبیداللہ بن عباس کے فرزندوں کے قتل کے بعد ان کی ماں جویریہ کا یہ عالم تھا کہ بال بکھرائے ہوئے گھر کے گرد چکر لگاتی تھی اور ایسے دلخراش بین کرتی تھی جس سے پتھر بھی پگھل جائیں اس لئے کہ اس نے اپنے بچوں کو دو ٹکڑے ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

(مروج الذہب ۲/ ۲۷)

● - مثال چہارم

تاریخ کا بیان ہے کہ امام حسنؑ بن علیؑ کی زوجہ جعدہ بنت الاشعث الکندی نے انھیں زہر دیا اور اس کا انتظام معاویہ نے کیا تھا اور یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر جعدہ اس مہم میں کامیاب ہوگئی تو اسے ایک لاکھ درہم انعام دیا جائے گا اور یزید کے ساتھ اس کا عقد کر دیا جائے گا۔ جس کے بعد اس نے زہر دے دیا اور معاویہ نے اسے مال بھی دے دیا لیکن عقد کے بارے میں یہ کہہ دیا کہ مجھے یزید کی زندگی عزیز نہ ہوتی تو تجھ جیسی عورت سے عقد کر دیتا۔

اور امام حسنؑ نے وقت آخر فرمایا کہ معاویہ نے اپنا مقصد تو حاصل کر لیا لیکن نہ وعدہ کو وفا کیا اور نہ بات کو سچ کر دکھایا۔

عباس بن عبدالمطلب کا بیان ہے کہ میں رسول اکرمؐ کی خدمت میں تھا کہ علیؑ بن ابیطالب آگئے۔ حضورؐ انھیں دیکھ کر مسرور ہو گئے تو میں نے سبب پوچھا؟ فرمایا کہ خدا کی قسم وہ انھیں مجھ سے بھی زیادہ دوست رکھتا ہے۔ ہر نبی کی ذریت اس کی صلب سے ہوتی ہے لیکن میری ذریت ان کے صلب سے ہوگی۔ (مروج الذہب ۲/ ۷۷)

معاویہ نے جن دوسرے افراد کو زہر دیا ہے۔ ان میں عبدالرحمٰن بن خالد بن الولید بھی شامل ہیں کہ جب اس نے اہل شام سے مشورہ کیا کہ کسے اپنے بعد حاکم بنایا جائے اور لوگوں نے عبدالرحمٰن کا نام لے لیا تو معاویہ نے پہلی فرصت میں انھیں زہر دے کر ان کا کام تمام کر دیا اور یہی برتاؤ عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے ساتھ بھی کیا۔ (استیعاب حالات عبدالرحمٰن بن خالد۔ شیخ المضیرہ ص ۱۷۵)

● - مثال پنجم

محمد بن جریر طبری نے محمد بن حمید الرازی۔ علی بن مجاہد۔ محمد بن اسحاق۔ فضل بن عباس بن ربیعہ کے واسطہ سے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن عباس معاویہ کے پاس وارد ہوئے تو انھوں نے

بیان کیا کہ میں مسجد میں تھا کہ اچانک معاویہ کے محل سے تکبیر کی آواز بلند ہوئی۔ اس کے بعد سارے اہل محل نے تکبیر کہی اور پھر تمام اہل مسجد نے تکبیر کہی تو فاختہ بنت قرظ بن عمرو بن نوفل بن عبد مناف نے کھڑکی سے سر نکال کر کہا کہ خدا امیر المومنین کو خوش رکھے کون سی ایسی خبر ملی ہے کہ تکبیر کی آواز بلند فرمائی ہے؟ معاویہ نے برجستہ جواب دیا کہ حسنؑ بن علیؑ کا انتقال ہوگیا ہے۔ فاختہ نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور یہ کہہ کر رونا شروع کر دیا اور کہا کہ آج سردار مسلمین۔ فرزند بنت رسولؐ کا انتقال ہوگیا ہے۔ معاویہ نے کہا کہ بیشک وہ ایسے ہی تھے اور ان پر گریہ کرنا حق بجانب ہے۔ اس کے بعد جب ابن عباس کو خبر ملی تو معاویہ کے پاس وارد ہوئے معاویہ نے کہا کہ تمھیں خبر ہے حسنؑ بن علیؑ کا انتقال ہوگیا ہے؟ ابن عباس نے کہا کہ اسی بات پر تکبیر بلند کی ہے؟ اس نے کہا بے شک!

(مروج الذہب ۲/۴۷۸ - ۴۷۹)

• ـ مثال ششم

کربلا میں ایک لشکر عمرو بن سعد بن ابی وقاص کی قیادت میں آیا اور اس کے بعد لشکروں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور امام حسینؑ نے دیکھ لیا کہ اب جنگ سے نجات نہیں ہے۔ چنانچہ راہ خدا میں جہاد کر کے شہید ہوگئے۔ قبیلہ مذحج کے ایک شخص نے سر اقدس کو قلم کیا اور اسے یہ کہتے ہوئے ابن زیاد کے سامنے پیش کیا کہ "میرے سامان کو سونے چاندی سے بھر دے کہ میں نے ایک باوقار بادشاہ کو قتل کیا ہے۔ میں نے اسے قتل کیا ہے جس کے نسب کو دیکھا جائے تو اس کے باپ سے بہتر کسی کا باپ اور اس کی ماں سے بہتر کسی کی ماں نہیں ہے۔

بلاذری کی روایت "انساب الاشراف" میں ہے کہ شہادت کے بعد ظالموں نے لباس تک لوٹ لیا اور یہی نہیں بلکہ "صحابئ رسولؐ" عمرو بن سعد بن ابی وقاص نے حکم دیا کہ جسد امام حسینؑ کو گھوڑوں سے پامال کر دیا جائے۔ چنانچہ اسحاق بن ہبیرہ الحضرمی نے اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے چند افراد کے ساتھ لاش کو پامال کر دیا اور عمرو بن سعد ذریت پیغمبرؐ کو تباہی کے گھاٹ اتار کر فاتحانہ انداز سے واپس آیا کہ اس نے اولاد رسولؐ کو وہاں پیاسا رکھا ہے جہاں جانوروں کے لئے پانی حلال تھا اور اولاد رسولؐ کے لئے حرام۔

•۔مثال ہفتم

امام حسنؑ نے معاویہ کے ساتھ مقابلہ کے دوران فرمایا "اہل کوفہ اگر میرے ذہن سے تمھاری تین باتیں نکل جاتیں تو میں غافل ہو جاتا۔ پدر بزرگوار کا قتل۔ میرے سامان کی غارتگری اور میرے اوپر نیزہ سے حملہ۔

آپ خلافت پانے کے بعد بارہ ہزار کے لشکر کے ساتھ برآمد ہوئے۔ مدائن میں قیام فرمایا لیکن معاویہ کے اُکسانے پر لشکر ہی کے بعض افراد نے آپ کا سارا سامان لوٹ لیا اور آپ کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو گئے بلکہ بعض لوگوں نے یہاں تک منصوبہ بنا لیا کہ آپ کو گرفتار کر کے معاویہ کے حوالے کر دیں اور بعض لوگوں نے آپ کے قتل تک کا ارادہ کر لیا۔

مذکورہ بالا مثالوں کا تجزیہ

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قتل و غارت، تباہ کاری و غارت گری۔ اہل بدر کا خاتمہ، گیارہ ہزار مسلمان اہل مدینہ کا ایک روز میں فنا کے گھاٹ اتار دینا عدالت سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

اسی طرح بچوں اور محبانِ علیؑ کا بیدردانہ قتل بھی دعوائے عدالت کے لئے سازگار نہیں ہے۔ اور امام حسنؑ کو زہر دینا۔ امام حسینؑ کو قتل کر کے ان کی لاش اقدس کو پامال کرا دینا اور ان کے بچوں پر فرات کا پانی بند کر دینا سو فیصدی عدالت کے خلاف ہے۔

اور یہ سارے واقعات ان لوگوں کے تصورات کو پاش پاش کر دیتے ہیں جو تمام صحابہ کی عدالت کا عقیدہ رکھتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ سب جنتی ہیں اور کوئی جہنم میں نہیں جا سکتا ہے۔ یہ تصور تو درحقیقت ان لوگوں کی حمایت ہے جنھوں نے احکام خدا کی بیحرمتی کی ہے اور دینِ خدا کا مذاق اڑایا ہے۔

یاد رکھئے کہ امام حسنؑ کو زہر دینا۔ امام حسینؑ کو قتل کر دینا اور ذریت رسولؐ کو فنا کر دینا ایسے اعمال نہیں ہیں جنھیں اجتہاد کا درجہ دے دیا جائے۔ یہ صریحی مظالم ہیں جن کے انجام دینے والے کو عقل و شرع اور کسی بھی قانون بشریت کی روشنی میں عادل نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ

کام تو امریکہ۔ روس۔ فرانس اور بت پرست علاقوں کا قائد لشکر بھی انجام نہیں دے سکتا ہے کہ دو کمسن بچوں کو باپ کی عدم موجودگی میں ماں کے سامنے قتل کر دیا جائے جو کام بُسر بن ارطاۃ نے انجام دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان بچوں کے قتل سے معاویہ یا یزید کی حکومت میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ یہ ایک وحشیانہ عمل تھا جس کے انجام دینے والے کو کسی قیمت پر صحابی عادل نہیں کہا جا سکتا ہے اور کیا یہ بات معقول ہے کہ ایسے افراد کو جنتی قرار دے دیا جائے اور جہنم میں ان کے داخلہ کو محال بنا دیا جائے۔ اندھی تقلید کے قانون سے ہر عمل جائز ہے چاہے شریعت کے اعتبار سے کیسا ہی حرام کیوں نہ ہو۔

حقیقت امر یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد پیش آنے والے حادثات اور واقعات نظریہ عدالت صحابہ کی دھجیاں اڑا دیتے ہیں اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نظریہ صرف سیاسی بدکاریوں کی توجیہہ کے لئے ایجاد ہوا تھا اور اس کا مقصد شریعت کی ہر مخالفت کی پردہ پوشی اور نااہلوں کے تخت حکومت پر قبضہ کرنے کی ہر ممکن تاویل کے علاوہ کچھ نہیں تھا جب کہ خدا اپنے ہر امر پر غالب ہے۔

بدقسمت وہ نسلیں ہیں جنھوں نے ان مہمل نظریات کو فیشنی لباس کی طرح اختیار کر لیا ہے اور اسے بھی اپنی سعادتمندی کی علامت بنا لیا ہے۔

۴۔ نظریۂ عدالتِ صحابہ اور روح اسلام حُسنِ عاقبت، غایتِ حیات

مالک کائنات کا ارشاد ہے کہ "ہم نے زمین کی ہر شئے کو زینت قرار دیا ہے تاکہ لوگوں کا امتحان لیں کہ حُسن عمل کے اعتبار سے کون زیادہ بہتر ہے"۔ (کہف)

۔ "اسی خدا نے موت و حیات کو پیدا کیا ہے تاکہ تمھارا امتحان لے کہ تم میں حسن عمل کے اعتبار سے کون زیادہ بہتر ہے"۔ (سورہ کہف)

● ۔ زندگی اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ مکلف افراد کے لئے میدان امتحان بنے اور زندگی کا ہر شعبہ امتحان کا ایک عنصر اور ایک پرچہ ہے۔

یہ امتحان ابتدائے تکلیف و رشد و عقل سے شروع ہو جاتا ہے اور موت پر تمام

ہوتا ہے تو اگر یہ طے ہوجائے کہ یہ تمام صحابہ عادل ہیں۔ ان سے خطا نہیں ہوسکتی ہے ان کا جنت میں جانا ضروری ہے اور جہنم میں داخلہ محال ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ امتحان کے دائرہ سے بالاتر ہیں اور ان کی حیات کا کوئی مقصد نہیں ہے اس لئے کہ حیات کا سلسلہ امتحانات کے لئے شروع کیا گیا ہے۔

(واضح رہے کہ اس بیان کا معصومینؑ پر انطباق نہیں ہوتا ہے کہ وہ مرحلۂ امتحان سے برابر گذرتے رہتے ہیں اور مالک کائنات نے ان کے شرف کو امتحان کی کامیابی ہی سے وابستہ کیا ہے جیسا کہ جناب ابراہیمؑ کی امامت کے بارے میں واضح طور سے اعلان ہوا ہے اور پھر ذبح اسماعیلؑ کو بلاء مبین قرار دیا گیا ہے ــــ جوادی)

● ــ اس کے بعد یہ عقیدہ روح اسلام کے بھی خلاف ہے کہ اسلام نے انسان کو بنیادی طور پر خسارہ میں قرار دیا ہے جب تک کہ ایمان۔ عمل صالح اور حق و صبر کی وصیت کی ادا نہ پیدا ہوجائے۔ جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ مرد مسلم کی قدر و قیمت آخر وقت تک احکام الٰہیہ کی پابندی سے متعین ہوتی ہے اور اس کا ہر انحراف اسے دائرہ اسلام سے نکال کر غضب الٰہی کی منزل تک پہونچا دیتا ہے۔ اعتبار حسن عاقبت اور انجام بخیر ہونے کا ہے۔ بنا بریں اگر کوئی مسلمان زندگی بھر احکام الٰہیہ کی پابندی کرے اور موت سے ایک دن پہلے کافر ہوجائے تو اس کا سابق کردار کام آنے والا نہیں ہے۔

رسول اکرمؐ الہام خداوندی کی بنا پر آئندہ پیش آنے والے حالات سے باخبر تھے۔ اسی لئے آپ نے حجۃ الوداع میں تمام مسلمانوں سے خطاب کرکے فرما دیا تھا کہ خبردار! میرے بعد کفر کی طرف پلٹ نہ جانا کہ ایک دوسرے کو قتل کرنے پر آمادہ ہوجائے۔

یہ خطاب لغوی اور اصطلاحی دونوں طرح کے صحابۂ کرام سے تھا اور سامعین میں یہی تمام حضرات تھے۔

ــ بخاری نے ابن عباس کے حوالے سے حضور اکرمؐ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ "تم لوگ روز قیامت برہنہ اور ننگے پیر محشور کئے جاؤگے اور میرے اصحاب میں سے ایک جماعت کو داہنے بائیں کھینچا جائے گا تو میں آواز دوں گا ارے یہ میرے اصحاب ہیں!

تو جواب ملے گا کہ یہ تمھارے بعد اپنے پرانے مذہب پر پلٹ گئے تھے۔ تو میں وہی کہوں گا جو خدا کے بندہ صالح نے کہا تھا کہ خدایا! میں اسی وقت تک ان کا نگراں تھا جب تک ان کے درمیان تھا۔

ـ مسلم نے اس حدیث کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ "میرے پاس میرے اصحاب میں سے کچھ لوگ وارد ہوں گے جنھیں میں پہچان لوں گا تو مجھ سے الگ کر دئے جائیں گے تو میں آواز دوں گا کہ یہ میرے اصحاب ہیں تو جواب ملے گا کہ آپ کو نہیں معلوم کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا کارنامے انجام دئے ہیں"۔

ـ بخاری نے رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ "میں میدان محشر میں رہوں گا اور ایک جماعت کو دیکھ کر پہچان لوں گا تو انھیں طلب کیا جائے گا۔ میں پوچھوں گا کہ کہاں طلب کئے جا رہے ہیں؟ جواب ملے گا جہنم کی طرف! میں کہوں گا کہ انھوں نے کیا کیا ہے؟ جواب ملے گا کہ یہ آپ کے بعد پرانے مذہب پر پلٹ گئے تھے۔ اس کے بعد میں دیکھوں گا کہ صرف تھوڑے سے افراد باقی رہ جائیں گے اور سب واصل جہنم ہو جائیں گے۔

ـ دوسری روایت میں حضورؐ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ میرے پاس روز قیامت میرے اصحاب کا ایک گروہ وارد ہوگا اور اسے حوض کوثر سے ہنکا دیا جائے گا تو میں کہوں گا خدایا یہ میرے اصحاب ہیں؟ تو ارشاد ہوگا کہ تمھیں نہیں معلوم کہ انھوں نے تمھارے بعد کیا بدعتیں ایجاد کی ہیں۔ یہ تمھارے بعد اپنے پرانے مذہب پر پلٹ گئے تھے۔

ـ سہل بن سعد سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "میرے پاس کچھ قومیں وارد کی جائیں گی جنھیں میں پہچانتا ہوں گا اور وہ مجھے پہچانتے ہوں گے۔ اس کے بعد انھیں دور کر دیا جائے گا۔

ـ حدیث ابن عباس میں وارد ہوا ہے کہ "میرے اصحاب میں سے کچھ لوگ بائیں طرف لے جائے جائیں گے تو میں کہوں گا کہ یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ جواب ملے گا کہ آپ کے بعد یہ سب مرتد ہو گئے تھے۔

۔ ابو یعقوب نے مسند عمر میں ایسی ہی روایت نقل کی ہے۔

۔ بخاری نے باب غزوۂ حدیبیہ میں علاء بن المسیب کے حوالے سے ان کے باپ کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے براء بن عازب سے ملاقات کر کے کہا کہ آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ کو شرف صحبت رسولؐ حاصل ہے اور آپ نے زیر شجرہ بیعت کی ہے تو انھوں نے کہا کہ فرزند برادر تمھیں نہیں معلوم ہے کہ ہم لوگوں نے اس کے بعد کیا کیا ہے۔؟

۔ عبداللہ کے حوالے سے رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ "میں حوض کوثر پر تم سے پہلے پہونچوں گا اس کے بعد کچھ لوگوں کو ہٹا دیا جائے گا تو میں کہوں گا کہ خدایا! یہ میرے اصحاب ہیں؟ جواب ملے گا کہ آپ کو نہیں معلوم کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا کیا کام انجام دئے ہیں"۔

۔ بخاری نے اسماء بنت ابی بکر کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ "میں حوض کوثر پر ہوں گا تو تم لوگوں کو وارد ہوتے دیکھوں گا۔ پھر کچھ میرے سامنے پکڑ لئے جائیں گے تو میں کہوں گا کہ یہ مجھ سے اور میری امت سے ہیں؟ تو جواب ملے گا کہ آپ کو معلوم ہے کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا کیا ہے؟ خدا کی قسم یہ مستقل اپنے پرانے مذہب پر پلٹ گئے تھے"۔ بخاری کا بیان ہے کہ اس کے بعد ابن ملیکہ برابر یہ دعا کرتے تھے کہ خدایا! ہم تیری پناہ چاہتے ہیں اس امر سے کہ اُلٹے پاؤں پلٹ جائیں اور دین میں فتنہ میں مبتلا ہو جائیں۔ (آراء علماء المسلمین فی التقیہ والصحابہ وصیانۃ القرآن الکریم للسید مرتضیٰ الرضوی ص ۱۰۰۔ ۱۔ مسند الامام احمد ۵/۵۰، ۱/۲۳۵)

مذکورہ بالا نصوص کا تجزیہ

سابق میں بیان کی ہوئی روایات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ صحابہ کی ایک جماعت دین سے منحرف۔ مرتد اور جہنم میں داخل ہونے والی ہے اور ان روایات کو بخاری اور مسلم نے اپنے صحاح میں درج کیا ہے جن کا اعتبار عالم اسلام میں قرآن مجید کے فوراً بعد ہے۔ بنا بریں ان روایات کو نظریہ عدالت کے ساتھ کس طرح جمع کیا جا سکتا

ہے جب کہ یہ روایات حالات و واقعات سے سو فیصدی ہم آہنگ ہیں۔ اس کا مقصد تو یہ ہے کہ نظریہ عدالت بالکل بے بنیاد ہے اور غرض تخلیق "امتحان" سے بھی متصادم ہے۔ اور روح اسلام سے بھی متعارض ہے جس نے پاکیزہ زندگی کو ایمان، عمل صالح اور مسلسل حق و صبر کی وصیت کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اور ہر شے کا فیصلہ حسن عاقبت اور انجام بخیر پر رکھا ہے۔

نظریۂ عدالت کا اندرونی تضاد

ابن عرفہ المعروف بہ نفطویہ جو اکابر محدثین میں شمار ہوتے ہیں۔ ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں ان کا یہ بیان درج کیا ہے کہ "فضائل صحابہ کی اکثر حدیثیں بنی امیہ کے زمانے میں وضع ہوئی ہیں جن کا مقصد حکومت وقت سے تقرب اور بنی ہاشم کو ذلیل کرنا تھا۔ ان حدیثوں کا اسلوب ایسا رکھا گیا کہ گویا ہر صحابی اہل زمین کے لئے ایک نمونۂ عمل ہے اور اس کی مخالفت کرنے والا عذاب الیم کا حقدار ہے جیسا کہ انس بن مالک کے حوالے سے حضورؐ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ "جس نے بھی کسی ایک صحابی کو بُرا بھلا کہا اس پر اللہ۔ ملائکہ اور تمام انسانوں کی لعنت ہے اور جس نے ان میں سے کسی ایک کی بھی توہین کی اس کے ساتھ کھانا۔ پینا بند اور اس کی نماز جنازہ حرام"۔ اور پھر ان روایات میں صحابہ میں کوئی تفرقہ اور امتیاز بھی نہیں رکھا گیا ہے۔

گذارش

منصوص ولی خدا۔ برادر رسولؐ خدا۔ سردار اہلبیتؑ۔ باب مدینۃ العلم۔ کم سے کم ایک صحابی تو ہے اور اس لقب کا حقدار ہے تو اب اسے بُرا بھلا کہنے والے۔ اس پر لعنت کا حکم دینے والے اور پوری مملکت معاویہ میں اس کی توہین کرنے والوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور جن لوگوں نے اس حکم میں معاویہ کی اطاعت کی ان کے بارے میں کیا فیصلہ ہے؟ آیا مذکورہ بالا حدیث ان پر صادق آئے گی یا نہیں؟ جب کہ معاویہ کو اس مسئلہ میں نصیحت کی گئی تو اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ سلسلہ سب و شتم علیؑ اس وقت تک جاری

رہے گا جب تک بچے جوان اور بڑے بوڑھے نہ ہو جائیں۔ اس نے ایک صحابی سمرہ بن جندب کو پانچ لاکھ درہم دئے کہ رسول اکرمؐ کی طرف سے یہ روایت بیان کر دے کہ "من الناس من یعجبک قولہ فی الحیوٰۃ الدنیا" کی آیت علیؑ ابن ابی طالبؑ کے بارے میں ہے اور "من الناس من یشری نفسہ" کی آیت عبدالرحمٰن بن ملجم کے بارے میں ہے اس لئے کہ اس نے علیؑ کو قتل کیا ہے۔

آخر اس نظریۂ عدالت کو کیا ہو گیا ہے کہ بعض صحابہ پر منطبق ہوتا ہے اور بعض پر نہیں۔ جب کہ دنیا کا کوئی باخبر انسان اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا ہے کہ معاویہ نے اپنے حدودِ مملکت میں سبِ علیؑ کو ضروری قرار دیا تھا اور لوگ بخوشی یا بجبر حکومت کے اس حکم کی اطاعت کر رہے تھے۔

اہل سنت اور اہل تشیع کے نزدیک صحابہ کی حیثیت

عہد صحابہ اور تابعین کے پہلے طبقہ تک صحابہ کا کام اقوال و افعال رسول اکرمؐ کا نقل کرنا تھا اور یہ راویوں کے حالات کا جائزہ لیتے رہتے تھے بلکہ انھیں قسم بھی دلاتے تھے اور بعض افراد کی روائتوں سے اس لئے اجتناب کرتے تھے کہ وہ غلط بیانی سے کام لیتے تھے اور اس کے بعد حضرت عمر کا تازیانہ بھی موجود تھا۔

اس وقت تک سنت کا دائرہ صرف اقوال و افعال پیغمبر اسلامؐ تک محدود تھا لیکن اس کے بعد جب مختلف مذاہب پیدا ہو گئے اور اسلامی حکومت کے مختلف علاقوں میں ان کا زور پیدا ہو گیا تو سنت میں صحابہ کا قول اور ان کا فتویٰ بھی داخل ہو گیا۔ اب قانون یہ طے پایا کہ اگر کسی واقعہ میں کتاب و سنت رسولؐ میں کوئی حکم موجود نہ ہو تو آرار صحابہ سے استفادہ کیا جائے جو مذہب میں تیسرے مصدر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس مسئلہ میں حنفی۔ مالکی اور حنبلی حضرات، شافعی حضرات سے زیادہ متعصب تھے اور اقوال صحابہ پر زیادہ زور دیتے تھے۔ حد یہ ہے کہ ابو حنیفہ جو قیاس کے انتہائی درجہ کے حامی تھے اور اسے کتاب خدا کے بعد بہترین ماخذ تصور کرتے تھے ان کا بھی ارشاد تھا کہ جب میں کتاب خدا

یا سنت رسولؐ میں کوئی حکم نہیں پاتا ہوں تو قول صحابہ سے استناد کرتا ہوں اور اگر ان کی رائے میں اختلاف ہوتا ہے تو جس کو چاہتا ہوں لے لیتا ہوں اور جس کو چاہتا ہوں ترک کر دیتا ہوں اور ان کے اقوال کے ہوتے ہوئے تابعین کی طرف رجوع نہیں کرتا ہوں۔

ابن القیم نے "اعلام الموقعین" میں نقل کیا ہے کہ امام احمد کے نزدیک اصول احکام پانچ ہیں۔ (۱) نص (۲) فتویٰ صحابہ۔ بلکہ احناف اور حنابلہ نے آیات قرآن کو عمل اصحاب سے تخصیص بھی دی ہے اس لئے کہ صحابی کتاب خدا پر بلا دلیل عمل کو ترک نہیں کرتا ہے تو اگر اس نے عموم کتاب کے خلاف عمل کیا ہے تو اس کا عمل خود تخصیص کتاب کی دلیل ہے اور یہ عمل مثل قول ہے۔ ("ابو حنیفہ" ابو زہرہ ص ۳۰۴)

کس قدر فاصلہ ہے اہلسنت کے اس مسلک میں اور اہل تشیع کے اس نظریہ میں کہ مقام تشریع میں سنت پر بھی اس وقت تک اعتماد نہیں ہو سکتا ہے جب تک آیات قرآنی میں اس کی تائید نہ موجود ہو۔ اس لئے کہ قرآن میں ہر شے کا بیان موجود ہے اور وہ لغت عرب میں نازل ہوا ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

سنت کی روایت کرنے والے وہ افراد ہیں جن کے بارے میں غلط بیانی کا امکان پایا جاتا ہے اور خود صحابہ ایک دوسرے کی روایت پر بلا تحقیق اعتبار نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کرتے تھے یہاں تک کہ باہم ایک دوسرے پر تیر اندازی بھی ہوئی ہے اور تہمتوں کے معرکہ میں ایک دوسرے کو قابل قتل بھی قرار دیا گیا ہے۔ (المدخل الی علم اصول الفقہ معروف الدوالیبی ص ۲۱۷)

مختصر یہ ہے کہ جمہور کے نزدیک اقوال و آراء و اجتہادات صحابہ تشریع کے نمایاں اصول میں ہیں اور اس اصل کے ذریعہ عمومات کتاب خدا کو تخصیص بھی دی جا سکتی ہے گویا یہ ایک وحی سماوی ہے جس میں باطل کا کسی طرف سے دخل ممکن نہیں ہے جب کہ واضح سی بات ہے کہ تقدیس کا یہ غلو کسی قیمت پر درجۂ عصمت سے کم نہیں ہے اور اس کے دائرہ میں وہ منافقین اور مشرکین بھی شامل ہیں جنھوں نے بجبر و اکراہ کلمہ پڑھ لیا تھا۔

تقدیس صحابہ کا یہ غلو درحقیقت مذاہب کی پیداوار کے دور میں پیدا ہوا ہے جس کا مقصد مذہب اہلبیتؑ اور فقہ آل محمدؐ سے مقابلہ کرنا تھا جسے شیعوں نے اپنی فقہ کا مرکز بنا رکھا تھا اور جسے تمام مراحل و فصول میں دین اسلام کی عملی تصویر قرار دے رہے تھے اس لئے کہ ان حضرات نے دین اپنے جد بزرگوار پیغمبر اسلامؐ سے وراثت میں حاصل کیا تھا۔

ائمہ اہلبیتؑ کا اعلان عام تھا کہ "ہم جب کوئی حدیث بیان کرتے ہیں تو کتاب خدا کے مطابق بیان کرتے ہیں اور اگر ہماری طرف منسوب کوئی حدیث کتاب خدا کے مطابق نہ ہو تو اسے پھینک دو"۔

امام صادقؑ کا ارشاد تھا کہ "ہماری حدیث ہمارے پدر بزرگوار اور ہمارے جد اکرمؐ کی حدیث ہے اور ہمارے جد اکرمؑ کی حدیث رسول اکرمؐ کی حدیث ہے جو بعینہ قول خدائے کریم ہے"۔ (آراء علماء المسلمین للسید الرضوی ص ۸۷)

فصل چہارم

نظریۂ عدالت صحابہ اور مذہب شیعہ

۱۔ شیعوں کی صحابہ دوستی

علامہ السید مرتضیٰ الرضوی کا بیان ہے کہ شیعہ ان تمام اصحاب پیغمبرؐ سے محبت رکھتے ہیں جنھوں نے نصرت دین کی راہ میں زحمتیں برداشت کی ہیں اور اپنے جان و مال سے جہاد کیا ہے۔

شیعوں پر یہ اتہام کہ وہ تمام صحابہ کرام کو کافر سمجھتے ہیں یا انھیں گالیاں دیتے ہیں ایک اتہام باطل ہے جس کی بنیاد غیبی اندازوں، تعصّب، گروہ بندی کے جذبات اور اوہام و اباطیل کے اتباع پر قائم ہے۔

۲۔ شیعوں کی نظر میں صحابہ

صحابیت ہر اس انسان کو شامل ہے جس نے حضور کی محفل میں حاضری دی ہے۔ آپ کی زیارت کی ہے یا آپ سے حدیث سنی ہے۔ صحابیت مومن، منافق، عادل، فاسق، نیک، بد سب کو شامل ہے اور یہ نہ کوئی ایسا تحفظ ہے جو انسان کو لباس عدالت سے آراستہ کردے اور نہ ایسی ضمانت ہے جو انسان کو پاکیزہ کردار بنا دے۔ صحابہ کا باہمی امتیاز ان کے اعمال کی بنیاد پر ہے اور اس کے لئے کتاب و سنت کے اشارات کافی ہیں۔ الگ سے استدلال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاریخوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ صحبت ایک عام عنوان ہے جس میں وہ عادل بھی شامل ہیں جنھوں نے خدا و رسول سے اپنے عہد کو سچ کر دکھایا ہے۔ عقیدہ کی راہ میں ثابت قدم رہے ہیں۔ ایمان ان کی

رگوں میں خون کی طرح دوڑتا رہا اور کمال اخلاص کی منزل پر فائز رہے۔ یقیناً یہ حضرات کمال کی بلند ترین منزل پر فائز ہیں اور مالک کائنات نے ان کی مدح کی ہے کہ: "یہ کفار کے مقابلہ میں شدید۔ مومنین کے حق میں مہربان۔ رکوع وسجود کرنے والے اور فضل و رضوانِ الٰہی کے طلبگار ہیں۔ ان کے چہروں پر سجدوں کے نشانات ہیں اور ان کی مثال توراۃ و انجیل میں اس زراعت جیسی ہے جس کے آثار نمودار ہوئے پھر استحکام پیدا ہوا اور پھر اپنے قدموں پر کھیتی کھڑی ہو گئی جو زراعت کرنے والے کو بھلی معلوم ہو اور کفار غصہ سے مر جائیں۔ اللہ نے ان میں سے صاحبانِ ایمان و عمل صالح سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے"۔

یہی وہ صاحبان ایمان ہیں "جو اللہ و رسول پر ایمان لائے اور پھر شک نہیں کیا۔ راہ خدا میں اپنے مال اور نفس سے جہاد کیا اور یہی اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں"۔

انھیں صاحبانِ کردار کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے کہ "ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ"۔

یہی شیعوں کے نزدیک حقیقی عادل اصحاب ہیں اور ان کے علاوہ جن کے اعمال میں انحراف پایا جاتا ہے۔ ان کے کردار پر آزادی کے ساتھ بحث کی جاسکتی ہے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے ترازو میں تولا جائے گا۔ شیعہ خدا و رسول کی مخالفت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتے ہیں اور ان تمام لوگوں سے برائت کرتے ہیں جنھوں نے اپنی قسموں کو سپر بنالیا تھا اور لوگوں کو راہِ خدا سے روک رہے تھے۔ اس طرح وہ نہ کتاب وسنت کے مخالف ہیں اور نہ سلف صالح کے راستے سے منحرف ہیں۔ ان کا کام نیک و بد میں امتیاز قائم کرنا ہے اور اسی اعتبار سے ہر ایک کے ساتھ سلوک کرنا ہے اور بس۔!

۳۔ بنیادی نقطۂ اختلاف

اہلسنت تمام صحابہ کی عدالت کے قائل ہیں جنھیں لغت نے صحابی بنایا ہے

ان کے بھی اور جنھیں اصطلاح نے صحابی قرار دیا ہے ان کے بھی ۔ شیعہ صرف ان کی عدالت کے قائل ہیں جو عادل تھے ۔ اس کے علاوہ صحابیت کو عدالت کی دلیل یا اسکی ضمانت نہیں قرار دیتے ہیں۔

۴۔ اصحاب پیغمبرؐ کے لئے شیعوں کی دعا

اصحاب پیغمبرؐ کے حق میں شیعہ جس دعا کو دہراتے رہتے ہیں وہ ان کے اخلاص و مودت کی بہترین مثال ہے۔ وہ پیغمبرؐ کے تمام اتباع کرنے والوں کے لئے بالعموم اور اصحاب کے لئے بالخصوص ان دعاؤں کو دہراتے رہتے ہیں جو اپنے ائمہ طاہرین کی تعلیمات سے حاصل کی ہیں۔

۵۔ شیعوں کی مشہور ترین دعا

صحابہ کرام کے حق میں شیعوں کی مشہور ترین دعا وہ دعا ہے جو امام زین العابدینؑ سے نقل کی گئی ہے اور صحیفہ سجادیہ میں موجود ہے۔

۶۔ شیعوں کی مذکورہ بالا دعا کی عبارت

"خدایا۔ وہ مرسلین کے پیرو اور غائبانہ طور پر اس وقت ان کی تصدیق کرنے والے جب دشمن تکذیب کر رہے ہوں اور حقائق ایمان کے ساتھ ان کی طرف ہر اس زمانے میں سبقت کرنے والے جب تو نے کوئی رسول بھیجا یا اہل زمانہ کے لئے کوئی رہنما مقرر کیا آدمؑ کے دور سے حضرت محمدؐ تک تمام ائمہؑ ہدایت اور قائدین اہل تقویٰ علیہم السلام تھے۔ خدایا! انھیں مغفرت ورضوان کی منزل میں یاد رکھنا خصوصاً وہ اصحاب محمدؐ جنھوں نے صحبت کا حق ادا کیا اور ان کی نصرت میں مصیبتوں کا سامنا کیا۔ ان کی خدمت میں فوراً حاضر ہوئے اور ان کی دعوت پر پہلی فرصت میں لبیک کہی۔ جب انھوں نے پیغام رسالت سنایا تو قبول کیا اور اظہار کلمۂ حق کے لئے اپنی جان اور اولاد سے بھی جدا ہو گئے۔ استحکام نبوت اور نصرت دین کے

لئے اپنے اہل خاندان سے بھی جنگ کی۔ ان کی محبت کے رشتہ سے منسلک رہے اور ان کی محبت میں اس تجارت کے امیدوار رہے جس میں کوئی تباہی نہیں ہے۔ قبائل نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا لیکن وہ نبیؐ کے دامن سے وابستہ رہے۔ قرابت داروں نے ان سے رشتے توڑ لئے لیکن وہ ان کی قرابت کے زیر سایہ رہے۔

خدایا۔ جو کچھ انھوں نے تیرے لئے اور تیری راہ میں چھوڑا ہے اسے فراموش نہ فرمانا۔ اپنی رضا سے انھیں راضی رکھنا۔ یہ تیرے رسولؐ کے ساتھ تیری طرف دعوت دینے والے تھے اور مخلوقات کو تیری طرف لانے والے تھے۔ ان کی اس سعی کو مشکور قرار دینا کہ انھوں نے تیری خاطر اپنی قوم کے وطن کو چھوڑ دیا اور وسعت عیش سے تنگی حیات کی طرف چلے گئے اور اعزاز دین کی خاطر بے شمار مظالم برداشت کئے۔

خدایا۔ نیکی میں ان کا اتباع کرنے والے جن کا قول یہ ہے کہ خدایا! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دینا جنھوں نے ایمان میں ہم پر سبقت کی ہے، انھیں بھی بہترین جزا عنایت فرمانا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اصحاب کا رخ اختیار کیا اور ان کے راستہ کو تلاش کیا اور انھیں کے نقش قدم پر چلے۔ نصرت حق میں کوئی شک انھیں منحرف نہیں کرسکا۔ اور اتباع آثار اصحاب و اقتدا، ہدایت حق میں کوئی شبہ ان کے دل میں پیدا نہیں ہو سکا۔ باہم شانہ بہ شانہ ایک دوسرے کے ہمدرد رہے۔ انھیں کے دین پر قائم اور انھیں کی ہدایت سے وابستہ رہے۔ اتفاق کرتے رہے اور کبھی کوئی اتہام نہیں رکھا۔

خدایا۔ ان تابعین پر آج سے لے کر قیامت رحمت نازل فرما اور ان کے ازواج و ذریت پر بھی بلکہ ان کی اطاعت کرنے والوں پر بھی ۔ وہ رحمت جو انھیں معصیت سے محفوظ رکھ سکے اور باغات جنت میں وسعت پیدا کر سکے۔ انھیں شیطان کے مکر سے بچائے رکھنا اور جو نیکی کرنا چاہیں اس پر ان کی مدد کرنا۔ شب و روز کے ہر وارد ہونے والے شر سے انھیں محفوظ رکھنا علاوہ اس کے جو پیغام خیر لے کر آئے۔ ان میں بہترین امید اور اپنی نعمتوں کی طمع کا اعتقاد بیدار کر دینا اور لوگوں کے اموال کی طرف

تہمت کی نظر سے نہ دیکھنے دینا تاکہ تیری طرف رغبت کریں۔ تجھ سے خوف زدہ رہیں۔ دنیا کی وسعتوں سے کنارہ کش رہیں۔ آخرت کے لئے عمل کو دوست رکھیں۔ موت کے بعد کی تیاری کریں۔ ان کی ہر مشکل کو آسان کر دے اس دن جب روح جسم سے جدا ہو جائے۔ فتنے جو خطرات پیش کرتے ہیں ان سے محفوظ رکھنا چاہیے وہ جہنم میں داخلہ کی شکل میں ہوں یا وہاں خلود کی شکل میں۔۔۔ اور مقام متقین کے امن سے سرفراز فرمانا۔"

(صحیفۂ سجادیہ ص ۴۳ تا ۴۵)

فصل پنجم

نظریۂ عدالتِ صحابہ میں فکر کی بنیادیں

ابن عباس معاویہ سے صحابہ کی تعریف کرتے ہیں

معاویہ نے ابن عباس سے مختلف امور کے بارے میں سوالات کیے۔ ان میں سے ایک سوال صحابہ سے متعلق تھا۔ ابن عباس نے فرمایا کہ معاویہ! خدائے عزوجل نے اپنے پیغمبرؐ کو ایسے مخصوص اصحاب عنایت فرمائے ہیں جنھوں نے پیغمبرؐ کو اپنے جان و مال پر بھی مقدم رکھا ہے اور ان کی راہ میں اپنی زندگیاں تک قربان کر دی ہیں۔ پروردگار نے اپنی کتاب میں ان کی یہ تعریف کی ہے کہ "یہ آپس میں ایک دوسرے پر مہربان ہیں۔ تم انھیں رکوع و سجود کے عالم میں فضل و رضوان الٰہی کے طلبگار دیکھو گے۔ ان کے چہروں پر سجدوں کے نشانات ہیں اور ان کی مثال توریت و انجیل میں اس زراعت کی ہے جس کی کونپلیں برآمد ہوں پھر استحکام پیدا ہو اور پھر ایسی کھیتی تیار ہو جائے جو کاشتکار کو بھلی معلوم ہو اور کفار اس کو دیکھ کر جل جائیں خدا نے ان میں سے صاحبان ایمان و عمل صالح سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔"

ان لوگوں نے آثار دین کو قائم کیا۔ مسلمانوں کو نصیحت کی یہاں تک کہ دین کے راستے آراستہ ہو گئے، اس کے اسباب قوی ہو گئے۔ خدا کی نعمتیں ظاہر ہو گئیں دین مستقر ہو گیا۔ اس کے معالم و آثار واضح ہو گئے۔ شرک ذلیل ہو گیا۔ رؤسائے شرک زائل ہو گئے۔ اس کے آثار محو ہو گئے۔ کلمۂ الٰہی بلند ہو گیا اور کلمۂ کفار پست ہو گیا۔

ان نفوس زکیہ اور ارواح طاہرہ پر خدا کی صلوات و رحمت و برکت ہو
کہ وہ زندگی میں اولیا خدا تھے اور مرنے کے بعد زندہ جاوید ہو گئے۔ یہ بندگان خدا
کو نصیحت کرنے والے تھے اور آخرت تک پہونچنے سے پہلے ہی اس کی طرف کوچ
کر گئے اور دنیا میں رہتے ہوئے گویا دنیا سے سفر کر گئے۔
معاویہ نے اس تقریر کو سُن کر بات کو کاٹ دیا اور کہا کہ ابن عباس کوئی
دوسری بات کرو۔ (مروج الذہب مسعودی ۳/ ۶۵-۶۶، ۴۲۵-۴۲۶)

حذیفہ بن الیمان کی شہادت اور وصیّت

جناب حذیفہ ۳۶ھ میں کوفہ میں بیمار تھے۔ جب انھیں قتل عثمان اور بیعت علیؑ
کی خبر ملی تو فرمایا کہ مجھے باہر لے چلو اور لوگوں کو نماز جماعت کے لئے جمع کرو۔ چنانچہ
لوگ جمع ہوئے اور آپ نے منبر پر جا کر حمد و ثنائے الٰہی، اور صلوات علی النبی و آلہ
کے بعد فرمایا۔ "ایہا الناس! لوگوں نے علیؑ کی بیعت کر لی ہے لٰہذا تمھارا فرض ہے
کہ تقوی الٰہی اختیار کرو اور علیؑ کی مدد کرو۔ خدا کی قسم وہ اول و آخر حق پر ہیں اور
پیغمبرؐ کے بعد تمام گذر جانے والوں اور قیامت تک آنے والوں سے بہتر ہیں۔ یہ
کہہ کر اپنے داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھ کر کہا کہ خدایا! تو گواہ رہنا کہ میں نے
علیؑ کی بیعت کر لی ہے۔
اس کے بعد اپنے فرزند صفوان اور سعد سے کہا کہ مجھے بھی لے چلو اور تم بھی
ہمیشہ انھیں کے ساتھ رہنا کہ اس کے بعد بہت سی جنگیں ہونے والی ہیں جن میں
بہت سے لوگ کام آجائیں گے لٰہذا تم کوشش کرنا کہ ان کی رکاب میں شہید ہو جاؤ۔
خدا کی قسم وہ حق پر ہیں اور ان کا مخالف باطل پر ہے"۔
اس کے سات دن کے بعد حذیفہ کا انتقال ہو گیا اور بعض روایات کی بنا پر
۴۰ دن کے بعد۔ فرزندوں نے باپ کی وصیت پر عمل کیا اور صفین کے میدان میں
شہید ہو گئے جبکہ علی کے ساتھ معاویہ کے لشکر سے جنگ کر رہے تھے۔ (مروج الذہب ۳/ ۶۵،

۶۶ــ ۴۲۵، ۴۲۶، ۷

زبیر اور حسنِ عاقبت

حضرت بنفس نفیس تنہا بغیر کسی اسلحہ کے میدان میں آئے اور آواز دی، زبیر ذرا باہر آؤ۔ زبیر اسلحہ سجائے باہر آئے تو عائشہ کو خبر دی گئی انھوں نے فرمایا کہ اسماء تمھارے ماتم میں بیٹھے۔ لوگوں نے بتایا کہ علیؑ خالی ہاتھ آئے ہیں تو مطمئن ہوگئیں۔ اس کے بعد دونوں میں باقاعدہ ملاقات ہوئی اور حضرت علیؑ نے فرمایا کہ زبیر! بڑے افسوس کی بات ہے تمھیں کون سی چیز میدان میں لے آئی ہے؟۔ زبیر نے کہا خونِ عثمان! فرمایا کہ خدا اسے قتل کرے جو ہم میں سے خونِ عثمان کا ذمہ دار ہو۔ کیا تمھیں وہ دن یاد ہے جب تم نے رسول اکرمؐ سے بنی بیاضہ میں ملاقات کی تھی اور حضرت سواری پر تھے تو آپ نے مجھے دیکھ کر خندہ فرمایا تھا اور میں بھی مسکرایا تھا اور تم نے پوچھا تھا کہ حضور اس متکبرانہ ہنسی کا راز کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا تھا کہ یہ تکبر نہیں ہے۔ زبیر کیا تم انھیں دوست رکھتے ہو؟ تو تم نے کہا تھا کہ خدا کی قسم میں انھیں دوست رکھتا ہوں تو حضرت نے تم سے فرمایا تھا کہ تم عنقریب ان سے جنگ کروگے اور تم ظالم ہوگے۔ زبیر نے کہا استغفر اللہ اگر یہ مجھے پہلے یاد آگیا ہوتا تو میں نکلتا ہی نہیں۔ فرمایا کہ اب واپس چلے جاؤ۔ زبیر نے کہا کہ اب کس طرح واپس جاؤں جب کہ فریقین میدان میں آچکے ہیں۔ یہ تو وہ عار و ننگ ہے جو قابلِ قبول نہیں ہے۔ فرمایا کہ زبیر واپس چلے جاؤ، قبل اس کے کہ عار اور نار دونوں جمع ہو جائیں۔ زبیر یہ کہتے ہوئے واپس ہوا "میں نے عار کو بھڑکتی ہوئی آگ پر مقدم کیا اور علیؑ نے مجھے ایسے امر کو یاد دلایا جس سے میں ناواقف نہیں تھا۔ اس میں دین و دنیا دونوں میں ننگ ہے۔ اس کے بعد زبیر میدان سے تو الگ ہوگیا لیکن عمرو بن جرموز نے اُس کا خاتمہ کر دیا۔

(مروج الذہب ۲/۴۰۰، ۴۰۲)

طلحہ اور حسنِ خاتمہ

زبیر کی واپسی کے بعد علیؑ نے طلحہ کو آواز دی اور فرمایا ابو محمد! تمھیں کون سی چیز نکال کر لے آئی ہے؟ کہا خونِ عثمان کا بدلہ! فرمایا خدا اسے قتل کرے جو ہم میں سے خونِ عثمان کا ذمہ دار ہو! طلحہ کیا تم نے یہ قول پیغمبر اسلامؐ سے نہیں سُنا ہے کہ خدایا علیؑ کے دوست کو دوست رکھنا اور ان کے دشمن سے دشمنی کرنا۔" تم نے تو سب سے پہلے میری بیعت کی تھی اور اب توڑ رہے ہو۔ پروردگار نے فرمایا ہے کہ "جو عہد کو توڑے گا اس کا مظلمہ اسی کی گردن پر ہوگا۔" طلحہ نے کہا استغفراللہ اور یہ کہہ کر واپس ہوگیا۔

حلیف کے ہاتھوں حلیف کا قتل

مروان بن الحکم بن العاص نے کہا کہ زبیر واپس چلا گیا اور طلحہ بھی جا رہا ہے۔ ہمارے لئے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہاں تیر ماریں یا وہاں۔ یہ کہہ کر ایک تیر سے طلحہ کا بھی خاتمہ کر دیا۔ طلحہ نے دم توڑتے ہوئے چند اشعار پڑھے۔

عبدالملک نے پیشانی کو زخمی کیا اور مروان بن الحکم نے تیر سے کام تمام کر دیا۔

قاتل و مقتول دونوں صحابی؟ ــــــ انا للہ

عمار یاسر صحابیٔ پیغمبرؐ کا انجام

عمار یاسر نے صفین کے موقع پر کہا کہ میں اس قوم کے چہرے دیکھ رہا ہوں جو اس وقت تک جنگ کرتی رہے گی کہ اہل باطل شبہ میں پڑ جائیں۔ خدا کی قسم اگر یہ لوگ ہمیں سعفات ہجر تک پیچھے ہٹا دیں گے جب بھی ہم حق پر رہیں گے اور یہ لوگ باطل پر رہیں گے۔ یہ کہہ کر عمار آگے بڑھے۔ جہاد کیا اور ایک مقام تک واپس آکر پانی مانگا۔ بنی شیبان کی ایک عورت نے کاسۂ شیر لا کر دیا۔ عمار نے تکبیر بلند کی اور فرمایا کہ آج نیزوں کی چھاؤں میں دوستوں سے ملاقات کروں گا۔ مخبر صادق نے سچ فرمایا تھا اور اسی دن کا وعدہ

فرمایا تھا اور یہ خبر دی تھی کہ تمھیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا اور تمھاری آخری غذا کاسۂ شیر ہوگا۔ یہ کہہ کر آواز بلند کی، ہے کوئی جو نیزوں کی چھاؤں میں جنت کا سفر کرے! خدا کی قسم ہم ان کے ساتھ تاویل قرآن پر اسی طرح جہاد کریں گے جس طرح کل تنزیل قرآن پر جہاد کیا ہے اور پھر رجز پڑھتے ہوئے میدان کا رخ کیا اور آخر میں ابوالمعادیہ اور ابن جون السکسکی نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ جس کے بعد لباس کی لوٹ میں اختلاف ہوا اور صحابی عبداللہ بن عمرو عاص نے اس کا فیصلہ فرمایا۔

معاویہ کی دلیل

معاویہ نے اس شرعی امام سے بغاوت کی جو قانونی اعتبار سے خلیفۃ المسلمین تھا اور اپنی دلیل خونِ عثمان کے قصاص کو قرار دیا۔ امامؑ نے فرمایا کہ تم اطاعت امام میں داخل ہو جاؤ۔ اس کے بعد قاتلوں کے خلاف مقدمہ دائر کرو میں انصاف سے فیصلہ کروں گا۔ لیکن معاویہ نے حلقۂ اطاعت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا اور قتل عثمان کو تختِ حکومت تک پہونچنے کا پُل بنا دیا اور اس منصوبہ میں بظاہر کامیاب بھی ہو گیا کہ مسلمانوں کا بادشاہ بن گیا۔

معاویہ اور قاتلانِ عثمان کی سزا

معاویہ مدینہ آکر خانۂ عثمان میں وارد ہوا تو عائشہ بنت عثمان نے کہا۔ ہائے میرے بابا اور یہ کہہ کر رونا شروع کر دیا۔ معاویہ نے کہا کہ دخترِ برادر! لوگوں نے ہماری اطاعت کر لی ہے اور ہم نے انھیں امان دے دی ہے اور ایسے حلم کا اظہار کیا ہے جس کے نیچے غضب چھپا ہوا ہے اور انھوں نے بھی ایسی اطاعت کا اظہار کیا ہے جس کے اندر کینہ پوشیدہ ہے۔ ہر انسان کے ساتھ اس کی تلوار ہے اور وہ اپنے انصار کی منزل پہچانتا ہے۔ اگر ہم نے ان کی بیعت توڑی ہے تو یہ بھی ایسا ہی برتاؤ کریں گے اور پھر نہیں معلوم کہ انجام کار کیا ہوگا۔ لہٰذا اگر تم امیر المومنین کی بنت عم بنی رہو تو زیادہ بہتر ہے کہ مسلمانوں کے سامنے منظر عام پر آؤ۔

(البیان والتبیین جاحظ ۳/ ۳۰۰، شیخ المضیرہ شیخ محمود ابوریہ ص ۱۸۲)

معاویہ کے بارے میں حسن بصری کی رائے

طبری کا بیان ہے کہ حسن بصری یہ کہا کرتے تھے کہ معاویہ میں چار باتیں تھیں کہ اگر ان میں سے ایک ہی ہوتی تو ہلاکت کے لئے کافی تھی:

۱۔ امت پر احمقوں کے ذریعہ قبضہ اور بلا شوریٰ کی حکومت جب کہ ابھی صحابہ اور صاحبانِ فضیلت زندہ موجود تھے۔

۲۔ اپنے شرابی اور جواری، ریشم پہننے والے اور طنبورہ بجانے والے بیٹے کی خلافت۔

۳۔ زیاد کو اپنا بھائی بنا لینا جب کہ رسول اکرمؐ کا ارشاد تھا کہ بچہ صاحب فراش کا ہوتا ہے اور زانی کا حصہ سنگسار ہے۔

۴۔ حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کا قتل۔ خدا اس کا برا کرے۔

(طبری حوادث ۵۱ھ، ابن اثیر ص ۲۰۲-۲۰۹، ابن عساکر ۲/۳۷۹، شیخ المضیرہ ص ۱۸۴)

معاویہ کے مفاخر کی آخری منزل

اس "صحابیٔ عادل" نے انھیں اعمال پر اکتفا نہیں کی بلکہ حضرت علیؑ، ولیِ خدا پر لعنت بھی کی تاکہ امت بھی اس کی اقتدا میں ان پر لعنت کرے۔ (العقد الفرید ابن عبد ربہ ۴/۲۶۶، شرح النہج ۱/۵۶، ۲/۵۸، ۳/۴، ۴/۵۶)

اس کے بعد رعایا کے لئے فرمان جاری کر دیا کہ لوگ حضرت علیؑ بن ابی طالب پر سب و شتم کریں۔ (صحیح مسلم ۲/۳۶۰۔ ترمذی ۵/۳۰۱، ۳۰۰۔ مستدرک ۳/۱۰۹۔ تاریخ دمشق ۱/۲۰۶، ۲۷۱، ۲۷۲۔ خصائص نسائی ص ۴۸۔ نظم درر السمطین زرندی حنفی ص ۱۰۷۔ کفایۃ الطالب ص ۸۴۔ مناقب خوارزمی ص ۵۹۔ اسد الغابہ ابن اثیر ۱/۱۳۴، ۴/۲۵، ۲۶۔ اصابہ ۲/۵۰۹۔ الغدیر ۱/۲۵۷، ۲/۳۰۰۔ العقد الفرید ۴/۲۹۔ وقعۃ صفین نصر بن مزاحم ص ۸۲-۹۲، شرح النہج ۱/۲۵۶، ۳۶۱۔ تذکرۃ الخواص

ص ۶۳ ۔ مراجعات و ملحق مراجعات)۔

عُمّال معاویہ اور سبِّ علیؑ

معاویہ کے عمّال اس کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے حضرت علیؑ پر سب وشتم کیا کرتے تھے۔ (طبری ۵/ ۱۶۷، ۱۶۸۔ کامل ۳/ ۴۱۳۔ مستدرک ۱/ ۳۸۵، ۲/ ۳۵۸۔ شرح النہج ۱/ ۳۵۶، ۳۶۱۔ تاریخ الخلفاء ص ۱۹۰۔ العقد الفرید ۴/ ۳۶۵۔ الغدیر ا/ ۲۶۴۔ ارشاد الساری شرح البخاری للقسطلانی ۴/ ۳۶۸۔ تحفۃ الباری شرح البخاری للانصاری بذیل ارشاد الساری۔ المراجعات ص ۲۱۸)۔

فصل ششم

صحابۂ عدول کی معرفت کا صحیح راستہ

موضوعی راستہ

مورخین اور اصحاب سیرت کی ایک بڑی جماعت نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے کہ اسلام و کفر کے پہلے عظیم معرکہ "بدر" کے موقع پر جب اسلام و کفر کے لشکر رسول اکرمؐ اور ابو جہل کی قیادت میں منظم اور صف آرا ہو گئے تو ابو جہل نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ "خدایا! جو تجھ سے دور تر ہو اور قطع رحم کا مرتکب ہو آج کے دن اسے مبتلائے مصائب قرار دے دینا"۔ اور ٹھیک اسی وقت پیغمبرؐ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے کہ "خدایا! اگر یہ میری جماعت ہلاک ہو گئی تو روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہو گا، لہٰذا اس وعدہ کو پورا فرما جو تو نے مجھ سے کیا ہے"۔

دعاؤں کا تجزیہ

دونوں کے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے ہیں۔

دونوں اَللّٰھُمَّ کہہ رہے ہیں۔

دونوں حق کا نعرہ لگا رہے ہیں۔

ابو جہل کا خیال ہے کہ خدا کے لئے قریب تر اور واقعاً صلۂ رحم کرنے والا وہ ہے۔

اور پیغمبرؐ اس امر پر زور دے رہے ہیں کہ حق کی محافظ جماعت ان کے ساتھ ہے جو خالق و مخلوق کے تعلقات کا نمونہ ہے اور ان کے اور خدا کے درمیان کوئی عہد

و پیمان پایا جاتا ہے۔

لمحۂ فکریہ ؟

جب دونوں حق پر ہیں تو جنگ کیوں ہو رہی ہے ؟ اور جب دونوں خدا کے راستہ پر ہیں تو یہ اختلاف جنگ و جدال تک کس طرح پہونچ گیا ہے خصوصاً جب کہ خدا اور حق کا راستہ ایک ہے اور اسی کا نام صراط مستقیم ہے۔

احتمالات

آزاد اور بنیادی فکر کے اعتبار سے اس مقام پر تین احتمالات یا تصورات پائے جاتے ہیں :

۱۔ دونوں واقعاً حق پر ہوں۔ لیکن یہ ناممکن ہے۔ اس لئے کہ حق کا راستہ ایک ہی ہوتا ہے، اور وہی صراط مستقیم ہوتا ہے اور اسی کی بنیاد پر ایک کو دوسرے کا تابع ہونا چاہیئے۔

۲۔ ایک حق پر ہو اور ایک باطل پر۔ یہ احتمال موجود ہے۔

۳۔ دونوں باطل پر ہوں۔ یہ ناممکن ہے۔ اس لئے کہ ایک فریق وہ پیغمبرؐ ہے جو صاحبِ برہان بھی ہے اور صاحبِ اعجاز بھی۔

واقعی حل !

حقیقتِ واقعی کو دریافت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ :

۱۔ حق کی معرفت ہو۔

۲۔ باطل معلوم ہو۔

۳۔ حق کے وسائل سے صاحبِ حق کی معرفت ہو۔

۴۔ حق کے معیار پر اہل باطل کی شناخت حاصل ہو۔

راہ حل؟

۱۔ حق اور حق کا ایک مکمل نظام موجود ہو اور اسی کی بنیاد پر حق و باطل کا فیصلہ کیا جائے جس طرح کہ اسلام ایک دین حق ہے اور اس کی "کتاب خدا میں وارد نصوص" اور "قول و فعل و تقریر پیغمبرؐ کی شکل میں سنت" ایک مکمل حقوقی نظام ہے جس میں کسی طرف سے باطل کے داخل ہونے کا امکان نہیں ہے کہ یہ خدا کا بنایا ہوا ہے اور اس کی وحی کے ذریعہ نازل ہونے والا نظام ہے۔

۲۔ وہ عقل ہو جو اس مکمل نظام کا اندازہ کر سکے۔

۳۔ آزادئ فکر اور حقیقت پسندی کا جذبہ ہو جہاں مسلمان شریعت کے حدود میں رہنا چاہتا ہو اور اسی غرض کا اثبات چاہتا ہو جو نصوص شرعیہ کی واقعی غرض ہے اور اسی روح کا تحقق چاہتا ہو جو اسلام کے حقوقی نظام کی روح ہے۔

۴۔ نبی یا قانونی امام کی شکل میں ایک شخص موجود ہو جس کے سامنے عقل کے تمام جائزوں کا ماحصل پیش کیا جا سکے اور اس کے بعد وہ فیصلہ کرے کہ فکری اختلافات کی منزل میں حق کیا ہے اور باطل کیا ہے تاکہ تمام طاقتیں منظم ہو سکیں اور تمام آزادی فکر کو راہنمائی حاصل ہو سکے اور حق کی طلبگار جماعت کے پاس ایک واقعی راہنما موجود ہو۔ ظاہر ہے کہ نبوت کے دور میں ایک بلند ترین انسان خود پیغمبر اسلامؐ ہے اور عصر نبوت کے خاتمہ کے بعد وہ ولی اور امام صالح ہے جس کا تقرر قوانین شریعت کے مطابق ہوا ہے۔

یہی شخصیت حق و باطل کے درمیان واقعی میزان ہے اور اسی کی بنیاد پر پیغمبر اسلامؐ کی محبت اور اطاعت کرنے والوں اور ان کے ارشادات پر عمل کرنے والوں کو اہل حقیقت کہا جاتا ہے اور ان سے انحراف کر کے اغیار سے محبت کرنے والوں کو اہل باطل کہا جاتا ہے چاہے وہ قرآن کریم کی تلاوت کرنے والے اور حفظ کرنے والے ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ لوگ نماز، روزہ کرنے اور مسجدیں تعمیر کرنے کے

بعد بھی اہل باطل ہی ہیں۔ اس لئے کہ ولایت اور موالات ہی حق و باطل کے امتیاز کے لئے ہر دور میں ایک مستقل میزان ہے۔

راہ حل کے موانع

۱۔ خواہشات۔ جن کا تقاضا یہ ہے کہ امور کا حل اور نصوص کی تفسیر نفسیاتی تقاضوں کے مطابق ہو۔

۲۔ اندھی تقلید۔ جہاں انسان ایک مدت دراز تک مخصوص خیالات کا حامل رہتا ہے اور اس میں کسی طرح کی تبدیلی اور اصلاح پر راضی نہیں ہوتا ہے۔

۳۔ خودرائی۔ جہاں ہر انسان کا عقیدہ یہ ہو کہ اس کی رائے ہی حق مبین ہے اور اس کا مخالف انصار شیاطین میں ہے اور اس سے مقابلہ کرنا ضروری ہے۔

۴۔ شرعی ولایت کو لغو قرار دے کر اس کی جگہ پر غیر شرعی ولایت کو قائم کر دینا تاکہ مسلمان ولایت الٰہیہ کے بجائے غلبہ یا کسی اور عنوان کی اطاعت شروع کر دے۔

عدالت صحابہ کے بارے میں قول فیصل

اہلسنت و اہل تشیع کے نظریات کی تلخیص اور یاد دہانی

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ صحابیت لغوی اور اصطلاحی دونوں اعتبارات سے ان تمام لوگوں کو شامل ہے جنھوں نے رسول اکرمؐ سے ملاقات کی ہے اور آپ پر ایمان لائے ہیں یا ایمان کا مظاہرہ کیا ہے اور اسی ایمان یا مظاہرہ ایمان پر دنیا سے گذر گئے ہیں۔

اہلسنت اسی مفہوم عام کے صحابہ کے بارے میں عدالت کا عقیدہ رکھتے ہیں اور سب کو بلا استثناء عادل قرار دیتے ہیں اور ہم تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ یہ عقیدہ قول و فعل و تقریر رسول اکرمؐ۔ بیانات قرآن حکیم، غرض اسلام۔ عقل و منطق۔ وقائع تاریخ اور روح اسلام سب کے خلاف ہے اور اس کی بیشمار مثالیں پائی جاتی ہیں۔

ان بیانات سے یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ صحابہ کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ صادقین۔ جو باجماع مسلمین عادل ہیں اور ان کی عدالت کے بارے میں کسی فرقہ کو اختلاف نہیں ہے۔

۲۔ غیر صادقین۔ جن کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اہلسنت انھیں عادل قرار دیتے ہیں اور ان کی نظر میں عدالت کے اعتبار سے اول المسلمین اور اس بچہ میں کوئی فرق نہیں ہے جس نے پیدا ہو کر رسول اکرمؐ کو دیکھ لیا ہے یا آپ نے اسے دیکھ لیا ہے۔ یہ سب کے سب عادل ہیں اور کسی ایک کے بارے میں بھی دور یا قریب سے لب کشائی۔ تنقید یا تنقیص حرام ہے اور اس کا مرتکب زندیق ہے جس کے ساتھ کھانا پینا حرام ہے اور اس کی نماز جنازہ بھی جائز نہیں ہے۔ جب کہ شیعوں کا نظریہ یہ ہے کہ عادل وہی ہیں جنھیں خدا اور رسولؐ نے عادل

قرار دیا ہے اور یہی وہ آزاد اور غیر جانبدار حقیقت ہے جسے ہر صاحب ایمان کو اختیار کرنا چاہیئے۔ شریعت اسلام نے اس حقیقت کے انکشاف کے وسائل بھی بیان کر دیے ہیں اور اس راہ میں مسلمان کی کوشش کی رہنمائی بھی کی ہے اور ایسے عقلی اسباب بھی عنایت کر دیے ہیں جن سے مسئلہ کو حل کیا جا سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ انسان خواہشات اور تعصبات سے بالاتر ہو جائے اور صرف حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہے اور یہ سوچے کہ جب عام مسلمانوں کے عقیدہ میں سید المرسلین خطا کار ہو سکتا ہے تو جس بچہ نے رسول اکرم کو دیکھ لیا ہے یا آپ نے اسے دیکھ لیا ہے اسے یہ ضمانت کہاں سے حاصل ہو گئی ہے کہ وہ غلط بیانی نہیں کر سکتا ہے۔ وہ کونسا حکم شرعی ہے جس نے عقل و منطق اور تحقیق و تجسس کے تمام راستے بند کر دیے ہیں اور انسان کو بالکل اندھا بنا دیا ہے جب کہ صحابہ کے درمیان صحابہ ہی کو قتل کرنے والے۔ چوری کرنے والے۔ جھوٹ بولنے والے۔ زنا کرنے والے افراد موجود ہیں اور بہت سے افراد کا فیصلہ رسول اکرمؐ کے انتقال کے بعد پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

ایسے حالات میں ہم حقائق کی جستجو کس طرح کریں؟ انصاف کس طرح قائم کیا جائے؟ امت ماضی کے تجربات سے کس طرح فائدے اٹھائے کہ آئندہ ایسی غلطی نہ کرے اور ہمیشہ راہ حق و صواب پر چلنے کی کوشش کرے؟

یہی وجہ ہے کہ شیعہ حضرات صرف صادقین کو عادل تسلیم کرتے ہیں اور انھیں کے لئے ہر نماز میں دعا کرتے ہیں اور باقی صحابہ کے بارے میں اس معیار کے قائل ہیں کہ اگر ان کا دین اور عمل انھیں عادل قرار دیتا ہے تو خیر ورنہ نہیں۔!

شیعوں کی نظر میں اہلسنت کا عقیدۂ عدالت صحابہ ایک سیاسی نظریہ ہے جو طلقاء کی حکومت کے زیر اثر اور ان کے اقتدار کو مستحکم بنانے کے لئے ایجاد ہوا ہے۔ اس کے اصول بھی انھیں لوگوں کے مرتب کئے ہوئے ہیں اور اس کی اشاعت بھی انھیں کے ذرائع ابلاغ نے کی ہے۔ اس کے بعد دوسری نسلوں نے اس نظریہ کو تقلیدی بنیاد پر مختلف اسباب و عوامل و محرکات کے تحت قبول کر لیا ہے۔

شیعوں کا خیال یہ بھی ہے کہ عام صحابہ پر تنقید کرنے والوں کے بارے میں فقہاء اسلام نے جو سزائیں طے کی ہیں ان کی کوئی شرعی بنیاد نہیں ہے اور نہ کوئی فقیہ کسی مسلمان کو بغیر سند شرعی کے سزا دے سکتا ہے۔ یہ سزا ظالمانہ سزا ہے جو ہر شرعی معیار سے غلط ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ امت میں تفرقہ اندازی ثابت ہو گئی ہے اور ماضی کے واقعات سے عبرت حاصل کرنے کے راستے بند ہو گئے ہیں۔ اب حالات کے انجام پر غور کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے کہ یہ انجام کس طرح وقوع پذیر ہوا ہے اور اس کا آخری اثر یہ ہوا ہے کہ مستقبل سازی کے تمام راستے بند ہو گئے ہیں اور امت کو نور اور بصیرت کے راستہ پر متحد کرنے کا امکان تقریباً ختم ہو گیا ہے۔

خلط اوراق

اگر صحابہ سب کے سب عادل ہوتے تو یہ فتنے نہ ہوتے۔

صحابہ سب کے سب عادل ہوتے تو امت میں یہ افتراق نہ ہوتا۔

صحابہ سب کے سب عادل ہوتے تو صحابی، صحابی کا قاتل نہ ہوتا۔ اس لئے کہ صحابی نفس محترم کا قاتل نہیں ہوتا ہے۔

صحابہ سب کے سب عادل ہوتے تو امر امت کو نااہل کے حوالے نہ کر دیتے اور خلافت کو مال غنیمت سمجھ کر غلبہ حاصل کر لینے کا حق نہ سمجھ لیتے۔

عدالت صحابہ کا قول درحقیقت خلط اوراق پر مبنی ہے اور اس کا مقصد حقائق کی پردہ پوشی یا عقول پر پابندی عائد کرنا ہے ورنہ واضح سی بات ہے کہ آپس میں جنگ کرنے والے سب حق بجانب نہیں ہو سکتے ہیں۔ حق قتل، فتنہ، افتراق، نااہل حکومت کی ضد ہے اور ضدین کا اجتماع ممکن نہیں ہے۔

آج یہ کہنا کہ یہ امت گذر چکی ہے اور اس کے حالات سے چشم پوشی کر کے نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہیئے اور نہ صاحب حق کی معرفت ضروری ہے کہ جس کے ذریعہ حق کا اتباع کیا جائے اور نہ اہل باطل کی شناخت ضروری ہے جس کے بعد باطل سے اجتناب

کیا جائے۔ درحقیقت ایسا اہمال ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ماضی کے تجربات سے فائدہ نہ اٹھایا جائے اور زندگی کو صفر سے شروع کیا جائے اور یہی خلط اوراق ہے جہاں ہزار سالہ تجربات کے ورق کو ورق سادہ سے مخلوط کر دیا گیا ہے اور امت کو اس کے ماضی سے محروم کر دیا گیا ہے۔ صرف اس لئے کہ کسی کی حکومت کی طرفداری کی جائے یا کسی شخص کے کردار کی پردہ پوشی کی جائے۔ بھلا ہمیں اس خلط اوراق اور پردہ پوشی سے کیا ملنے والا ہے اور ہماری مصلحت کیا ہے کہ ہم ہزار و چہار صد سالہ تجربات کو نظر انداز کر دیں اور یہ سارا کام دین حنیف کے نام پر کریں اور اس کا مقصد مصلحت اسلام کی تنفیذ کو قرار دیں۔

شرعی انکشاف کا ایک واقعہ

ایک غضبناک جماعت اٹھی اور طویل رد و بدل کے بعد اس نے خلیفہ ثالث عثمان بن عفان کا خاتمہ کر دیا۔ اس کا دعوی یہ تھا کہ عثمان سیرت شیخین سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد اہل مدینہ نے حضرت علیؑ کی بیعت کر لی اور دیگر شہروں نے بھی مدینہ کا اتباع کیا۔ صرف اہل شام اور ان کے حاکم معاویہ بن ابی سفیان نے بغاوت کی اور یہ کہا کہ ہمیں عثمان کے قاتلوں سے بدلہ لینا ہے۔ خلیفہ شرعی نے فرمایا کہ تم میری اطاعت قبول کر لو اس کے بعد میں سب کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دوں گا۔ لیکن معاویہ نے اس مطالبہ کو ٹھکرا دیا اور اپنی حکومت میں پناہ لے لی اور پھر امام کی حکومت کے خلاف سازش شروع کر دی اور لوگوں کو ان کے خلاف جنگ پر اکسانے لگا تاکہ آپ کی حکومت کا استقرار متزلزل ہو جائے اور امت مختلف حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ اس کا بہترین ذریعہ اس نے اپنی حکومت کے اموال مسلمین کو قرار دیا اور ان اموال کو قانون شریعت کے خلاف بے دریغ خرچ کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ واقعاً امت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور خون کا سیلاب بہنے لگا۔ اس کے بعد امام کی بھی شہادت واقع ہو گئی اور معاویہ نے بزور شمشیر امور امت پر قبضہ کر لیا جبکہ امت میں ابھی صحابہ سابقین بھی موجود تھے جنھوں نے اسلام کی راہ میں اس سے اور اس کے باپ سے جہاد کیا تھا حکومت پانے کے بعد معاویہ نے عثمان اور ان کے قاتلوں کو بھی نظر انداز کر دیا اور یہ وصیت کر دی کہ

حکومت میرے بعد میرے بیٹے یزید کے لئے ہوگی جو شرابی، نشہ باز۔ بندر نچانے والا اور ناچ گانے کا دلدادہ تھا (حسن بصری) اور اس طرح اسلامی حکومت ایک مال غنیمت بن گئی جس پر ہر صاحب تغلب قبضہ کرنے لگا اور چونکہ ہر پرانی چیز ایک اہمیت پیدا کر لیتی ہے لہٰذا غلبہ کو ایک شرعی وسیلہ کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

عدالت صحابہ؟

مشکل یہ ہے کہ جنھوں نے حضرت علیؑ کے ساتھ قیام کیا وہ بھی صحابہ تھے اور جنھوں نے معاویہ کا ساتھ دیا وہ بھی صحابہ تھے اور صحابہ سب عادل اور جنتی ہوتے ہیں اور کوئی جہنم میں نہیں جا سکتا ہے۔ سب مجتہد ہیں اور سب سے خطائے اجتہادی ہو سکتی ہے اور کسی ایک پر بھی تنقید یا تنقیص کرنے والا زندیق اور کافر ہے اور اس کا بائیکاٹ واجب اور نماز جنازہ حرام ہے۔

بیشک آپ ان سب کی تعریف کریں کہ یہ سب قابل تعریف ہیں لیکن آپ نے کسی ایک پر بھی تنقید کر دی تو آپ کافر ہو جائیں گے۔ یہی وہ اندھی تقلید ہے جس نے سنت کی شکل اختیار کر لی ہے اور پھر اس سنت کو ارادۂ الٰہیہ اور ارادۂ رسول کا درجہ دے دیا گیا ہے۔

منطقی صورت حال

جذبات و تعصب سے بلند ہو کر علمی اعتبار سے بحث کی جائے تو تین احتمالات سامنے آتے ہیں:

۱۔ فریقین حق پر ہوں (اصحاب علیؑ بھی اور اصحاب معاویہ بھی) ظاہر ہے کہ یہ بات ناممکن ہے اس لئے کہ حق کا راستہ ہمیشہ ایک ہوتا ہے۔

۲۔ دونوں باطل پر ہوں ــــ یہ بھی ناممکن ہے اس لئے کہ علیؑ حق کے ساتھ ہیں اور حق علیؑ کے ساتھ ہے اور حق ان کے ساتھ چلتا ہے۔ (رسول اکرمؐ)

۳۔ ایک حق پر ہو اور ایک باطل پر۔؟

سوال ؟

اگر سب حق پر تھے تو یہ جنگ و جدل کیسی ؟ یہ اختلاف کیسا ؟ اور اگر اختلاف تھا تو یہ معرکہ آرائی کیسی ؟ کیا مسئلہ کا کوئی مسالمت آمیز حل نہیں تھا کہ اس طرح ہزاروں مسلمانوں کا خون ناحق نہ بہتا ؟

نتیجہ !

اس کا مطلب یہ ہے کہ یقیناً ایک حق پر تھا اور ایک باطل پر !۔ اور سارے صحابہ کو عادل قرار دینا ایک سادہ لوحی یا کھلی ہوئی غفلت ہے ۔ کوئی قتل یقینی مجوز کے بغیر جائز نہیں ہے اور قتل عمد ایک عظیم جرم ہے ۔ پھر امت میں تفرقہ پیدا کرنا اور قانونی خلیفہ کے خلاف خروج کرنا خود بھی ایک جرم ہے ۔ اوہام و مصالح پرستی اور خواہشات کی بنیاد پر قتل کرنے والا یقیناً عادل نہیں ہو سکتا ہے ۔ وہ خطا بھی کر سکتا ہے ۔ جھوٹ بھی بول سکتا ہے اور منحرف بھی ہو سکتا ہے اور صحابیت ان میں سے کسی کام سے بھی نہیں روک سکتی ہے ۔ صحابیت کوئی نبوت نہیں ہے جو عصمت کی ضمانت دے سکے ۔

مذکورہ واقعہ میں حق و باطل کے ذرائع

۱۔ ایک حق اور حقوقی نظام کا وجود جو تمام اعمال اور ارادوں پر حاوی ہو اور سب کی صحیح نوعیت کا فیصلہ کر سکے ۔

ظاہر ہے کہ ایسا نظام اسلام کی شکل میں موجود ہے جس میں کتاب خدا بھی ہے اور قول و فعل و تقریر رسول اکرمؐ بھی ۔ اور یہ ایک ایسا مکمل نظام ہے جس میں کسی طرف سے باطل کا گذر نہیں ہے اور یہ وہ دین الٰہی ہے جسے پروردگار نے اپنے بندوں کے لئے پسند کیا ہے اور خود ہی اسے مرتب کیا ہے ۔

۲۔ ایک شرعی قائد کا وجود جو ہر ایک کی بات سُنے اور اختلاف رائے میں اس کا حکم

قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہو۔ وہ تمام حریت فکر کی راہنمائی کرے اور تمام طاقتوں کو منظم کرکے جماعت کو حق کے راستے پر لگادے۔ اس کی حیثیت ولی امر مسلمین کی ہے جو حیثیت سرکار دو عالمؐ کی تھی اور آپ کے بعد بنص رسولؐ حضرت علیؑ کی تھی جن کے بارے میں خود حضورؐ نے فرمایا تھا کہ "یہ میرے بعد تمھارے ولی ہیں۔ یہ ہر مومن اور مومنہ کے ولی ہیں' جس کا میں مولا ہوں اس کے یہ علیؑ بھی مولا ہیں۔ خدایا جو انھیں دوست رکھے اس سے محبت کرنا اور جو ان سے دشمنی کرے اس سے دشمنی رکھنا۔"

یہ وہ حقیقت ہے جس کے انکار کی جرأت دنیا کے کسی انسان میں نہیں ہے اور خود معاویہ بھی اس کا انکار نہیں کرسکتا ہے جس کے دلائل بعد میں بیان کئے جائیں گے۔

۳۔ فکر میں حقیقت پسندی اور آزادی کا جذبہ۔ تاکہ انسان پوری غیر جانبداری کے ساتھ حقائق کی جستجو کرسکے اور اس کا ہدف وہی ہو جو خدائی ہدف ہے۔

۴۔ عقل جو پورے حقوقی نظام کا جائزہ لے کر اسے حقائق پر منطبق کرے اور پھر نتیجہ کو ولی امر کے حوالے کردے۔

موالات کلید عدالت

حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ جو صحیح قول کی بنا پر سب سے پہلے اسلام کا اعلان کرنے والے ہیں۔ اللہ کے ولی، پیغمبرؐ کے بھائی اور حضرات حسنینؑ کے والد تھے۔ یہ حضرت زہراؑ کے شوہر اور شرک کے مقابلہ میں اسلام کے تمام معرکوں کے قائد تھے۔ انھیں اسلام کے سب سے بڑے مجاہد ہونے اور دشمنان اسلام کے قتل کرنے کا شرف بھی حاصل ہے۔ وہ بنص رسولؐ صدیق اکبر اور فاروق اعظم بھی تھے۔ وہ اس ابوطالب کے فرزند تھے جس نے ہجرت سے پہلے رسول اکرمؐ کی حمایت وحفاظت کی تھی اور اس وقت ہاشمی گھرانے کے ذمہ دار تھے جب تمام قبائل عرب نے تین سال کا محاصرہ کر رکھا تھا اور سب شعب ابیطالب میں زندگی گذار رہے تھے اور ان تمام مصائب کا حل یہ تھا کہ رسول اکرمؐ کو کفار کے حوالے کردیں یا انھیں کفار قریش کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں۔

لیکن معاویہ طلیق بن طلیق ۔ ابوسفیان کا بیٹا جس نے تمام معرکوں میں اسلام کے خلاف لشکر کفر کی قیادت کی ہے اور برابر قتلِ پیغمبرؐ کے لئے کوشاں رہا ہے۔ آپ کے خلاف جنگ کا بازار گرم کیا ہے اور لشکر سازی کا عمل انجام دیا ہے۔

اس ہندہ کا بیٹا جس نے جناب حمزہ کے ساتھ غداری کا منصوبہ تیار کیا تھا اور پھر شہادت کے بعد ان کا جگر چبانے کی کوشش کی تھی اور جسم اقدس کا مثلہ کیا تھا۔ اس نے اور اس کے باپ نے اسلام سے ہر طرح مقابلہ کیا یہاں تک کہ جب حضور فاتحانہ انداز سے مکہ میں داخل ہوئے اور سب چاروں طرف سے گھر گئے اور بھاگنے کا کوئی راستہ نہ رہ گیا تو اسلام کا اعلان کر دیا۔

عادل صحابہ

حقیقت امر یہ ہے کہ جن لوگوں نے حضرت علیؑ کے ساتھ قیام کیا اور ان سے موالات کا اظہار کیا وہی صحابہ عادل تھے اور یہ صحابہ رسولؐ کی ایک بڑی جماعت پر مشتمل تھے۔ ان سے اختلاف کرنے والے طلحہ و زبیر اپنی بغاوت پر نادم تھے اور بظاہر ان کی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اسلام کے شرف کے لئے یہ کافی ہے کہ معاویہ کے ساتھ دو انصار کے علاوہ کوئی تیسرا نہ تھا اور اگر حضرت ابوبکر و عمر زندہ ہوتے تو وہ بھی اس معرکہ میں حضرت علیؑ ہی کے ساتھ ہوتے اس لئے کہ میدانِ غدیر میں واضح لفظوں میں اعلان کر چکے تھے کہ "آپ میرے اور تمام صاحبانِ ایمان کے مولا ہیں۔"

معاویہ کے ساتھ قیام کرنے والے ہی دراصل محل بحث ہیں اور یہ صحابہ کی بہت مختصر جماعت ہے اور انھیں کے لئے عدالت صحابہ کا قانون ایجاد کیا گیا ہے تاکہ واقعات کی تاویل کی جاسکے اور انحراف کو شریعت کا درجہ دیا جاسکے۔

اہلِ شام و عراق کی غفلت کے نمونے

- مسعودی کا بیان ہے کہ اہل شام میں ایک صاحب عقل و نظر سے پوچھا گیا کہ آخر

یہ ابن ابی طالب کون ہے جس پر منبروں سے لعنت کی جاتی ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ میرے خیال میں عرب کے کسی ڈاکو کا نام ہے۔

● جاحظ نے نقل کیا ہے کہ میں نے عوام میں ایک مرد حاجی کو کہتے سنا کہ اس نے ایک دوست کو خبر دی کہ ایک شخص نے رسول اکرمؐ پر صلوات پڑھتے سُن کر پوچھا کہ کیا پروردگار کا نام محمد ہی ہے۔

● ثمامہ بن اشرس کا بیان ہے کہ میں بازار بغداد سے گذر رہا تھا کہ میں نے ایک شخص کے گرد مجمع دیکھا تو اپنے خچر سے اتر پڑا اور دریافت کیا کہ یہ اجتماع کیسا ہے؟ اور مجمع میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ شخص سرمہ کے فضائل بیان کر رہا ہے کہ یہ آنکھ کے ہر مرض کا علاج ہے اور میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس کی دونوں آنکھیں عیب دار ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ اگر آپ کے سُرمہ میں یہ سارے کمالات پائے جاتے ہیں تو آپ کی آنکھ کا یہ حال کیوں ہے؟ اُس نے کہا کہ تو جاہل ہے۔ میری آنکھ کا یہ حال یہاں نہیں ہوا ہے۔ یہ مصر میں خراب ہوئی تھیں! اور سب نے اس کی تصدیق کر دی اور اس شخص کا بچ کر نکلنا مشکل ہو گیا۔

● ثمامہ ہی کا بیان ہے کہ میرے برادران اہل علم میں ایک شخص نے بیان کیا کہ ہم ایک مقام پر ابوبکر، عمر، علیؑ، معاویہ کے بارے میں بحث کر رہے تھے اور علمی دلائل پیش کر رہے تھے کہ ایک مرد عامی نے اس گفتگو کو سُن لیا جو سب سے بڑا عاقل اور صاحب لحیہ طویلہ تھا اور کہنے لگا کب تک یہ لمبی بحثیں ہوتی رہیں گی؟ ۔ میں نے کہا کہ پھر آپ ہی کچھ فیصلہ فرمائیں؟

اس نے کہا کہ کس کے بارے میں دریافت کرنا ہے۔؟

میں نے کہا کہ علیؑ کے بارے میں کیا خیال ہے۔؟

فرمایا کہ کیا فاطمہؑ کے باپ نہیں ہیں۔!

میں نے کہا کہ پھر فاطمہؑ کون تھیں۔؟

فرمایا کہ رسول اکرمؐ کی زوجہ اور معاویہ کی بہن عائشہ کی بیٹی۔!

میں نے پوچھا کہ پھر علیؑ کا انجام کیا ہوا۔؟

فرمایا کہ جنگ حنین میں پیغمبرؐ کے ساتھ قتل ہو گئے۔! (مروج الذہب مسعودی ۳/۳۹-۴۱)

معاویہ کے پیروکار

اطاعت معاویہ میں ان کا آخری انجام یہ ہو گیا کہ معاویہ نے صفین کے لئے نکلتے وقت جمعہ کی نماز بدھ کے دن پڑھادی اور تمام لوگوں نے جنگ کے موقع پر اپنے سر معاویہ کے حوالے کر دئے اور عمرو عاص کے اس فتنہ کو بخوشی تسلیم کر لیا کہ عمار بن یاسر کے قاتل علیؑ ہیں اس لئے کہ وہی انھیں میدان جنگ میں لے آئے ہیں اور اس کے بعد یہ اطاعت اس منزل تک پہونچ گئی کہ معاویہ کے حکم سے سبِّ علیؑ کو ایک سنت بنا لیا گیا جس پر بچے جوان ہوئے اور جوان بڈھے ہو گئے۔ (مروج الذہب ۳۹/۲)

یہ ہے عادل صحابہ کرام کے بیان حقائق کا انداز۔ کہ عمار بن یاسر کے قاتل علیؑ بن ابی طالبؑ ہیں۔

اور یہ ہے عوام الناس کو امور دین سے باخبر کرنے اور انھیں ان صحابہ رسولؐ کے حالات سے آگاہ کرنے کا طریقہ۔ جن کے کاندھوں پر اسلام کا بوجھ رکھا گیا ہے اور جن کے دم قدم سے اسلام قائم ہوا ہے۔

باب دوم

نظریۂ عدالت صحابہ کی تاریخی جڑیں

فصل اول

نظریۂ عدالت صحابہ کی تاریخی جڑیں

قبائلی جڑ۔ عدم جمع نبوت وخلافت

ا۔ قریش کے قبائل

قریش پچیس قبائل کے مجموعہ کا نام ہے۔ (مروج الذہب مسعودی ۲/۲۹۱)
شرعی نصوص کی بنا پر ان تمام قبائل میں سب سے افضل بنو ہاشم بن عبد مناف ہیں۔ اس کے بعد بنو عبد المطلب بن عبد مناف اور بنو الحارث بن عبد مناف اور بنو امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف اور بنو نوفل بن عبد مناف کہ یہ سب سادات قریش کہے جاتے ہیں۔

قریش میں سب سے پہلے تحفظات انھیں قبائل کو حاصل ہوئے ہیں اور اسی بنیاد پر یہ قبائل ارض حرم سے منتشر ہو گئے۔ ہاشم نے ملوک شام سے عہد و پیمان کیا۔ عبد شمس نے نجاشی سے معاہدہ کیا۔ نوفل نے اکاسرہ سے معاہدہ کیا۔ عبد المطلب نے حمیر سے عہد کیا اور اس طرح قریش اطراف عالم میں پھیل گئے۔ ان تمام قبائل کو ان کے فخر و سیادت کی بنا پر "اقداح نضار" کہا جاتا تھا۔ (طبقات ۱/۷۵)

ب۔ سیاسی صورت حال

قریش کے تمام قبائل نے مل کر ایک سیاسی نظام قائم کر لیا تھا جس کی بنیاد مناصب کی تقسیم پر تھی اور مناصب کی بنیاد قیادت، لواء، ندوہ۔ سقایت، رفادہ اور سفارت پر تھی اور ہر قبیلہ کو ان میں سے کوئی ایک شرف حاصل ہو سکتا تھا اور زیادہ سے زیادہ

حصہ حاصل کر لینا ہی ان کی عظمت کا معیار تھا اور قریش کے تمام قبائل کا اس امر پر اتفاق تھا کہ اس سے بہتر کوئی سیاسی نظام نہیں ہو سکتا ہے کہ اس میں غالب و مغلوب کا کوئی جھگڑا نہیں ہے اور تمام مناصب تمام قبائل کے درمیان مشترک ہیں اور کسی قبیلہ کی کوئی مصلحت منصب کی تغییر سے وابستہ نہیں ہے اور نہ کسی کو اس تغییر کا واقعی انجام معلوم ہے کہ اس وقت صورت کیا ہوگی۔ چنانچہ سارے قبائل اسی صورت حال پر خوش تھے اور دھیرے دھیرے یہ نظام ایک سیاسی عقیدہ کی شکل اختیار کر گیا اور یہ بزرگوں کا مقدس ترکہ بن گیا جس کے خلاف اقدام کرنا بغاوت اور انحراف قرار پایا۔

ج۔ صورت حال کے تزلزل کے عوائم

قحط کے زمانے میں مکہ میں ہاشم کے علاوہ کوئی ایسا نہ تھا جو لوگوں کو شکم سیر کر سکے اور اسی بنا پر انھیں ابو البطحاء اور سید البطحاء کہا جاتا تھا۔ ان کا دستر خوان راحت اور پریشانی ہر دور میں پھیلا ہوا تھا اور وہ تمام مسافروں کو سامان دے رہے تھے اور خوفزدہ کے امن و سکون کا انتظام کر رہے تھے۔

(طبری ۲/ ۱۸۰، سیرت حلبیہ ۱/ ۵، طبقات ابن سعد ۱/ ۷۶)

امیہ بن عبد شمس کو یہ صورت حال دیکھ کر اپنی حیثیت کا خطرہ محسوس ہونے لگا اور حسد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس نے ہاشم کی نقل کرنا چاہی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ تو قریش نے طعنے دینا شروع کر دئے۔ اس نے ہاشم کا مقابلہ کرنا چاہا لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ تو دوبارہ ۵۰ اونٹ اور دس سال کے لئے مکہ سے دیس نکالا پر طے پایا اور فیصلہ یہ ہوا کہ ہاشم امیہ سے بہتر ہیں اور اس طرح امیہ کو اونٹ بھی ذبح کرنا پڑے اور دس سال کے لئے شام کی طرف جلاوطن بھی ہونا پڑا اور یہیں سے ہاشمی اور اموی گھرانے کی تاریخی عداوت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

امیہ کی پشت پر ہاشم سے حسد اور یہ خوف کام کر رہا تھا کہ کہیں اس طرح ہاشم پرانے تقسیم مناصب کے نظام کو ختم نہ کر دیں اور وہ قیادت جو بنی عبد شمس کے ہاتھ میں ہے ان کے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ اس لئے کہ ہاشم کا اس شان سے نمودار ہونا اس نظام

کے لئے کھلا ہوا خطرہ ہے اور لوگوں کا پلہ برابر ہلکا ہوا جا رہا ہے۔
(سیرت حلبیہ ۱/۱۵، النظام السیاسی فی الاسلام ص ۱۷۰-۱۷۲)

د۔ نبوّت کی شہرت

مکہ میں یہ خبر پھیل گئی کہ عنقریب ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے اور وہ عبد مناف کی نسل سے ہوگا۔ ابو سفیان کے دماغ میں بھی یہ بات راسخ ہو گئی۔ اس لئے کہ اس کے امیہ بن ابی الصلت سے مستحکم تعلقات تھے اور اسے اس بات کا یقین تھا کہ یہ نبی پرانے سیاسی نظام کو تباہ و برباد کر دے گا اور اس کے خاندان سے قیادت کو چھین لے گا۔ قیادت اب تک بنی امیہ کے حصہ میں ہے لہٰذا نبوت کا سب سے بڑا خطرہ بنی امیہ کو ہے۔ لیکن اس کے بعد اسے قدرے اطمینان حاصل ہو گیا کہ نبوت عبد مناف کے خاندان میں ہوگی اور عبد مناف کے خاندان میں اس سے زیادہ نبوت کا حقدار کوئی نہیں ہے لہٰذا مستقبل کا پیغمبر وہی ہوگا۔ (سیرت حلبیہ ۱/۸۰)

ہ۔ اعلان نبوّت

بنی ہاشم کے چشم و چراغ حضرت محمدؐ نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ نبی منتظر جسے عالم عرب اور عالم انسانیت کی ہدایت کے لئے منتخب کیا گیا ہے وہ میں ہی ہوں اور میری نبوت کی عظیم ترین دلیل کلام اللہ ہے۔ جس کے بعد مشہور و معروف اہل نظر نے ان کا اتباع کر لیا اور اس طرح قدیم نظام کی تباہی کے آثار نمودار ہو گئے۔

و۔ بنی ہاشم کا نبی کے گرد اجتماع

اولاد بنی ہاشم نے پوری طاقت کے ساتھ پیغمبرؐ کو اپنی پناہ میں لے لیا اور جب قریش کی قیادت نے انھیں قتل کی دھمکی دی اور قتل کا پروپیگنڈہ بھی کر دیا تو ابو طالب تمام بنی ہاشم کو لے کر کھڑے ہو گئے اور سب کو ایک دھار دار لوہا دے دیا اور یہ اعلان کیا کہ اہل قریش تم جانتے ہو کہ میرا ارادہ کیا ہے؟ سب نے لاعلمی کا اظہار کیا تو فرمایا کہ ہم تمھارا شدید مقابلہ کریں گے اور پھر بنی ہاشم کو حکم دیا کہ اسلحے نکال لیں۔ اسلحے سامنے آ گئے تو ابو طالب نے فرمایا کہ خدا کی قسم اگر تم لوگوں نے محمدؐ کو قتل کر دیا ہوتا تو میں تم سے ایک کو بھی زندہ نہ

چھوڑتا اور خود بھی قربان ہو جاتا۔ یہ سُن کر قوم کے دل ٹوٹ گئے اور سب سے زیادہ ابو جہل پر اس کا اثر ہوا۔ (طبقات ۱/۲۰۲-۲۰۳)

ز۔ سیاسی نظام کی حفاظت اور حسد نہ کہ حب اصنام

قریش کی تمام شاخوں نے مل کر ابو سفیان کی قیادت میں پیغمبر اسلامؐ سے مقابلہ شروع کر دیا اور چوں کہ بنی ہاشم مکمل طور پر ان کی سپردگی کی ہر تجویز کے بشدت مخالف تھے لہذا تمام قبائل نے متفقہ طور پر یہ منصوبہ تیار کیا:

۱۔ بنی ہاشم کا مکمل بائیکاٹ کر دیا جائے۔ چنانچہ تمام قبائل نے بشمول بنی تیم و بنی عدی بائیکاٹ میں حصہ لیا اور تین سال کے لئے بنی ہاشم کو شعب ابو طالب میں محصور کر دیا کہ وہ لوگ درختوں کے پتے چبانے پر مجبور ہو گئے اور ان کے بچے شدت عطش سے ریت چوسنے لگے۔

یہ وہ آفتاب نصف النہار جیسی روشن حقیقت ہے جس کا کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن اس صورت حال کے بعد بھی حضرت محمدؐ یا بنی ہاشم جھکنے کے لئے تیار نہ ہوئے اور بالآخر خدا نے قریش کے مکر کو باطل کر دیا اور تین سال کے بعد محاصرہ ٹوٹ گیا۔

۲۔ قریش کو جب یہ خبر ملی کہ محمدؐ یثرب کی طرف ہجرت کرنے والے ہیں اور وہاں انھوں نے ایک جماعت تیار کر لی ہے تو سب نے بالاجماع یہ طے کیا کہ ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے اور ہر قبیلہ سے ایک شخص کا انتخاب کیا تاکہ سب مل کر حملہ کریں اور پیغمبرؐ کا خون قبائل میں تقسیم ہو جائے اور بنی ہاشم بیک وقت سب سے بدلہ نہ لے سکیں۔ ورنہ اگر یہ یثرب پہونچ گئے تو کامیاب ہو جائیں گے اور قریش کی قیادت و سیادت ختم ہو جائے گی۔

ایسے ہی سخت ہنگامی لمحہ میں جب پیغمبرؐ کے گھر میں داخل ہوئے تو علیؑ بن ابی طالبؑ کو ان کے بستر پر دیکھا اور مکی قیادت بوکھلا گئی۔ اعلان یہ ہوا کہ جو زندہ مُردہ پکڑ کر لائے گا اسے انعام دیا جائے گا۔

لیکن اُدھر پیغمبرؐ اپنے ایک ساتھی اور ایک دلیل کے ساتھ سرگرم سفر رہے اور حکم پروردگار سے بالکل صحیح و سالم رہے۔ جس واضح حقیقت کے لئے کسی طرح کی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

(سیرت حلبیہ ۱/۸۰، ۱/۳۳۲)

ح۔ سیاسی نظام کے تحفظ کے لئے حاسدانہ جنگیں

نہ قریش کے قبائل اور اس کی اموی قیادت حضرت محمدؐ اور بنی ہاشم کے دین کی ہزیمت کی طرف سے مایوس ہوئی اور نہ بنی ہاشم اور ان کے قائد پیغمبر اسلامؐ کفار کی ہزیمت کی طرف سے مایوس ہوئے اور اس معرکہ آرائی کے نتیجہ میں عرب تین حصوں میں تقسیم ہو گئے۔

ایک قسم قریش اور ان کی مشرک قیادت کے ساتھ ہو گئی۔

ایک مختصر جماعت پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ رہی۔

اور ایک قسم حالات کا جائزہ لیتی رہی تاکہ غالب آنے والے کے ساتھ لگ جائے۔

بدر واحد کی جنگ کے شعلے بلند ہوئے۔ قریش کی قیادت نے یہودیوں سے ساز باز کر کے احزاب کا لشکر اکٹھا کیا اور پیغمبر اسلامؐ کے دار الحکومت مدینہ پر مسلح حملہ کر دیا لیکن تمام احزاب کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا اور چند دنوں کے اندر قریش کو ایک نئی ناگہانی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا کہ لشکر الٰہی کفر کے دار الحکومت مکہ میں فاتحانہ انداز سے داخل ہو گیا اور اس طرح مکہ کی قیادت کو جھکنا پڑا اور مجبور ہو کر اسلام میں داخل ہونا پڑا۔ مکی قیادت کا جھکنا تھا کہ سارا عرب جھک گیا اور سارا جزیرۃ العرب پیغمبر اسلامؐ کی حکومت میں شامل ہو گیا اور عرب دین خدا میں فوج در فوج شامل ہونے لگے۔

ط۔ ہاشمی نبوت تقدیر کائنات کا حتمی فیصلہ

قبائل قریش نے اموی زعامت کے زیر اثر دین محمدی اور نبوت ہاشمی کا مکمل طور پر انکار کر دیا اور ہر طرح سے اس کا مقابلہ کیا لیکن اس کا محرک بتوں سے وفاداری کا جذبہ نہیں تھا بلکہ سارا مسئلہ یہ تھا کہ دین ہاشمی راستہ سے آیا ہے اور ہاشمی قیادت قابل برداشت نہیں ہے اور اس سے مکمل سیاسی صورت حال کے متزلزل ہو جانے کا خطرہ ہے۔

آخر میں ابو سفیان کو اس اچانک حادثہ کا بھی سامنا کرنا پڑا کہ خدائی لشکر مکہ کے قریب آگیا ہے اور عباس اس سے کہہ رہے ہیں کہ ذرا لشکر الٰہی کی شان و شوکت تو دیکھ۔ اور ابو سفیان کے دل میں دہشت سمائی ہوئی ہے اور وہ دعوتِ محمدی کے بارے میں اپنے جاہلیت زدہ، تعصّب آمیز نظریہ کا اظہار کرتا ہے کہ ایسی ملوکیت تو کسریٰ۔ قیصر اور

بنو الاصفر کے یہاں بھی نہیں دیکھی ہے۔ (سیرت حلبیہ ۳/ ۷۹)

اور عباس اسے کھینچ کر پیغمبرؐ کی خدمت میں لے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابوسفیان بڑے افسوس کی بات ہے کہ ابھی تک اس بات کا وقت نہیں آیا ہے کہ تو توحید الٰہی کا یقین پیدا کر لے؟ ابوسفیان نے کہا کہ اتنا تو بہر حال معلوم ہو گیا ہے کہ اگر دوسرا خدا ہوتا بھی تو کام آنے والا نہیں تھا۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کیا اس بات کا وقت نہیں آیا ہے کہ میری رسالت کا اقرار کر لے؟ اس نے کہا کہ میرے دل میں ابھی تک اس مسئلہ کی طرف سے شبہات ہیں۔ عباس نے پکار کر کہا وائے ہو تجھ پر، اسلام لے آ اور کلمہ پڑھ لے قبل اس کے کہ تیری گردن اڑا دی جائے۔

گردن اڑنے کا ذکر سننے کے بعد اس نے محسوس کر لیا کہ اب نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے چنانچہ فوراً اسلام کا اظہار کر دیا۔ اور مسلسل حضور کی طرف دیکھ کر یہ سوچتا رہا کہ آخر انھیں کس شے کے ذریعہ سے غلبہ حاصل ہو گیا ہے؟ مالک کائنات نے وحی کے ذریعہ پیغمبرؐ کو ابوسفیان کے دل کے خیالات سے آگاہ کر دیا اور آپ نے فوراً فرمایا۔ میں نے تجھ پر خدائی طاقت کے ذریعہ غلبہ حاصل کیا ہے۔

اب قریش کے قبائل کو اندازہ ہو گیا کہ نبوت محمدی ایک تقدیر کائنات ہے جس سے کوئی مفر نہیں ہے اور اس کا کوئی تعلق انسانی اختیار سے نہیں ہے۔ اگر انسان کا کوئی بھی بس چل سکتا تو ہم ہرگز اس بات کو برداشت نہ کرتے کہ نبوت بنی ہاشم کے اندر رہے۔ لیکن نبوت ایک ایسا واقعہ ہے جو دوبارہ ہونے والا نہیں ہے اور اب کوئی قبیلہ بنی ہاشم کی ہمسری نہیں کر سکتا ہے۔ بنی ہاشم اس شرف میں سارے قبائل پر سبقت لے گئے، اور اس طرح قریش کا سارا سیاسی ڈھانچہ ہل کے رہ گیا اور اب قریش کے سامنے ایک ہی راستہ رہ گیا کہ بنی ہاشم نبوت اور حکومت دونوں پر قبضہ کرنا چاہیں تو اس محاذ پر شدت سے مقابلہ کیا جائے۔

ہاشمی حملہ کا سب سے شدید ترین مقابل

یوں تو تمام قبائل قریش اس احساس پر متفق تھے کہ نبوت ہاشمی نے ہمارے سیاسی

ڈھانچہ کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور تقسیم مناصب کا سارا نظام تباہ و برباد ہو کر رہ گیا ہے۔
اور اسی لئے بنی المطلب کے علاوہ سب نے اس نبوّت کا مکمل انکار کر دیا ہے لیکن تمام قبائل میں سب سے زیادہ شدید اور بدترین مقابل بنو امیہ تھے جن کا مقصد یہ تھا کہ نبوت اور حکومت ایک خاندان میں جمع نہ ہونے پائیں اور اس کے مختلف اسباب تھے:

۱۔ بنی ہاشم کے خلاف بنی امیہ کے حسد اور عداوت کی ایک طویل تاریخ تھی جس کا سلسلہ قبل اسلام تک پھیلا ہوا تھا۔

۲۔ ہاشمی نبوت نے بنی امیہ کی قیادت کا جنازہ نکال دیا تھا۔

۳۔ ہاشمیین نے بنی امیہ کے تمام سردار عتبہ۔ ولید۔ شیبہ سب کا خاتمہ کر دیا تھا اور بنی امیہ ان سے صرف نفرت ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ کینہ و عداوت بھی رکھتے تھے لہذا ان کی نظر میں حمزہ کو قتل کر دینا کافی نہیں تھا بلکہ ان کی لاش کا مثلہ کر دینا بھی ضروری تھا۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود نبوت کی کامیابی اور نور اسلام کی وسیع ترین تابانی اور بنی امیہ کے اسلام میں بہ دیر داخلہ اور گذشتہ تمام جنگوں نے ان میں یہ ہمّت نہیں رکھی تھی کہ وہ علی الاعلان اس امر کا اظہار کر سکیں کہ ہم نبوت اور حکومت کو جمع نہ ہونے دیں گے۔

ی۔ تلاطم خیز طوفان

"بنی ہاشم میں نبوت اور حکومت جمع نہ ہونا چاہیئے"۔ یہ نظریہ دھیرے دھیرے ایک طوفان خیز تلاطم کی شکل اختیار کر گیا لیکن اس کا جوش دلوں کے اندر محدود رہا اور پیغمبرؐ کے وجود نے اس کے اظہار کے تمام راستے بند کر دئے، دور صحابہ صادقین کا اتفاق و اجماع بھی اس کے منھ میں لگام بنا رہا کہ اگر ان عناصر میں کوئی ایک عنصر بھی کم ہو گیا تو قانونی شکل متزلزل ہو جائے گی اور صحابہ صادقین کالے بیل کے جسم پر سفید بال سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھ سکیں گے (بقول معاویہ) اور امر غلبہ حاصل کرنے والے کے حصہ میں چلا جائے گا۔

ک۔ قرابت پیغمبرؐ اساس خلافت راشدہ

جب تینوں مہاجرین سقیفہ بنی ساعدہ میں وارد ہوئے تو اپنے استحقاقِ خلافت

کے بارے میں یوں استدلال شروع کیا:

ابو بکر۔ "ہم عشیرہ رسولؐ سے ہیں اور تم ان کے اور ہمارے دین میں مددگار ہو۔"

عمر۔ "ایک نیام میں دو تلواریں جمع نہیں ہو سکتی ہیں۔ خدا کی قسم عرب اس بات سے راضی نہ ہوں گے کہ تمھیں حاکم بنا دیا جائے جب کہ نبی تمھارے قبیلہ سے نہیں ہیں۔ عرب صرف اسے حکومت دینا چاہیں گے جس کے خاندان میں نبوّت رہی ہو۔ ہم اس سلسلہ میں تمام مخالفین عرب کے مقابلہ میں واضح دلیل اور نمایاں بُرہان رکھتے ہیں۔ کون ہم سے محمدؐ کی سلطنت اور میراث کے بارے میں بحث کر سکتا ہے جب کہ ہم ان کے قرابت دار اور اہل عشیرہ ہیں علاوہ اس شخص کے جو باطل پرست، معصیت کار یا ہلاکت میں مبتلا ہونے والا ہو۔ (الامامۃ والسیاستہ ص ۶۔۷۔۸)

ان دلائل کو سُن کر تمام انصار نے کہا تو پھر ہم سوائے علیؑ کے کسی کی بیعت نہیں کریں گے اگرچہ علیؑ اس وقت موجود نہیں تھے۔ (طبری ۳/۱۹۸)

یہ دیکھتے ہی فوراً حضرت صدیق کی خلافت طے کر دی گئی اور حضرت علیؑ کو بھی بیعت کے لئے طلب کر لیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں اس امر کا تم سے زیادہ حقدار ہوں۔ تمھارا فرض ہے کہ میری بیعت کرو نہ یہ کہ میں تمھاری بیعت کروں۔ تم نے انصار کے مقابلہ میں قرابت پیغمبرؐ سے استدلال کیا ہے اور پھر ہم سے خلافت کو غصب کرنا چاہتے ہو۔ کیا تم نے انصار پر یہ خیال ظاہر نہیں کیا ہے کہ تم ان سے زیادہ حقدار ہو اس لئے کہ پیغمبرؐ تم میں سے ہیں اور انھوں نے اسی بنیاد پر تمھیں امارت و قیادت سپرد کر دی ہے تو اب میں یہی استدلال تمھارے مقابلہ میں کر رہا ہوں کہ ہم رسول اللہ سے حیات و موت ہر حالت میں تم سے زیادہ قریب تر ہیں۔

ل۔ انقلاب اور طوفان کے رُخ کی تبدیلی

عمر بستر مرگ پر مستقبل امت کے بارے میں غور کر رہے ہیں اور اسکی مختلف صورتوں کے سلسلہ میں فکر مند ہیں۔ "کاش ابو عبیدہ زندہ ہوتے تو انھیں حاکم بنا دیتا۔" "کاش معاذ بن جبل زندہ ہوتے تو انھیں کو بنا دیتا۔" "کاش خالد بن ولید موجود ہوتے

تو انھیں کو بنا دیتا"۔ "کاش ابو حذیفہ کے غلام سالم زندہ ہوتے تو انھیں کو حکومت دیدیتا"۔
جب کہ سالم موالی میں سے تھے اور ان کا عرب میں کوئی نسب نہیں تھا۔ نہ رسول اکرمؐ
کا خاندان نہ غیر رسول کا خاندان ۔ اور معاذ انصار میں ہیں جن کی حکومت روز سقیفہ
ہی مسترد ہو چکی ہے اور خالد بنی مخزوم میں ہیں جو صحابہ کے دسویں طبقہ میں ہیں کہ اس
نے صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی وقفہ میں ہجرت کی ہے۔

دوران زمانۂ خلافت ایک دن عمر نے ابن عباس سے کہا۔ ابن عباس انھیں
معلوم ہے کہ تمھاری قوم نے تمھیں پیغمبرؐ کے بعد خلافت کیوں نہیں دی ہے؟

ابن عباس نے جواب دینے سے گریز کیا اور کہا اگر مجھے نہیں معلوم ہے تو آپ
"امیر المومنین" ہیں آپ کو تو بہرحال معلوم ہوگا۔ فرمایا کہ قوم کو یہ بات پسند نہیں
تھی کہ نبوت اور خلافت ایک خاندان میں جمع ہوں لہٰذا سب نے اپنے اپنے مفاخر
کا سہارا لیا اور قریش نے اپنے واسطے حق اختیار کر لیا اور کامیاب بھی ہو گئے۔

ابن عباس نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں کچھ لب کشائی کروں۔؟

عمر نے کہا ضرور۔

ابن عباس نے فرمایا کہ قریش نے خلافت کو اپنے لئے اختیار کیا اور کامیاب
بھی ہو گئے تو یاد رکھو کہ اگر قریش نے وہ راستہ اختیار کیا ہوتا جو خدا کو پسند ہے تو یقیناً
اس بات کی کوئی تردید نہیں تھی لیکن تمھارا یہ کہنا کہ قریش کو ایک خاندان میں خلافت
و نبوت ناگوار تھی تو پروردگار نے ایسی ناگواریوں کے بارے میں صاف کہہ دیا ہے
کہ" ان لوگوں کو تنزیل الٰہی ناگوار ہے لہٰذا ان کے اعمال برباد کر دئے گئے"۔

عمر نے کہا ہیہات ابن عباس! تمھارے بارے میں بہت سی خبریں ملتی تھیں
لیکن میں اعتبار نہیں کرتا تھا کہ اس طرح میری نگاہوں سے تمھاری حیثیت گر جائیگی
لیکن اب!۔

ابن عباس نے کہا کہ اگر وہ باتیں حق ہیں تو حیثیت کے گرنے کا کوئی سوال
نہیں ہے اور اگر باطل ہیں تو میں حرف باطل کو ہمیشہ اپنے سے دور رکھتا ہوں۔

عمر نے کہا ایک خبر تو یہ ملی ہے کہ تم نے یہ کہا ہے کہ لوگوں نے بر بنائے حسد وبغی وظلم خلافت کا رُخ موڑ دیا ہے۔!

ابن عباس نے کہا کہ جہاں تک ظلم کا تعلق ہے تو یہ بات عالم وجاہل سب پر روشن ہو چکی ہے اور جہاں تک حسد کا تعلق ہے تو ہم اولاد آدم ہیں اور روز اول سے محسود ہیں۔

عمر نے کہا ہیہات ہیہات! واقعاً تمھارے دلوں سے حسد نکل نہیں سکتا ہے۔

ابن عباس نے فرمایا۔ آپ ایسی باتوں سے گریز کریں اور حسد سے ان قلوب کو متصف نہ کریں جن سے خدا نے رجس کو دور رکھا ہے اور انھیں حق طہارت کی منزل پر رکھا ہے۔

اس واقعہ کو مسعودی نے مروج الذہب میں نقل کیا ہے اور یہ واقعہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ایک فکری انقلاب پیدا ہو گیا تھا اور وہ طوفان جو دلوں کے اندر چھپا ہوا تھا اور اس پر وجود پیغمبرؐ کی روک لگی ہوئی تھی اچانک باہر آگیا تھا اور دھارے کا رُخ بدل گیا تھا۔

واقعہ کی حرفی تصویر

عبد اللہ بن عباس کا بیان ہے کہ عمر نے ان کے پاس پیغام بھیجا کہ حمص کا گورنر مر گیا ہے اور وہ اہل خیر میں تھا اور اہل خیر بہت کم ہیں اور امید ہے کہ تم ان میں سے ہو گے۔ تمھارے بارے میں میرے دل میں کچھ باتیں ہیں۔ لیکن اس عمل کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟

ابن عباس نے کہا میں اس وقت تک منظور نہ کروں گا جب تک وہ نہ بتاؤ جو تمھارے دل میں ہے۔

عمر نے کہا تو تمھیں اس سے کیا لینا ہے۔؟

ابن عباس نے کہا مجھے ضرورت ہے! اگر کوئی ایسی بات ہے کہ جس سے میں اپنے نفس کے بارے میں ڈرتا ہوں تو اس کی فکر کروں ورنہ یہ معلوم ہو جائے کہ میں ان باتوں سے بَری ہوں اور پھر اس عمل کو قبول کروں گا۔ اس لئے کہ مجھے تمھارا مزاج معلوم ہے کہ جس بات کا

مطالبہ کرتے ہو اس میں جلدی کرتے ہو۔
عمر نے کہا کہ ابن عباس! مجھے یہ خوف ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں مر جاؤں اور تم عہدہ پر برقرار رہو اور لوگوں کو اپنی طرف دعوت دو جب کہ یہ بات صحیح نہیں ہے اس لئے کہ رسول اکرمؐ نے سب کو حاکم بنایا ہے تم کو نہیں بنایا ہے! اب خدا بہتر جانتا ہے کہ ایسا کیوں کیا ہے۔ بہر حال میں تمھیں یہ عہدہ دینا چاہتا ہوں۔ بتاؤ تمھاری رائے کیا ہے۔؟
ابن عباس نے کہا کہ مناسب یہ ہے کہ میں تمھارے لئے کام نہ کروں۔
عمر نے کہا کیوں؟
ابن عباس نے کہا کہ اگر تمھارے دل میں یہ کھٹکا رہ گیا تو میں ہمیشہ تمھاری آنکھ کا تنکا بنا رہوں گا۔
عمر نے کہا پھر کوئی دوسرا آدمی بتاؤ۔
ابن عباس نے کہا کہ ایسے آدمی کو اختیار کریں جو آپ کے حق میں ٹھیک ہو۔
(الامامۃ والسیاسۃ ص ۱۵)
گویا حضرت عمر کو مصالح مسلمین کی اس قدر فکر ہے کہ مرنے کے بعد بھی بنی ہاشم کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط نہیں دیکھ سکتے ہیں۔
خلاصہ یہ ہے کہ نبوت و خلافت کا عدم اجتماع وہ طوفان بن گیا جس نے اپنے کو ساری امت پر مسلط کر دیا اور حکومت سے لے کر عوام کی اکثریت تک سب اس عقیدہ پر ایمان لے آئے کہ یہ ہاشمی اقتدار کو روکنے کا بہترین وسیلہ ہے اور اس طرح قریش کے تمام قبائل کو انصاف مل جائے گا اور وہ ہاشمی نبوت کے بدل یا ردعمل کے طور پر خلافت کو آپس پر برابر تقسیم کرتے رہیں گے اور قریش کو اس فکر میں بقول" فاروق" کامیابی بھی حاصل ہو گئی۔
اس کے بعد ابو سفیان کو اقتدار سے قریب کر کے اور اس کے ہاتھوں کے صدقات کو اس کے حوالے کر کے اور اس کے فرزند یزید کو لشکر شام کا قائد بنا کر اور دوسرے فرزند معاویہ کو شام کا گورنر بنا کر۔ پھر یزید کے بعد اسے شام کا مکمل اقتدار دے کر حکومت نے بنی امیہ کے طلقاء کے ساتھ عہد و پیمان مکمل کر لیا کہ بنی ہاشم کو نبوت اور خلافت جمع کرنیکا موقع نہیں

ملنا چاہیئے اور اس طرح معارضہ کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور بنی ہاشم میں خلافت و نبوت کے جمع نہ ہونے کا قانون راسخ ہوگیا۔

اس سازش کا پہلا اثر یہ ہوا کہ عترت پیغمبرؐ تمام امتیازات شرف سے محروم ہوگئی۔ حد یہ ہے کہ وہ سیادت بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئی جو قبل اسلام قبائل میں تقسیم منصب کی بنیاد پر حاصل تھی۔ حضرت فاروق نے ابن عباس اور بنی ہاشم سے خطاب کر کے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم تمھارے پاس اس لئے نہیں آئے ہیں کہ ہمیں تمھاری ضرورت ہے۔ ہم نے صرف یہ نہ چاہا کہ تم اس فیصلہ پر اعتراض کرو جس پر امت کا اتفاق ہو چکا ہے اور اس طرح ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جائے۔

اب بنی ہاشم کی حیثیت اس قدر پست ہوگئی کہ عبداللہ بن زبیر نے بھی یہ طے کر لیا کہ ان کے گھروں میں آگ لگا دی جائے اگر درمیان میں کچھ اہل خیر حائل نہ ہو گئے ہوتے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جن قبائل نے شعب ابی طالب میں تین سال تک بنی ہاشم کا محاصرہ کر رکھا تھا اور اپنے اپنے نمائندہ قتل پیغمبرؐ کے لئے بھیج رہے تھے۔ ان کا حصہ بھی اسلام میں بنی ہاشم سے زیادہ ہوگیا اور ہر شخص بنی ہاشم سے زیادہ حکومت کا حقدار ہوگیا۔ اب ریاست و ولایت ہر شخص کے لئے حلال ہے (بنی ہاشم کے علاوہ) تاکہ خلافت و نبوت ایک خاندان میں جمع نہ ہونے پائیں اور یہ "ھل جزاء الاحسان الا الاحسان" کا تازہ ترین مفہوم ہے۔

۴۔ عدم جواز جمع خلافت و نبوت کی شرعی حیثیت

حقیقت امر یہ ہے کہ یہ نظریہ سو فیصدی جاہلیت کا ترکہ ہے اور شرعی نصوص، عقائد الٰہیہ سے متضاد اور اسلام کے سیاسی قوانین سے مکمل طور پر متصادم ہے۔ حضرت داؤد کی وراثت حضرت سلیمان کو ملی اور ایک گھر میں نبوت و حکومت دونوں جمع ہوگئے۔ انبیاء کرام اور ان کی ذریت کو نبوت و کتاب و حکومت ساری چیزیں عطا کی گئیں اور کسی نے اعتراض نہیں کیا کہ یہ ایک فضل خدا ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ خلافت ایک دینی اور دنیوی منصب ہے جو نبی کی نیابت میں حاصل ہوتا ہے اور نبی کے فرائض میں

بیان احکام کے ساتھ تطبیق احکام اور حکومت کا کام بھی شامل ہے۔ جو تمام تر فنی کام ہے اور اس کے لئے متخصص افراد درکار ہیں۔

اسلام کے سیاسی نظام کے قواعد سے ادنیٰ اطلاع رکھنے والا بھی اس حقیقت کو محسوس کر سکتا ہے کہ اس نظریہ نے الٰہی نظام کے تمام قوانین کو برباد کر کے رکھ دیا ہے اور اسے اس کی معنویت سے یکسر الگ کر دیا ہے۔ اب اسلام کا سیاسی نظام ایک دنیاوی نظام ہے جس کا نام اسلامی رکھ دیا گیا ہے اور اس کے تمام قواعد دنیاوی نظام سے ہم آہنگ ہیں۔ اس سے بدتر صورت حال یہ ہے کہ اب ریاست و قیادت ایک مال غنیمت جیسی ہے جسے ہر غلبہ حاصل کرنے والا حاصل کر سکتا ہے اور غلبہ حاصل کر کے کرسئ نبوت پر بیٹھ سکتا ہے اور اسلام کی ردا اپنے دوش پر ڈال سکتا ہے۔

اگر وہ طلیق جس نے ہر انداز سے اسلام سے جنگ کی ہے اور بعد میں چاروں طرف سے محصور ہو کر بدرجہ مجبوری اسلام قبول کر لیا ہے۔ غالب آجائے تو وہ بھی اس مہاجر پر حکومت کر سکتا ہے جس نے اسلام کے ساتھ ہر جنگ میں شرکت کی ہے اور اس طرح حکومت اسلامی کا حقدار اور ولی اللہ بن سکتا ہے۔ اب جاہل بولے گا اور عالم خاموش رہے گا۔ محاصرہ کرنے والا مقدم ہو گا اور تین سال محاصرہ میں رہنے والا پیچھے ہٹا دیا جائے گا۔ اور یہ سب صرف اس لئے ہو گا کہ قبائل کے ساتھ انصاف کیا جا سکے۔ اور بنی ہاشم میں نبوت و خلافت کا اجتماع نہ ہو سکے یا زیادہ دقیق تعبیر سے یہ کہا جائے کہ جاہلیت کے نظام کو واپس لایا جا سکے اور اسے ایک نیا لباس عطا کیا جا سکے۔ جاہلیت میں تقسیم مناصب کی بنیاد قبائلی نظام پر تھی اور اب پھر وہی قانون واپس آگیا ہے کہ ہر قبیلہ کو یکے بعد دیگرے خلافت میں حصہ دیا جائے گا اور سیاسی نظام کے بارے میں خدائی احکام کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے گا۔ اس لئے کہ یہ نظام اس سیاسی ڈھانچہ کو تسلیم نہیں کرتا ہے جو اسلام سے پہلے مکہ میں رائج تھا۔

ن۔ قانون عدم جواز جمع خلافت و نبوت کے نتائج

پہلا نتیجہ: ان تمام امتیازات کا زوال۔ جو ان لوگوں کے درمیان قائم

ہونا چاہئیں جنھوں نے ہر انداز سے اسلام سے جنگ کی ہے اور آخر میں مجبور ہو کر کلمہ پڑھ لیا ہے اور ان لوگوں کے درمیان جنھوں نے اسلام کی راہ میں مسلسل جہاد کیا ہے یہاں تک کہ دین خدا کو غلبہ حاصل ہوا اور پیغمبرؐ ایمان کی حکومت قائم کر سکے۔

اس لئے کہ سب مسلمان ہیں اور سب جنت کے حقدار ہیں۔

اب وہ ہاشمی جو تین سال محاصرہ کی زندگی گذار چکا ہے اس مشرک جیسا ہے کہ جس نے محاصرہ کیا تھا اور اب کلمہ پڑھ لیا ہے۔ اس لئے کہ وہ بھی مسلمان ہے اور اسلام پرانے معاملات کو ختم کر دیتا ہے۔ گویا کہ سید الشہداء حمزہ اگر دنیا میں واپس آجائیں تو سیاسی اعتبار سے ان کا وہی درجہ ہوگا جو ان کے قاتل وحشی کا ہے۔

یہاں قاتل و مقتول۔ مہاجر و طلیق۔ جاہل و عالم سب ایک جیسے ہیں کہ جاہل کو غلبہ حاصل ہو جائے تو عالم پر اس کی اطاعت واجب ہے بلکہ اس سے بالاتر اگر بنی ہاشم میں حضرت علیؑ جیسا صاحب علم ہو اور اس کے مقابلہ میں ادنیٰ درجہ کا انصاری عالم ہو تو انصاری کا مرتبہ ہاشمی سے بالاتر ہے۔ اس لئے کہ حضرت فاروق نے وقت آخر فرما دیا تھا کہ اگر معاذ بن جبل زندہ ہوتے تو انھیں کو خلیفہ بنا دیتا۔ حالانکہ علیؑ بن ابی طالبؑ موجود تھے۔

یہی تمنا آپ کی اس خالد کے بارے میں تھی جس نے مختلف معرکوں میں اسلام سے جنگ کی ہے جب کہ علیؑ اسلام کی طرف سے دفاع کر رہے تھے۔

حضرت فاروق تو سالم کو بھی خلیفہ بنانے کے لئے تیار تھے جس کی عرب میں کوئی اصل نہیں تھی اور اس علیؑ کا کوئی ذکر نہ تھا جسے خود فاروق نے روز غدیر تمام اہل ایمان کا مولا تسلیم کیا تھا اور وہ بحکم رسولؐ۔ فاروق۔ ابو عبیدہ اور ایسے تمام مسلمانوں کا مولا تھا۔

دوسرا نتیجہ:

اختلافات کی تخم پاشی

جب یہ طے ہو گیا کہ مہاجر و طلیق۔ قاتل و مقتول۔ محاصِر و محاصَرین کوئی فرق نہیں

ہے اور ہر شخص کو اسلام کے سمجھنے اور اپنی سمجھ کے گرد لوگوں کو جمع کرنے کا حق ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب مختلف مرجعیتیں۔ مختلف مفاہیم اور مختلف قناعتیں ہوں گی اور ہر شخص اپنے خیال میں حق بجانب ہوگا۔ ایک فریق شمال کی طرف لے جائے گا اور دوسرا جنوب کی طرف۔ ایک مشرق کا رُخ کرے گا اور دوسرا مغرب کا اور اس طرح اسلام میں کوئی ایک مرجع نہ رہ جائے گا جس کی بات قطعی طور پر حجت ہو اور ہر ایک کے لئے قابلِ قبول ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اختلاف کی تخم پاشی ہوگئی اور زم زمین میں یہ پودا بڑھنے لگا۔ اب اگر ایک طرف علی کا کلام ہوگا اور دوسری طرف کسی طلیق کا تو سامع کو حق ہوگا کہ وہ صحیح و غلط کا فیصلہ کرے اور علیؑ کی کوئی حیثیت نہ ہوگی اس لئے کہ دونوں مسلمان اور دونوں جنتی ہیں اور دونوں صحابہ کرام میں شامل ہیں۔ اب علیؑ کے کلام کو کوئی ترجیح حاصل نہیں ہے اور ترجیح بھی کس طرح ہو سکتی ہے کہ سیاست نے دونوں کو مساوی بنا دیا ہے۔ اب یہ ایک سونے کا سکہ ہے جو شکل و صورت اور وزن و حجم میں بالکل ایک جیسا ہے اور انسان ہر سکہ کو اختیار کرنے کا حق رکھتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر اب اتفاق صرف ایک ظاہری شکل ہے ورنہ اندر اندر اختلاف ترقی کر رہا ہے۔ اور ایک دن یہ ایک کینسر کی شکل اختیار کر لے گا چاہے جلدی ہو یا بدیر۔ اور یہ کینسر امت کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دے گا اور اسے شرعی حدود سے نکال کر غموض و جہالت کے دائرہ میں ڈال دے گا۔

تیسرا نتیجہ:

خلافت حق عام

اب کوئی شے کسی مسلمان کو رئیسِ حکومت اسلامی ہونے سے مانع نہیں ہے بشرطیکہ کرسی تک پہونچنے کے امکانات موجود ہوں اور وہ حکومت پر قبضہ کر سکتا ہو اور لوگ اس کی اطاعت کے لئے تیار ہوں۔ شرط صرف یہ ہے کہ بنی ہاشم میں نہ ہو، اس لئے کہ بنی ہاشم نبوت لے چکے ہیں اور ان کے واسطے اتنا ہی کافی ہے۔

اس حق خلافت و ریاست نے اس انتہائی مکروہ کابوس کی شکل اختیار کر لی ہے

جس نے امت کے سکون وقرار کو غارت کر کے رکھ دیا ہے اور قوم کو ہر ریاست کے طلبگار کی تجربہ گاہ بنا دیا ہے اور اسلام کا سیاسی نظام معطل ہو کر رہ گیا ہے۔

اب یہ رئیس کس قبیلہ کا ہوگا؟ اس کا علم کس قدر ہے؟ اس کا دین کیسا ہے؟ اس کے کارنامے کیا ہیں؟ یہ کن لوگوں پر حکومت کرے گا؟ یہ ثانوی امور ہیں جن کی عملی طور پر کوئی قیمت نہیں ہے اس لئے کہ غالب بہرحال غالب ہے اور مغلوب کا راضی کر لینا ایک فنکارانہ عمل ہے۔

اب یزید کے لئے شرابی اور زانی ہونے کے باوجود کوئی شے مانع نہیں ہے کہ وہ رئیس حکومتِ اسلامیہ ہو جائے اس لئے کہ وہ ایک رئیس کا فرزند ہے اور امام حسینؑ کے لئے جو بنص رسولؐ سردار جوانانِ جنّت۔ ریحانۃ الرسول اور امام برحق ہیں کوئی مانع نہیں ہے کہ وہ یزید کی رعایا میں شامل ہو جائیں اس لئے کہ دونوں مسلمان ہیں اور مسلمان جنتی ہوتا ہے۔ گویا یزید قاتل ومجرم بھی جنتی اور حسینؑ امام شہید بھی جنتی۔ اس لئے کہ دونوں صحابی ہیں اور صحابی جنتی ہوتا ہے۔ اور اگر کسی نے اس رائے پر تنقید کی تو وہ زندیق وکافر ہے۔ اس کا بائیکاٹ واجب ہے اور اس کی نماز جنازہ حرام ہے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

چوتھا نتیجہ:

اختلاط اوراق

اس نظریہ کا آخری انجام یہ ہوا کہ جاہل وعالم۔ حق وباطل۔ خیر وشر۔ حنظل وشہد سب مخلوط ہو کر رہ گئے۔ مقدم موخر ہو گیا، لاحق سابق بن گیا۔ مجاہد مثل خانہ نشین ہو گیا۔ قاتل مثل مقتول ہو گیا۔ محاصِر مثل محاصَر ہو گیا۔ اسلام کی طرف سے دفاع کرنے والا اسلام کے ساتھ جنگ کرنے والا جیسا ہو گیا اس لئے کہ سب دین خدا میں داخل ہو گئے ہیں۔ سب نے حضورؐ کا دیدار کر لیا ہے اور سب صحابہ ہیں اور سب جنتی ہیں۔

صادقین گم ہو گئے۔ ان کی جماعت منتشر ہو گئی اور بقول معاویہ ان کی حیثیت کالے بیل کے جسم پر سفید بال کی ہو گئی۔ اسلام کا سیاسی نظام معطل ہو گیا۔ مقدم موخر بنا دئے گئے۔ موخر مقدم ہو گئے۔ اور انجام کار بہرحال اللہ کے ہاتھوں میں ہے۔!

فصل دوم

نظریۂ عدالت صحابہ کی سیاسی جڑیں

اسلام کا سیاسی نظام

۱۔ واقع اور مثال کا اختلاف

اسلام کا وہ سیاسی نظام جو اسلامی تاریخ میں وفات پیغمبرؐ کے بعد منطبق کیا گیا اور جس کا سلسلہ عثمانی حکومت کے سقوط تک باقی رہا اس اسلامی نظام سے سو فیصدی مختلف تھا جو مالک کائنات نے اپنے رسولؐ پر نازل کیا تھا تاکہ اس کی روشنی میں امت کی قیادت کی جا سکے۔

اگرچہ یہ بات طے شدہ ہے کہ مسلمانی نظام اسلامی نظام سے بالکل مختلف ہے لیکن اس کے بعد بھی یہ اختلاف افراد اور ادوار کے اعتبار سے کم و بیش ہوتا رہا، اور اندھی تقلید کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ اختلاف کسی صاحب بصیرت پر مخفی نہیں ہے اور اس کی بہترین دلیل یہ ہے کہ اگر وفاتِ پیغمبرؐ کے بعد واقعی اسلامی سیاسی نظام منطبق کیا گیا ہوتا تو اوّلاً اسلامی حکومت کا زوال نہ ہوتا۔

ثانیاً یہ فتنے اور مقاتل سامنے نہ آتے۔

تیسری بات یہ ہے کہ امت اسلامیہ میں یہ افتراق نہ ہوتا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اسلام کا عروج اور پھیلاؤ اسی حد پر رُک نہ جاتا اور اسلام تمام معمورۂ عالم پر حاوی ہو جاتا اور تاریخ بشریت کو یکسر تبدیل کر دیتا۔

کتاب "تاریخ عام کا تجزیہ" میں انگریز فلاسفر ولز لکھتا ہے کہ "اگر اسلام اپنی

پہلی سیرت پر چلتا رہتا اور یہ فتنے جنم نہ لیتے تو اسلام نے سارے عالم کو فتح کر لیا ہوتا۔

(کتاب شیخ المضیرہ محمود ابوریہ ص ۱۷۲)

مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ علماء اسلام اب بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ نظام بعینہٖ اسلامی نظام ہے اور اسی بنیاد پر اسی نظام کو دوبارہ منطبق کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں جبکہ انھیں معلوم ہے کہ اسلامی نظام اپنی آخری شکل میں دور حیات پیغمبرؐ میں نظام خلافت کی پیداوار سے پہلے منطبق ہوا تھا اور خلافت نبوت کی نیابت ہی کا نام ہے تو اگر اسلامی نظام "نظام خلافت" کا نام ہے تو خلافت کے وجود سے پہلے جو نظام سرکار دو عالمؐ نے منطبق کیا تھا وہ کیا تھا۔؟

حقیقت امر یہ ہے کہ جو نظام سرکار دو عالمؐ نے نظام خلافت کے وجود سے پہلے مکمل طور پر منطبق فرمایا تھا وہی حقیقی اسلامی نظام اور اصل و مثالیہ تھا۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہے وہ فرع و شکل ہے جس میں حالات اور ادوار کے اعتبار سے فرق ہوتا گیا ہے۔

ب ۔ اسلام کا سیاسی نظام

اسلام کا وہ نظام جسے سرکار دو عالمؐ نے دعوت کے دوران اپنے مخصوص تابعین پر منطبق کیا تھا اور پھر حکومت کے دوران تمام مملکت پر منطبق کیا تھا جب دعوت نے دولت کی شکل اختیار کر لی تھی اور یہ سلسلہ دس سال تک قائم رہا جس کے نتیجہ میں پروردگار نے حضور کے ارتحال سے پہلے ہی دین کو کامل اور نعمت کو تمام کر دیا اور ہر شے کی وضاحت کر دی۔ حقیقی اسلامی نظام وہی تھا جسے ایک مثالی عالم کی تخلیق کے لئے پیش کیا گیا تھا اور وہی پروردگار کا مثالی۔ آخری اور نہائی نظام تھا۔

ج ۔ اسلامی سیاسی نظام کے ارکان

اسلامی سیاسی نظام کے چار ارکان ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل جڑے ہوئے ہیں اور کسی کا دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں ہے اور اگر ذرا بھی علیحدگی پیدا کی گئی تو نظام کی اسلامی صفت کا خاتمہ ہو جائے گا اور بقدر فصل نظام اسلام سے دور ہو جائے گا اور جلد یا بہ دیر فنا ہو جائے گا۔

یہی ارکان اربعہ اس کے دوسرے نظاموں سے ممتاز بنانے کا ذریعہ ہیں اور یہی تکامل اور جامعیت اس نتیجہ کو پیش کر سکتے ہیں جس کے لئے یہ نظام مرتب کیا تھا۔

رکن اوّل ۔ سیاسی قیادت

الٰہی عقائد میں سیاسی قیادت ایک عام شے ہے جو اسلام کو بھی شامل ہے، اور اس کی پیشکش براہ راست پروردگار کی طرف سے ہوتی ہے جس طرح داؤد، سلیمان اور حضرت محمد کے سلسلہ میں ہے کہ،

پروردگار نے براہ راست ان سب کا انتخاب نبوت اور ریاست کے لئے کیا۔ یا انبیاء کے ذریعہ سے اپنے فیصلہ کا اعلان کرا دیا جس طرح کہ طالوت کے قصہ میں ہوا کہ ان کے بنی اسرائیل کے سیاسی قائد ہونے کا اعلان بنی اسرائیل کے پیغمبرؑ کے ذریعہ کیا گیا اور انھوں نے یہ اعلان کر دیا کہ خدا نے تمھارے لئے طالوت کا انتخاب کیا ہے جس کے بعد اسرائیلیوں نے احتجاج کیا کہ طالوت سرداری کے قابل نہیں ہیں اور نبی وقت نے جواب دیا کہ ان میں ریاست کے تمام عوامل پائے جاتے ہیں۔

ا۔ خدا نے ان کے علم وجسم میں وسعت وطاقت عنایت فرمائی ہے۔

ب۔ یہ ایک فضلِ خدا ہے وہ کسی کو بھی عنایت فرما سکتا ہے۔

ج۔ وہ اس امر سے بہتر واقف ہے کہ اس منصب کا واقعی اہل اور حقدار کون ہے۔

یا جس طرح پروردگار نے حضرت علیؑ کا انتخاب ولایت امت کے لئے کیا۔ اور رسول اکرمؐ کے ذریعہ لاکھوں کے مجمع میں اعلان کرا دیا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ بھی مولا ہے۔

سیاسی قیادت کی خدائی تعیین کا مقصد؟

درحقیقت ہر محکوم کا نفسانیت اور مفادات سے بلند تر مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی قیادت وحکومت اس شخص کے ہاتھ میں ہو جو یقینی طور پر اعلم۔ افضل اور انسب ہو۔

اور یہ صلاحیت ایک مخفی مسئلہ ہے جسے یقینی طور پر ہر انسان معلوم نہیں کرسکتا ہے لہٰذا صاحبانِ ایمان کے حق میں رحمت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ انھیں اس کے ہدف اصلی اور مقصود واقعی کی راہنمائی کردے اگر وہ لوگ واقعاً اعلم، افضل اور انسب کی تلاش میں ہوں۔ اس لئے کہ قیادت وزعامت ایک فنی کام ہے اور یہ عام طور سے کسی نبوت کی خلافت میں انجام پاتا ہے اور نبوت کا مقصد تبلیغ و بیان احکام کے علاوہ محکومین کے ساتھ وسعت صدر کا برتاؤ کرنا ہے اور اس کے بعد قول فیصل سے کام لینا ہے تاکہ نظام زندگی کے ہر مرحلہ پر اس کی فکر حکم الٰہی سے ہم آہنگ ہو اور ایسے سنگین اور نازک مسائل کو لوگوں کے متضاد خواہشات اور مختلف مزاجوں کے حوالے نہیں کیا جاسکتا ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ دنیا کے نظاموں اور اسلام کے سیاسی نظام میں بنیادی امتیاز اسی نقطہ سے قائم ہوتا ہے کہ دنیا کے نظام مسئلہ قیادت کو لوگوں کی خواہشات اور ان کے اجتہادات کے حوالے کردینا چاہتے ہیں جو ان کے بس کا کام نہیں ہے اور اسلام اس کام کو خدا کے حوالے کرتا ہے تاکہ اعلم و افضل و انسب کا فیصلہ تخمینی اور فرضی نہ ہو بلکہ مکمل حزم و جزم و یقین کی بنیاد پر ہو۔

رکن دوم۔ عقیدہ و قیادت کا بنیادی رابطہ

پروردگار نے جو بھی کتاب نازل کی ہے وہ کسی بندہ پر اور جب بھی عالم بشریت کی ہدایت کی ہے تو کسی ہادی کے ذریعہ۔ اور رسالت کو ہمیشہ رسولؐ کے حوالے کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب و ہدایت و رسالت اور نمائندہ و ہادی و رسول میں ایک بنیادی ارتباط پایا جاتا ہے۔ کتاب کے بیان۔ ہدایت کی وضاحت اور رسالت کے تقاضوں پر عمل کے لئے انسان کا ہونا ضروری ہے تاکہ ابتدا و انتہا کا فاصلہ مفہوم کو الفاظ سے عمل تک پہونچانے کا فاصلہ ہو اور ایک ایسا تجربہ ہو جو رسالت و کتاب و ہدایت کے مفہوم کی عملی وضاحت کرسکے ورنہ اگر اس کے بغیر بھی مقصد کا حصول ممکن

ہوتا تو پروردگار ہر انسان کے گھر میں ایک نسخہ کتاب نازل کر دیتا اور کسی رسول و ہادی کی ضرورت نہ ہوتی۔

ہدایت و بیان و تنفیذ احکام ایک فنی عمل ہے اور اس کے لئے مخصوص مہارت درکار ہے۔ جس مہارت کا مکمل نمونہ پیغمبر اکرمؐ کی ذات گرامی تھی جو بیان اسلام کے ہر نقطہ کو مقصود الٰہی کے مطابق انجام دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہی کتاب و ہدایت و رسالت کے اعلم تھے۔ وہی کل امت سے افضل تھے اور وہی قیادت امت کے لئے انسب تھے۔ اس کے بعد جس شخص کو پیغمبرؐ حکم الٰہی کے مطابق معین کر دیں گے وہ بھی انھیں صفات کا حامل ہوگا اور عقیدہ و قیادت کے اس بنیادی ارتباط کو باقی رکھ سکے گا۔

رکن سیوم۔ الٰہی حقوقی نظام

اسلام کے سیاسی نظام میں امام یا قائد اس بات میں آزاد نہیں ہوتا ہے کہ اپنی ذاتی رائے سے عمل کر سکے۔

وہ درحقیقت ایک خدائی حقوقی نظام میں مقید ہوتا ہے اور اس کا حکم تمامتر ارادہ الٰہیہ کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے تاکہ اس کا انداز بالکل الٰہی انداز ہو اور اس کا مضمون عین حکم الٰہی ہو۔ یہ حقوقی نظام پروردگار کا بنایا ہوا ہے اور امامت یا قیادت کے دائرہ میں داخل ہونے والے ہر شخص کا فرض ہے کہ اس نظام کو منطبق کرے یہ نہ قائد کے ذہن کی پیداوار ہے اور نہ محکومین کے۔ اور اگر کسی وقت اس نظام میں قول محمدؐ کا حوالہ ملتا ہے تو وہ محمدؐ کا ذاتی قول نہیں ہے بلکہ وحی الٰہی کا ثمرہ اور تنزیل الٰہی کی تفسیر و توضیح ہے اور یہ ایک دوسرا فرق ہے دنیا کے خود ساختہ نظاموں اور اسلام کے الٰہی نظام میں۔ کہ دنیا کے نظام قوانین بناتے ہیں اور پھر محکومین کو اتباع کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ ان پر خود ان قوانین کی پابندی لازم نہیں ہوتی ہے لیکن اسلام کا حقوقی نظام ایسا خدا ساختہ نظام ہے جس کی پابندی حاکم اور محکوم دونوں پر واجب ہے۔

اس حکم کے نافذ کرنے والے حاکم کے بندے نہیں ہیں بلکہ حاکم و محکوم دونوں خدا کے بندے ہیں اور سب مل کر اس کے حکم کو نافذ کرتے ہیں کہ اس کے علاوہ کسی کو قانون سازی یا حاکمیت کا ذاتی حق نہیں ہے۔

رکن چہارم۔ محکومین کی رضامندی

دنیا کی ہر قوم ایک مثالی حقوقی نظام کی تلاش میں رہتی ہے جو اس کے عمومی اور خصوصی اہداف کی تحدید کر سکے اور وہ ایسے وسائل کی نشاندہی کرے جن سے ان اہداف و مقاصد کو حاصل کیا جا سکتا ہو اور پھر ایسی قیادت کو دریافت کر لے جو اس نظام کے دفعات کے لئے اعلم۔ قوم کے لئے افضل اور تنفید نظام کے لئے انسب ہو۔ اس کے بعد قوم ہر وقت اطاعت کے لئے آمادہ رہتی ہے۔ رب العالمین کا یہ کرم تھا کہ اس نے عالم انسانیت کو اس حیرت و پریشانی سے نکال لیا اور ایک مکمل نظام کی نشاندہی کر دی جو اس کے تمام مقاصد کی تکمیل کر سکے اور اسی کا نام اسلام تھا یعنی کتاب خدا اور قول و فعل و تقریر معصومؑ۔ اس کے بعد معبود نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اس نظام کے لئے اعلم۔ افضل اور انسب محمد مصطفیٰؐ کی ذات ہے اور ان کے انتقال کے بعد ہر وہ شخص ہے جسے وہ امر الٰہی کے مطابق معین کر دیں اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔

اس کے بعد اگر قوم نے الٰہی نظام کے اس رنگ اور اس قیادت کو قبول کر لیا تو گویا ہدایت حاصل کر لی اور اس کے گھر میں خیر و برکت وسیع دروازہ سے داخل ہو گئی کہ نظام کی تطبیق بھی ہو گئی اور حاکم سے محبّت کا حق بھی ادا ہو گیا۔

لیکن اگر قوم نے اس نظام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو پروردگار جبراً اسے خیر کی منزل کی طرف نہیں لے آئے گا بلکہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دے گا، تاکہ نافرمانی کا مزہ چکھے اور تنگیٔ حیات کا سامنا کرے کہ اس نے الٰہی قیادت کے علاوہ دوسری قیادت کو قبول کر کے عملی طور پر الٰہی قیادت کا انکار کیا ہے اور اسے ناقابلِ قبول قرار دیا ہے۔

اسلام کے سیاسی نظام کی سادگی

آپ کو یہ کیسے اندازہ ہوگا کہ آپ خدائی راستہ پر چل رہے ہیں؟۔ اس کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس سیاسی قیادت کا اتباع کر رہا ہے جسے خدا نے معین کیا ہے تو گویا وہ خدا کے ساتھ ہے ورنہ نہیں۔ مثال کے طور پر محمد مصطفیٰؐ کی محبت رکھنے والے حزب اللہ میں شامل ہیں اور ان سے دشمنی کرنے والے حزب الشیطان کے افراد ہیں چاہے وہ تمام رات نمازیں پڑھیں اور تمام زندگی روزے رکھیں۔

ولایت و موالات ہی دونوں گروہوں کے درمیان حد فاصل ہے اور یہی سلسلہ محمد مصطفیٰؐ کے بعد بھی باقی رہے گا کہ ان کے مقرر کردہ ولی سے محبت کرنے والے حزب اللہ میں ہوں گے اور ان سے الگ ہو جانے والے حزب الشیطان میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر ان کی حزبیت نفی و اثبات میں موالات و عداوت کے پیمانے میں ناپی جاتی رہے گی۔

حضرت محمد مصطفےٰؐ کی قیادت اور موالات ہی ابتدا میں مومن صادق و کاذب کے درمیان ایک میزان حق تھی کہ ایک قوم نے مساجد کی تعمیر کی۔ نماز قائم کی۔ راہ خدا میں انفاق کیا۔ رسول اکرمؐ کے ساتھ خروج نہ کرنے کی معذرت کی لیکن اس کے بعد بھی رب العالمین نے انھیں منافق قرار دے دیا کہ ان کی ولایتِ محمدؐ صحیح اور صادق نہیں ہے۔

نظریۂ عدالت صحابہ کے پیداوار کی سیاسی فضا

"فاروق" کے قتل کے بعد اسلامی امور عثمان بن عفان کے ہاتھ میں آگئے جو فطری طور سے اقربا پرست تھے اور اس کے نتیجہ میں بنی امیہ ایک کے بعد ایک ان کے گرد جمع ہونے لگے اور انھوں نے بھی ان کو جمع کرنا شروع کر دیا جس کے زیر اثر تمام بنی امیہ سرکاری آدمی اور خلیفہ کے مشیر مملکت بن گئے اور امور مملکت عملی طور پر مروان بن الحکم کے ہاتھ میں آگئے۔ اسی نے حضرت محمد بن ابی بکر جیسے افراد کے قتل کا حکم دے دیا اور خلیفہ سے مشورہ کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ خلیفہ کی مہر بھی لگا دی (جیسا کہ خود خلیفہ کا بیان ہے) اور حضرت علیؑ کے الفاظ

میں عثمان کی تلوار مروان کے ہاتھ میں آگئی۔ اب جس کی گردن پر بھی چلادے کوئی پُرسان حال نہیں ہے۔ (طبری۔ کامل وغیرہ)

مروان کیا شے ہے؛ اسے ہر شخص نہیں جانتا۔ آزاد کردہ۔ مولفۃ القلوب کی ایک فرد۔ اس کا باپ حکم بن العاص راندۂ رسول اکرمؐ جس کا حیات پیغمبرؐ میں مدینہ میں داخلہ تک حرام تھا بلکہ ابوبکر وعمر کے دور میں بھی داخلہ نہ پاسکا۔ صرف عثمان کی حکومت میں نہایت درجہ اعزاز واحترام کے ساتھ واپس لایا گیا اور اسے ایک لاکھ درہم انعام بھی دیا گیا۔

مروان کے ساتھ حکومت طلقاء کا دوسرا رکن عبداللہ بن ابی سرح والیٔ مصر بکلّ اختیارات۔

عبداللہ بن ابی سرح — وہ شخص جس نے رسول اکرمؐ پر افترا کیا اور آپ نے اس کا خون مباح کر دیا چاہے وہ غلافِ کعبہ سے کیوں نہ وابستہ ہو۔ (سیرت حلبیہ باب فتح مکہ)

اور جب عثمان روز فتح اسے معافی طلب کرنے کے لئے لائے تو حضورؐ نے سکوت فرمایا کہ شائد کوئی غیرت دار مسلمان اسے قتل کر دے۔ لیکن جب یہ مدعا حاصل نہ ہوا — تو مصلحتِ اسلام کے تحت پناہ دے دی۔

اس کے علاوہ ابوبکر کے دور کا بویا ہوا بیج "معاویہ" بھی زمین میں اپنی جڑیں مستحکم کرنے لگا اور بیس سال کے لئے شام کا حاکم بن گیا کہ عملی طور پر جو چاہے جمع کرے اور جو چاہے خرچ کرے۔

مروان طلیق۔ معاویہ طلیق۔ عبداللہ بن ابی سرح طلیق — ولید بن عقبہ طلیق (جس نے صبح کی نماز چار رکعت پڑھا دی اور کہا کہ اگر لوگوں کا ذوق بلند ہو تو مزید بھی پڑھائی جاسکتی ہے)۔ یہ سب کے سب مدرسہ ابوسفیان کے سند یافتہ — جب کہ ابوسفیان نے ایک دن عثمان کو اپنے مدرسہ سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا تھا جیسا کہ جوہری کا بیان ہے کہ عثمان کی خلافت کے بعد ابوسفیان نے کہا کہ یہ امر ایک دن بنی تیم کے ہاتھ میں تھا لیکن نہ رہ گیا۔ ایک دن بنی عدی کے ہاتھ میں آیا لیکن نہ رہ گیا۔ دیکھو اب اپنی منزل پر آگیا ہے

لہٰذا اسے گیند کی طرح نچاؤ۔

عثمان دیکھو تم پر میرے ماں باپ قربان۔ پیسہ خرچ کرو۔ میرے باپ حجر جیسے نہ ہو جانا۔ حکومت کو بنی امیہ کے درمیان اس طرح رکھنا جس طرح بچے گیند ایک دوسرے کی طرف پھینک دیتے ہیں۔ خدا کی قسم جنت و جہنم کوئی شے نہیں ہے۔ زبیر اس موقع پر موجود تھے۔ ان کا بیان ہے کہ عثمان نے یہ سُن کر کہا کہ دور ہو جاؤ۔ ابو سفیان نے کہا کہ فرزند کیا یہاں کوئی اور بھی ہے؟ تو میں نے کہا کہ میں موجود ہوں لیکن میں تمھارے راز کا افشاء نہیں کروں گا۔ (شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ۱/ ۳۰۷، ۳۲۷)

مختصر یہ ہے کہ مروان بن الحکم نے عملی طور پر یہ اعلان کر دیا کہ یہ قاتلانِ عثمان ہم سے ہمارے ملک کو چھیننا چاہتے ہیں (ابن اثیر ج ۳ مقتل عثمان) گویا کہ دورِ عثمان میں خلافت بنی امیہ کی حکومت بن گئی تھی اور ہر شہر پر کسی نہ کسی اموی طلیق کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اب اس کے بعد جو خلیفہ بھی آئے گا وہ بنی امیہ کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہو گا یا اندھیری رات میں اس راستہ پر سفر کرے گا جس میں قدم قدم پر ٹھوکریں اور سرنگیں ہوں۔

اُدھر فتوحات کے نتیجہ میں تازہ مسلمان اور حکومت سے فائدہ اٹھانے والے افراد کی تعداد میں اضافہ ہو گیا اور وہ جلیل القدر اصحاب جن کے کاندھوں پر محمدی حکومت قائم ہوئی تھی ان کی تعداد دھیرے دھیرے کم ہو گئی یہاں تک کہ بقول معاویہ کالے بیل میں سفید بال کے برابر رہ گئے اور وہ بھی مصائب کی شدت میں جیسے "سردی کی رات میں بکریاں"۔

معاویہ کو اس پوری صورت حال کا اندازہ تھا۔ چنانچہ اس نے قاتلان عثمان سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تمھاری حیثیت "سفید بیل کے کالے تل" سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

اب ساری حکومتیں اموی تھیں یا بنی امیہ کی پرستار اور معاویہ تمام احزاب کا قائد اور ہند بنت عتبہ کا فرزند پوری چکی کی مرکزی کیل۔ شام مکمل طور پر اس کے اختیار میں۔ اور پورے دائرہ حکومت کا مرکز وہ۔ اُدھر اس نے اپنے کو قتل عثمان کے بعد عثمان کا وارث بھی قرار دے لیا اور قصاص خون عثمان کا نعرہ بلند کر دیا تا کہ بنی امیہ کی حکومت کو مضبوط بنا سکے۔ ورنہ اس سے پہلے فاروق کا بھی قتل ہوا تھا اور کسی اموی کو ان کا

خون یاد نہ آیا۔

درحقیقت مسئلہ قصاص کا نہیں ہے۔ اموی حکومت کا ہے جس کا سلسلہ عملی طور پر اس دن شروع ہو گیا تھا جس دن ابوبکر نے یزید بن ابی سفیان کو حاکم بنایا تھا اور اب تو معاویہ اور بنی امیہ کا اقتدار مستحکم ہو چکا ہے اور ایک حکومت کی شکل اختیار کر چکا ہے جیسا کہ مروان نے کہا تھا کہ تم لوگ ہماری حکومت چھیننا چاہتے ہو۔

نہ قتل عثمان کوئی مسئلہ ہے اور نہ قصاص کوئی محور ہے اس لئے کہ معاویہ نے حاکم بننے کے بعد پھر قصاص کا نام بھی نہیں لیا اور خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ مسئلہ صرف حکومت و اقتدار کا ہے اور حکومت کی نگاہ میں قتل نفس محترم کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ہے۔

ورنہ مروان نے محمد بن ابی بکر اور دیگر اصحاب کے قتل کا حکم دے دیا اور کچھ نہ ہوا۔

معاویہ نے حضرمی کو قتل کرا دیا اس لئے کہ ابن زیاد نے کہہ دیا تھا کہ یہ دینِ علیؑ پر ہیں۔

معاویہ ہی نے عمرو بن الحمق جیسے عبادت گذار کو قتل کرا دیا۔

کیا معاویہ حجر بن عدی اور ان کے عبادت گذار ساتھیوں کا قاتل نہیں ہے جن کا کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علاوہ کچھ نہ تھا۔؟

کیا معاویہ نے ابن زیاد کو اس اشارہ کے ساتھ حاکم نہیں بنایا تھا کہ اللہ کے نیک بندوں کو قتل کر دے اور پھانسی پر لٹکا دے۔

معاویہ کی نظر میں بنیادی مسئلہ حکومت کا استحکام اور اپنے آباء و اجداد اور برادران کے خون کا بدلہ لینا تھا۔

معاویہ نے جمل کے معرکہ کو بھی ایک بہترین موقع شمار کیا تھا اور طلحہ و زبیر و عائشہ کو ورغلانا شروع کیا تھا اور طلحہ و زبیر سے بصرہ و کوفہ کی حکومت کا بھی وعدہ کر لیا تھا لیکن جب عائشہ کو کامیابی نہ ہو سکی تو خود میدان کارزار گرم کر دیا۔

(شیخ المضیرہ ص ۱۷۴-۱۷۵)

استاذ عباس محمود العقاد نے اپنی کتاب "معاویہ فی المیزان" میں یہ تجزیہ کیا

ہے کہ معاویہ کے پاس ایک بہترین ذریعہ تھا جسے اس نے بار بار استعمال کیا اور اس میں مہارت پیدا کر لی اور اپنے تمام مسلمان اور غیر مسلمان حریفوں کے مقابلہ میں اسی ذریعہ کو استعمال کیا اور وہ تھا مسلسل قوم میں تفرقہ پیدا کرنا اور مخالفین کے درمیان شبہات ایجاد کر کے عداوتوں کو بیدار کرنا۔

معاویہ اس امر کو برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ دو آدمی ایک مقام پر جمع ہو جائیں اور انسان کا فطری جذبۂ برتری ہمیشہ اسے کمک بہم پہونچاتا رہتا تھا۔

(معاویہ فی المیزان ص ۶۴-۶۵)

معاویہ اسی لائن پر چلتا رہا جس پر چلنے کے لئے زیادہ فکر و نظر کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے بس میں ہوتا کہ حکومت کے ہر باشندہ کو ایک مستقل گروہ بنا دے تو اس سے بھی دریغ نہ کرتا۔

تاریخ معاویہ کا صحیح محاسبہ کرتی تو اس کا لقب "مفرق الجماعات" کے علاوہ کچھ نہ ہوتا لیکن عبرتناک بات یہ ہے کہ مورخین نے افراد اور اعمال کے محاسبہ کے نئے اصول ایجاد کر کے معاویہ کے دور حکومت کو "عام الجماعۃ" اجتماع کا سال قرار دے دیا۔ اس لئے کہ اس نے امت کو منتشر کیا ہے اور وہ اتفاق و اتحاد کے کسی وسیلہ سے باخبر نہیں ہے اور ایسا نظام ایجاد کر دیا ہے کہ اس کے بعد بھی نسلیں تفرقہ ہی پیدا کرتی رہینگی۔

(نظام الحکم للقاسمی)

معاویہ نے بسر بن ابی ارطاۃ کو مدینہ بھیج کر اہل مدینہ کو دہشت زدہ کر دیا اور انھیں ذلیل بھی کر دیا۔ (شیخ المضیرہ ص ۱۸۷-۱۸۸)

معاویہ نے بیعت قتل و غارت، تباہی و بربادی۔ آتش زنی اور تفرقہ پردازی کے ذریعہ حاصل کی ہے۔

اصحاب رسولؐ کو گالیاں دی ہیں۔

مال مسلمین پر ناجائز قبضہ کیا ہے۔

۲۰ سالہ حکومت کے دوران صرف اپنے اقتدار کو مضبوط کیا ہے اور بیت المال

کو اس کے جائز مصرف سے نکال کر اسی راہ میں صَرف کیا ہے۔

اور ان سب کے علاوہ ایک مستقل وظیفہ "رزق بیعت" کے نام سے ایجاد کیا ہے جو صرف اس شخص کو دیا جائے گا جو اس کے معین کردہ نئے خلیفہ کی بیعت کرے گا۔

اعلان کردہ مقصد سے تغافل

معاویہ نے قانونی خلیفۃ المسلمین سے بغاوت کی اور قاتلانِ عثمان سے بدلہ لینے کا اعلان کیا۔ ادھر ام المومنین عائشہ نے بھی یہی کاروبار کیا لیکن جب معاویہ کے ہاتھ میں حکومت آگئی اور اس نے ریاست مسلمین پر قبضہ کر لیا تو اس مقصد کو یکسر نظر انداز کر دیا اور کسی قاتل عثمان کو سزا نہیں دی۔ حد یہ ہے کہ ام المومنین نے بھی اس کے خلاف خروج نہیں فرمایا اور نہ اس سے قاتلانِ عثمان کو سزا دینے کا مطالبہ کیا۔

غفلت سے بیداری

معاویہ کے لئے حالات سازگار ہو گئے اور وہ خلیفۃ المسلمین اور پیغمبرؐ کا جانشین ہو گیا حالانکہ وہ طلیق بن طلیق تھا۔ اس نے اور اس کے باپ نے ہر محاذ پر اسلام سے جنگ کی تھی اور آخر میں مجبور ہو کر اسلام قبول کر لیا تھا۔

اب یہ حادثہ کیسے ہوا؟

حق کس طرح شکست خوردہ ہو گیا؟

موخر کس طرح مقدم بن گیا؟

طلیق کس طرح مہاجر سے افضل ہو گیا؟

اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کا محاصرہ کرنے والا کس طرح محاصرہ کی زحمتیں برداشت کرنے والے بہتر ہو گیا؟ اور کس طرح قانون کی شکست اور طاقت کی فتح کے سال کا نام "عام الجماعۃ" ہو گیا۔؟

یہ وہ سوالات تھے جنھوں نے صادقین کو حیرت زدہ کر دیا تھا اور وہ اپنے سکوت پر نادم تھے لیکن اب وقت گذر چکا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ لوگ گہری نیند میں تھے اور اب دہشت ناک خواب دیکھ کر چونک پڑے ہیں۔ لیکن جب آنکھ کھلی ہے تو محسوس ہو رہا ہے کہ خواب واقعتاً بڑا دہشت ناک تھا۔

واقعات کے خدمت گذار نظریات

اس کے بعد لوگ واقعات کی تحلیل میں مصروف ہو گئے اور نئے نئے نظریات و خیالات ایجاد ہونے لگے۔

کسی نے تصوف کا راستہ ایجاد کیا۔

کسی نے مرجۂ کا مذہب ایجاد کیا۔

کسی نے جبر کے عقیدہ کی پناہ لی اور کسی نے عدالت صحابہ کے عقیدہ کا ڈھونگ رچایا۔

بنی امیہ اور ان کے ہوا خواہ ان تمام نظریات و افکار کی پشت پناہی کر رہے تھے اور انھیں بہترین اسلحہ قرار دے رہے تھے جس کے ذریعہ اموی اقتدار کی خدمت کی جا سکتی ہے اور مخالفین میں انتشار و تفرقہ پیدا کیا جا سکتا ہے تاکہ اموی حکومت کی جڑیں مضبوط ہو جائیں اور اسے قانونی جواز حاصل ہو جائے۔

فصل سوم

نظریۂ عدالت صحابہ کی غرض و غایت

ا۔ توجیہ و تاویل

ا۔ غاصبانہ حکومت کی توجیہ

معاویہ طلیق۔ فرزند طلیق اور مولفۃ القلوب میں تھا۔ اس نے دیکھا کہ میں حکومت اسلامیہ کا رئیس، بادشاہ، منصب خلافت کا ذمہ دار اور رسمی طور پر خلیفۂ رسول ہوں اور یہ بات غیر معقول بھی ہے اور نا قابل قبول بھی ہے۔

کوئی عقلی، شرعی اور عرفی قانون اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ بھلا جس کا باپ رئیس کفار رہا ہو۔ جس نے ہر معرکہ میں اسلام کے خلاف جنگ کی ہو اور ہر طرح سے اسلام سے مقابلہ کیا ہو یہاں تک کہ مجبور ہو کر کلمہ پڑھ لیا ہو وہ یکبارگی تمام سابقن فی الاسلام پر مقدم ہو جائے اور جن کے کاندھوں پر اسلام قائم ہوا ہے انھیں اس کا محکوم بنا دیا جائے۔

یہ بات کس طرح معقول ہے۔؟ اس کے لئے یقیناً کوئی جواز درکار ہے اور جواز کے لئے بہترین ذریعہ عدالت صحابہ کا عقیدہ ہے کہ معاویہ اور اس کے تمام ہوا خواہ ہر اعتبار سے صحابی ہیں اور صحابی عادل اور جنتی ہوتا ہے۔ اس کا جہنم میں جانا نا ممکن ہے۔ صحابہ کے درمیان کوئی فرق بھی نہیں ہے کہ سب ہی عادل اور سب ہی اصحاب ہیں لہٰذا اس میں کیا عیب ہے کہ معاویہ ولی امر مسلمین ہو جائے اور اس کے مخلصین کے لئے کیا چیز مانع ہے کہ اس کی اطاعت شروع کر دیں اور اس کے مخلصین میں شامل ہو جائیں کہ وہ سب بھی عادل۔ صحابی اور جنتی ہیں۔ گویا کہ صحابیت اور عدالت کی چادر اس قدر وسیع ہے کہ اس میں معاویہ کی سلطنت بھی

شامل ہو سکتی ہے اور اس ڈھیلے ڈھالے جبہ نے ثابت کر دیا ہے کہ معاویہ سے زیادہ کوئی ہوشیار اور چالاک نہیں ہے۔

ب۔ معاویہ اور اس کے مخلصین کے اعمال کی توجیہ

معاویہ اور اس کے مخلصین نے اسلام اور مسلمین پر جو مصائب ڈھائے ہیں۔ وہ بے حساب اور بے مثال ہیں۔

ایک بسر بن ابی ارطاۃ کے مظالم وہ ہیں جن سے آسمان چیخ اٹھے اور انسانوں کے دل خون ہو جائیں۔

ایک واقعہ حرہ میں مسلم بن عقبہ کے وہ مظالم ہیں کہ جن کے بعد کوئی بدری صحابی باقی نہ رہ گیا اور قریش وانصار کے سات سو افراد تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے اور موالی و دیگر عرب میں دس ہزار افراد کا خون بہا دیا گیا۔ اب تو بسر بن ارطاۃ کے لئے یہ بھی آسان ہے کہ عبید اللہ بن عباس کے کمسن بچوں کو ماں کی گود سے کھینچ کر چیر کر پھینک دے۔

خود معاویہ کے حضرت علیؑ کے ساتھ معرکے کیا کم ہیں اور اس کے جرائم کے لئے آل محمدؐ کی مکمل تباہی و بربادی ہی کیا کم ہے کہ اس نے امام حسنؑ اور عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید کو زہر بھی دے دیا۔ (استیعاب حالات عبد الرحمٰن)

عبد الرحمٰن بن ابی بکر کو زہر سے قتل کرا دیا۔ (استیعاب)

مالک ابن اشتر کو بھی زہر دلوا دیا اور عمرو بن العاص نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ خدا کے بعض لشکر شہد کے اندر بھی پائے جاتے ہیں۔

معاویہ نے امت اسلامیہ میں وہ تفرقہ پیدا کیا ہے کہ بقول عقاد اب امت متحد بھی ہونا چاہے تو نہیں ہو سکتی ہے۔ اور اسلام کے چہرہ کو اس قدر بدنما بنا دیا ہے کہ بقول احمد امین اس کی حکومت ہرگز اسلامی نہیں تھی۔

ایسے وحشیانہ اعمال اور جرائم کی کوئی تاویل نظریہ عدالت صحابہ کے علاوہ ممکن نہیں ہے کہ معاویہ اور اس کے اصحاب کو صحابہ میں شمار کر کے عادل۔ جنتی اور پاکباز

بنا دیا جائے اور یہ کہا جائے کہ صحابی کے یہاں خطا کا امکان نہیں ہے اور اگر خطا کا امکان ہوتا تو حضورؐ انھیں جنتی نہ قرار دیتے کہ حضور وحی خداوندی کے بغیر کلام بھی نہیں کرتے ہیں۔

معاویہ ایک صحابی مجتہد ہے اور مجتہد سے خطا بھی ہو جائے تو ایک اجر تو بہر حال مل جاتا ہے ورنہ دُہرا اجر کہیں دور نہیں ہے۔ معاویہ اپنی صلح و جنگ، ہجوم و دفاع دونوں میں حق بجانب ہے۔ اس لئے کہ صحابی ہے اور صحابی عادل ہوتا ہے۔ (انا للہ ۔۔۔)

۲۔ تنقید، سبّ وشتم اور تنقیص سے تحفظ

نظریہ عدالت صحابہ ایک طرف معاویہ کی غاصبانہ حکومت اس کے اور اس کے اصحاب کی اعمال کی مکمل توجیہ فراہم کرتا ہے اور دوسری طرف اسے تعمیری تنقید سے بھی بچالیتا ہے اور ہر طرح کی تنقیص سے محفوظ کر لیتا ہے کہ معاویہ صحابی ہے؟ اور صحابی عادل ہوتا ہے؟ اور جو بھی صحابی پر تنقید یا اس کی تنقیص کرے گا وہ زندیق۔ قابل مقاطعہ اور گمراہ ہوگا۔ چہ جائیکہ صحابی اگر رئیس حکومت بھی ہو۔ اس کی تنقید تو بالکل ہی اس قابل ہے کہ زندگی میں اس کا بائیکاٹ کر دیا جائے اور مرنے کے بعد نماز جنازہ بھی نہ پڑھی جائے۔

(میزان الاعتدال ذہبی)

۳۔ معاویہ کے دشمنوں اور دوستوں کے معرکے

نظریہ عدالت صحابہ ایسے ہر معرکہ میں معاویہ کو کامیابی کی ضمانت فراہم کر دیتا ہے اور کم سے کم اسے حریف کے برابر لا کر کھڑا کر دیتا ہے کہ اگر آلِ محمدؐ یہ کہیں کہ ہم وہ ہیں جن سے خدا نے ہر رجس کو دور رکھا ہے اور ہمیں کمال طہارت کی منزل پر فائز کیا ہے تو معاویہ کی طرف سے فوراً آواز بلند ہوگی کہ ہم صحابہ کرام اور عادل ہیں۔ ہم سے غلطی نہیں ہو سکتی ہے۔ ہم جنتی ہیں اور ہم پر جہنم حرام ہے۔!

اگر آلِ محمدؐ یہ دعویٰ کریں کہ "ہمارا دشمن خدا کا دشمن ہے"۔ تو معاویہ کے اصحاب کہیں گے کہ "ہم صحابہ ہیں اور حضورؐ نے ہمارے بارے میں بھی فرما دیا ہے کہ "جو کسی

صحابی کو اذیت دے اس نے مجھے اذیت دی ہے"۔ اور اس طرح حق و باطل۔ نیک و بد، مطیع و عاصی سب برابر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ (دعلی الاسلام بعدہ السلام)

۴۔ تفریق بین المسلمین

اگر معاویہ اور اس کے اصحاب نظریہ عدالت صحابہ کو اس وسعت کے ساتھ رائج کرنے میں کامیاب ہو گئے، تو اس کا قہری نتیجہ یہ ہو گا کہ امت دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ کچھ لوگ اس نظریہ کے طرفدار ہوں گے اور کچھ مخالف۔ اور اس طرح دونوں میں معرکہ آرائی۔ تعصب اور افتراق شروع ہو جائے گا اور انتشار اپنے پنجے گاڑ دے گا۔ دونوں فریق اپنے نظریات کو ثابت کریں گے اور بعد میں آنے والی نسلیں پھر دو حصوں میں تقسیم ہو جائیں گی اور سب کا خیال یہی ہو گا کہ ہم حق کی طرف سے دفاع کر رہے ہیں۔ نہ موید ین یہ کہیں گے کہ معاویہ کی تائید کر رہے ہیں اور نہ مخالفین کو معاویہ کا مخالف شمار کیا جائے گا۔ موید ین صحابہ کے موید کہے جائیں گے اور مخالفین صحابیت کے مخالف کہے جائیں گے اور اس طرح معاویہ خاموش تماشائی بنا رہے گا اور مسلمان صحابیت کی عظمت کے گرد معرکہ آرائی میں مصروف رہیں گے۔

معاویہ کی اسی چالاکی کی طرف عقاد نے اپنی کتاب "معاویہ فی المیزان" میں اشارہ کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ معاویہ اپنے مختلف فنون کے باعث معرکہ سے الگ ہو کر تماشائی بن گیا بلکہ ثالث بننے کے لئے بھی تیار ہو گیا۔

نظریۂ عدالتِ صحابہ کی ایجاد

ابن عرفہ نفطویہ۔ جن کا شمار اکابر محدثین میں ہوتا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ فضائل صحابہ کی بیشتر روایتیں بنی امیہ کے دور کی پیداوار ہیں جن کا مقصد بنی امیہ سے تقرب اور بخیال خود بنی ہاشم کی ناک رگڑ دینا تھا۔ یہ روایتیں اس انداز سے مرتب کی گئیں کہ ہر صحابی تمام روئے زمین کے لئے نمونۂ عمل بن جائے اور تمام لعنتوں

کا مرکز وہ شخص ہو جو ان کے بارے میں کسی طرح کی تنقید یا تنقیص کرے۔

(آراء علماء المسلمین فی التقیہ والصحابہ وصیانۃ القرآن الکریم ص ۸۵)

محققین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ روایت کا سلسلہ عثمان کے دور حکومت کے اواخر سے شروع ہوا ہے۔ اس کے بعد اس کا دائرہ اس وقت وسیع تر ہو گیا جب لوگوں کی توقع کے خلاف حضرت علیؑ خلیفہ ہو گئے اور مسلمانوں نے ان کی بیعت کر لی۔

بیعت کے دائرہ کی وسعت کے ساتھ ساتھ شیطنت نے بھی سر ابھارا۔ اور بنی امیہ کو خلافت چھیننے کا خیال پیدا ہو گیا۔ حوادث کا سلسلہ دراز تر ہو گیا اور بہت سے لوگوں نے چوتھے خلیفہ کی بیعت کرنے کے بعد بیعت توڑ دی اور جنگوں کا وہ سلسلہ شروع ہو گیا جس نے بالآخر حکومت کو بنی امیہ کے گھر پہونچا دیا۔

یہ اور بات ہے کہ امت کا اجتماع منتشر ہو گیا۔ اتحاد کی رسّی ٹوٹ گئی۔ خلافت کے بارے میں مذاہب کا اختلاف وسیع تر ہو گیا اور ہر فریق نے قول و عمل سے دوسرے فریق کے مقابلہ میں اپنے موقف کی تائید کا انتظام کرنا شروع کر دیا اور اس طرح روایت سازی اور بیجا تاویل اور اس کے نتیجہ میں غلو اور افتراق کی بنیاد پڑ گئی۔

اسلام کے لئے اس سے بڑا کوئی حادثہ نہیں تھا کہ اس کے ماننے والوں ہی نے بدعتیں شروع کر دیں اور غالیوں نے اس کے بارے میں افترا پردازی کا کاروبار جاری کر دیا۔ مسلمانوں کی عقلیں فاسد ہو گئیں اور دیگر اقوام کے سامنے دین کی بنیادیں بدنام ہو گئیں۔

امت کا جھوٹ اور افترا پردازی سے سب سے بڑا امتحان بنی امیہ کے دور حکومت میں ہوا جہاں ناقلین کی کثرت ہو گئی اور صادقین کی قلت ہو گئی اور اکثر محترم اصحاب نے معتبر افراد کے علاوہ دوسروں سے روایت کرنا ہی بند کر دیا۔

(مقدمہ محمد عبدہ بر رسالۃ التوحید ص ۷-۸، شیخ المضیرہ ص ۲۰۱-۲۰۳)

علامہ محمد عبدہ کا بیان ہے کہ معاویہ نے اپنے حق میں ایک کاروبار یہ شروع کیا کہ صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت اس کام کے لئے تیار کر دی کہ وہ حضرت علیؑ کے

بارے میں ایسی قبیح روایتیں تیار کریں جن سے ان کی شخصیت مجروح ہو جائے اور لوگ ان سے بیزاری اختیار کرنے لگیں ۔ اور اس سلسلہ میں ایسے ایسے انعامات رکھ دئے کہ ہر آدمی کی رال ٹپک جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسب منشار روایتیں تیار ہوئیں اور ابوہریرہ نے اس جماعت کی سرپرستی کا کام انجام دیا۔ (شیخ المضیرہ ص ۲۰۱ - ۲۰۲)

ڈاکٹر احمد امین نے ضحی الاسلام میں بیان کیا ہے کہ "اس مقام پر مناسب ہے کہ اس حقیقت کا تذکرہ کر دیا جائے کہ بنی امیہ نے خود روایتیں تیار کیں یا لوگوں نے ان کے حق میں روایتیں وضع کیں جن کا مقصد مختلف جہات سے ان کی سیاست کی تائید کرنا تھا۔

(ضحی الاسلام ۲/۱۲۳ - شیخ المضیرہ)

معاویہ نے ایک صحابی سمرہ بن جندب کو پانچ لاکھ درہم دئے تاکہ وہ پیغمبر کے نام سے یہ روایت بیان کرے کہ "من الناس من یعجبك قوله ...." کی آیت حضرت علیؑ کی شان میں ہے اور "من الناس من یشری ...." کی آیت ان کے قاتل ابن ملجم کے بارے میں ہے اس لئے کہ اس نے حضرت علیؑ کو قتل کیا ہے۔

راویان احادیث

معاویہ کے اصحاب و اتباع میں صرف ایک ابوہریرہ الدوسی نے ۵۳۷۴ حدیثیں بیان کی ہیں جن میں سے ۴۴۶ حدیثیں حضرت بخاری نے اپنی صحیح میں درج کی ہیں جب کہ ابوہریرہ کا کل دور صحابیت سال ڈیڑھ سال سے زیادہ نہیں تھا اور وہ کبار صحابہ جو روز بعثت سے آخر حیات تک حضور کے ساتھ رہے ان سے سو روایتوں سے زیادہ نقل نہیں کی گئیں جب کہ ان میں ابوبکر۔ عمر۔ عثمان علیؑ۔ عبد الرحمٰن بن عوف، طلحہ بن عبید اللہ۔ معاذ بن جبل، سلمان، زید بن ثابت، ابی بن کعب وغیرہ جیسے افراد بھی شامل ہیں۔ (فاعتبروا یا اولی الابصار)

فضائل معاویہ

علامہ شوکانی نے اپنی کتاب "الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ" میں تحریر فرمایا

ہے کہ معاویہ کے فضائل میں ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے۔

ابن الجوزی نے معاویہ کے بارے میں وارد ہونے والی حدیثوں کو موضوعات کے ذیل میں ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ امام بخاری کے شیخ اسحٰق بن راہویہ کا بیان ہے کہ معاویہ کے فضائل میں ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے۔

فضائل معاویہ کے بارے میں ا

فضائل معاویہ کے بارے میں امام نسائی کا قصہ مشہور ہے جس کے بارے میں دار قطنی کا بیان ہے کہ امام نسائی حج کے لئے وطن سے برآمد ہوئے اور شام میں ایک سخت امتحان سے گذرے جس کے بعد شہید ہو گئے۔ بات صرف یہ تھی کہ لوگوں نے ان سے فضائل معاویہ کے بارے میں سوال کر لیا اور انھوں نے فرمایا کہ کیا مساوات کافی نہ تھی کہ اب فضیلت کے بارے میں دریافت کیا جا رہا ہے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ اس قدر دھکے دئے گئے کہ مسجد سے باہر پہونچ گئے۔

امام شافعی کی رائے معاویہ کے بارے میں

ابوالفداء نے امام شافعی سے روایت کی ہے کہ انھوں نے ربیع سے رازدارانہ انداز سے فرمایا کہ صحابیوں میں چار آدمیوں کی روایت قبول نہ کی جائے۔ معاویہ۔ عمرو بن العاص۔ مغیرہ۔ زیاد۔ (طبری حوادث ۵۱ھ۔ ابن اثیر ۲ ص ۲۰۲-۲۰۹، ابن عساکر ۲/۳۷۹، شیخ المغیرہ ۱۸۵)

اور شاید یہی راز تھا کہ جب معین سے امام شافعی کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ معتبر نہیں تھے۔

حسن بصری کا ارشاد

طبری نے حسن بصری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ معاویہ میں چار ایسی خصلتیں تھیں کہ کسی انسان میں ایک بھی ہوتی تو وہ ہلاک ہو جاتا۔

ا۔ امت پر احمقوں کے ذریعہ قبضہ کرنا اور بغیر صحابہ کرام اور اصحاب فضیلت کے مشورہ

کے امور کا انجام دینا۔

۲۔ اپنے شرابی ونشہ باز بیٹے کی خلافت جس کا کام ریشم پہننا اور گانے باجے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

۳۔ زیاد کو فرزندی میں شامل کر لینا جب کہ سرکار دو عالمؐ کا واضح اعلان ہے کہ بیٹا صاحب فراش کا ہوتا ہے اور زناکار کا حصہ صرف پتھر ہیں۔

۴۔ حجر بن عدی اور ان کے اصحاب کا قتل۔ خدا اس معاویہ کا برا کرے۔

نظریۂ عدالت صحابہ پر اموی چھاپ

اگرچہ اس نظریہ کی رو سے تمام صحابہ عادل ہیں اور آل محمدؐ کی تنقید وتنقیص بھی صحابی ہونے کی رو سے حرام ہے۔ لیکن باغی گروہ کے قائد معاویہ نے حضرت علیؑ کے خلاف وہی موقف اختیار کیا جو رسول اکرمؐ کے مقابلہ میں ابوسفیان کا تھا۔

اس کے بعد یزید کا دور آیا۔ اس نے امام حسینؑ کے خلاف وہی موقف اختیار کیا جو اس کے جد کا رسول اکرمؐ کے خلاف اور باپ کا حضرت علیؑ کے خلاف تھا۔

معاویہ نے حکومت پانے کے بعد پہلا کام یہ انجام دیا کہ تمام عمال مملکت کو حکم دے دیا کہ نمازوں اور منبروں پر حضرت علیؑ کو برا بھلا کہا جائے اور اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ایک عادت بن گئی کہ شام میں ہر مجلس وعظ کا خاتمہ سب وشتم علیؑ پر ہو اور محبان علیؑ میں سے کسی کی شہادت تسلیم نہ کی جائے اور دیوان وظائف سے ان کے نام کاٹ دیئے جائیں اور ان کے عطایا وارزاق بند کر دیئے جائیں۔

(شیخ المضیرہ ص ۱۸۰، ابن عساکر ۴۰۷/۳)

"معاویہ فی المیزان"، میں استاذ عقاد کا بیان ہے کہ "اگر اس دور کی خبروں میں صرف حضرت علیؑ پر لعنت کی خبر سچی ثابت ہو جائے تو ترازو کے دونوں پلوں میں ایک کی ترجیح کے لئے کافی ہے۔" اور معاویہ کی حقیقت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

فصل چہارم

نظریۂ عدالتِ صحابہ کی فقہی جڑیں

نظریۂ عدالت صحابہ کے ایجاد کرنے والوں نے اسے ایک ایسے سانچہ میں ڈھالا ہے جس کے ذریعہ اپنے ماضی، حال، مستقبل تینوں کو محفوظ بنا لیا ہے اور ہر دور کو ایک شرعی حیثیت عنایت کر دی ہے اور ہر زمانہ کے لئے ایک ایسا لباس تیار کر لیا ہے جو دنیا کے ہر سرد و گرم سے محفوظ رکھ سکے۔

۱۔ نہ نزدیک یا دور سے ان کی شخصیت پر کوئی حملہ ہو سکے۔

۲۔ نہ ان کے قانون اسلام سے نزدیک یا دور ہونے پر کوئی اثر پڑ سکے۔

۳۔ نہ ان کے مخالفین کے کیمپ میں اختلاف پیدا کرنے میں کوئی کسر باقی رہ سکے۔

۴۔ نہ مخالفین کو شک، حیرت یا اضطراب میں غرق کر دینے میں کوئی زحمت پیدا ہو سکے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ نظریہ دور حاضر میں اس کے مویدین اور عاشقین کے درمیان پیغمبر اسلامؐ اور ان کے اصحاب سے عشق و محبت کی علامت بن گیا ہے اور وہ نظریہ کے ایجاد کرنے والوں کے بدلے خود اپنی ذمہ محسوس کرتے ہیں کہ نظریہ کا دفاع کریں اور گویا یہ ذمہ داری موجد افراد کے بدلے موید حضرات کی ہے۔

حالانکہ جو حضرات اس نظریہ کی اصلاح و ترمیم چاہتے ہیں وہ بھی محبت رسولؐ و اصحاب رسول میں مویدین سے کم نہیں ہیں۔ صرف ان کا مطالبہ یہ ہے کہ محبت کے اخلاص اور معیاری ہونے کے لئے اس کا عقلی اور شرعی قواعد سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے تاکہ محبت اسلام کے دائرہ میں رہے اور انسان اس اندھی تقلید اور تعصب سے نجات حاصل کر سکے جس نے عقل کو معطل بنا دیا ہے اور اس تعمیری گفتگو کے دروازے

بند کردئے ہیں جو اللہ کے نیک بندوں کے امتیازات و خصوصیات میں شامل ہے۔

فقہی مرجعیت

نظریہ کی سیاسی بنیادوں کی تلاش میں ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ صحابہ کے فضائل کی بیشتر روایات بنی امیہ کے دور میں پیدا ہوئی ہیں اور ان کا مقصد حکومت سے تقرّب اور بنی ہاشم کی پامالی کے علاوہ کچھ نہ تھا جیسا کہ ابن عرفہ نے بیان کیا ہے اور اسی ذیل میں یہ بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ محققین کی نظر میں وضع احادیث کا سلسلہ عثمانی دور خلافت کے اواخر سے شروع ہو گیا تھا۔ اس کے بعد حضرت علی کی بیعت تک یہ سلسلہ وسیع تر ہو گیا اور اب ہر مسلمان کے بیعت کرنے کے بعد شیطان ایک نیا شوشہ چھوڑ دیتا ہے کہ ایک نئی حدیث ایجاد کی جائے جس سے علیؑ سے خلافت کو چھینا جا سکے اور بنی امیہ کے موقف کی توجیہ کی جا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اموی حکام نے وضع احادیث کا کاروبار کرنے والوں کے لئے ایسے ایسے انعامات کا اعلان کر دیا جس کے بعد ہر شخص کے منہ میں پانی کا آجانا لازمی تھا۔ (تاریخ محمد عبدہ ۲/ ۴۷۳، شیخ المضیرہ ص ۲۰۱-۲۰۲)

مصیبت یہ ہوئی کہ یہ تمام جعلی روایتیں ان روایات کے پہلو بہ پہلو باقی رہ گئیں جنھیں واقعاً عادل اور معتبر صحابہ نے نقل کیا تھا اور دونوں ہی جمہور کے نزدیک فقہی مسائل کا مدرک بن گئیں۔ اگرچہ اہل مذاہب کے نزدیک فقہی مسالک اور اصول میں بہت کچھ اختلافات تھے لیکن اس مسئلہ پر سب کا اتفاق ہو گیا۔

دوہرے مدرک

جن حضرات نے ہر صحابی کو عادل تسلیم کیا تھا انھوں نے ثقہ اصحاب کے روایات کے ساتھ ان روایات کو بھی فقہی مدرک قرار دیدیا جو دور فتنہ و فساد کی ایجاد تھیں اور جنھیں آخری شکل بنی امیہ کے دور حکومت میں حاصل ہوئی تھی۔ ان حضرات نے صحابی اور صحابی کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا اور سب کو عادل، جنتی اور غلط بیانی

سے دور تسلیم کر کے اس کی روایت کو مدرک بنا لیا اور اس طرح تمام صحابہ مدرک شریعت بن گئے۔ یہی وہ حضرات ہیں جن کو اہلسنت کہا جاتا ہے جن کے دین کا دارومدار صحابہ کرام پر ہے چاہے وہ جس قسم کے اور جس قماش کے صحابہ ہوں۔

ظاہر ہے کہ جن صحابہ کو اموی دار الحکومت میں تقرب حاصل ہو گیا انکی روایتیں بھی زیادہ محفوظ رہ گئیں جیسا کہ ابو محمد بن حزم نے بیان کیا ہے کہ ابو عبدالرحمٰن بن مخلد اندلسی کی مسند میں ۵۳۷۴ حدیثیں صرف ابوہریرہ سے نقل کی گئی ہیں اور امام بخاری نے اس میں سے ۴۴۶ کو اپنے یہاں درج کیا ہے اور یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ ابوہریرہ معاویہ کے دربار میں اقرب مقربین تھا جب کہ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں صرف ایک یا ڈیڑھ سال زندگی گذاری ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جس حدیث کو کسی بھی صحابی نے نقل کیا ہے وہ محترم اور محفوظ ہے اور اہلسنت کے عقیدہ میں دین کا جزء اور مدرک ہے۔ اس لئے کہ راوی صحابی ہے اور صحابی عادل اور جنتی ہوتا ہے اور جھوٹ نہیں بولتا ہے۔ البتہ صحابی کے اعتبار کے لئے یہ بہر حال ضروری ہے کہ شیعیان علیؑ اور محبانِ اہلِ بیتؑ میں نہ ہو ورنہ بنیادی طور پر اس کا اعتبار ختم ہو جائے گا۔

یحیٰی بن معین نے جب سعید بن خالد البجلی کو ثقہ قرار دیا تو لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ تو شیعی ہے ـــــ فرمایا شیعی ہے اور ثقہ۔ اور اہلسنت جیسا لقب پہلی صدی کے اواخر تک کہیں موجود نہ تھا۔ یہ بعد کے حادثات کی پیداوار ہے اور خود بھی ایک حادثہ ہے۔ (آراء علماء المسلمین ص ۹۲، اضواء علی السنۃ المحمدیہ ص ۳۴۱-۳۴۴)

صحابہ کی مرجعیت کی شرعی سند؟

اہلسنت کا بیان ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ "میرے اصحاب ستاروں جیسے ہیں کہ جس کی بھی اقتدا کر لوگے ہدایت پا جاؤ گے"۔

ابن تیمیہ جو جمہور کے نزدیک شیخ الاسلام ہیں اور ذاتی طور پر شیخ الحنابلہ ہیں۔

ان کا بیان ہے کہ اصحابی کالنجوم کی روایت کو ائمہ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے لہٰذا اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ (حجۃ المنتقیٰ للذہبی ص ۱۵۱)
یہ حدیث بالاجماع باطل ہے۔ (آراء علماء المسلمین ص ۹۲، اضواء علی السنۃ المحمدیہ ص ۱۴۳-۳۴۴-۸۹)

اہل تشیع کے مرجع اہلبیتؑ اور اصحاب معتبر

جس طرح اہلسنت نے تمام اصحاب کو بالعموم اپنے دین کا مرجع قرار دیا ہے۔ اسی طرح اہل تشیع نے بھی اہلبیت علیہم السلام اور معتبر اصحاب کے روایات پر اعتماد کیا ہے اور اہلبیتؑ نے ان تمام تعلیمات، اصول، فقہ سب کو ہر مرحلہ پر اپنے جد امیر المومنینؑ سے وراثۃً حاصل کیا ہے جنھیں رسول اکرمؐ نے باب مدینۃ العلم قرار دیا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ جسے شہر میں آنا ہے وہ دروازہ پر آئے۔
اس مرجعیت کے مستقل اصول ہیں جن کی طرف اہلبیت اطہارؑ یوں اشارہ کیا کرتے تھے کہ "ہماری حدیث ہمارے پدر بزرگوار، جد نامدار اور رسول اکرمؐ کی حدیث ہے اور حدیث رسولؐ درحقیقت قول پروردگار ہے۔ (آراء علماء المسلمین ص ۸۹)

مرجعیت اہلبیتؑ کی شرعی سند

اس مرجعیت کی شرعی سند وہ قطعی نصوص اور بیانات ہیں جو قرآن کریم اور سنت مطہرہ (قول و فعل و تقریر رسول اکرمؐ) میں وارد ہوئے ہیں اور فریقین کے درمیان متفق علیہ ہیں۔
ائمہ اہلبیتؑ نص قرآنی کی بنا پر وہ افراد ہیں جن سے ارادۂ الٰہی نے ہر رجس کو دور رکھا ہے اور انھیں حق طہارت کے درجہ پر فائز کیا ہے۔ (تفسیر آیۂ تطہیر در فتح القدیر شوکانی۔ تفسیر ابن کثیر۔ تفسیر طبری۔ تفسیر خازن وغیرہ)
اور نص رسولؐ کی بنا پر ثقلین کی ایک فرد ہیں جن میں ثقل اکبر قرآن مجید ہے

اور ہدایت ان دونوں کے بغیر ناممکن ہے۔ (صحیح ترمذی ۵/ ۳۲۸، نظم درر السمطین زرندی حنفی ص ۲۳۲، ینابیع المودۃ ص ۳۳، ۴۵، ۴۴۵۔ کنز العمال متقی ہندی ۱/ ۱۵۳، تفسیر ابن کثیر ۴/ ۱۱۳، مصابیح السنہ ص ۲۰۶، جامع الاصول ابن اثیر ص ۱۲۷، مشکوٰۃ المصابیح ۳/ ۲۵۸، احیاء المیت سیوطی برحاشیہ اتحاف ص ۱۱۴، فتح الکبیر نبہانی ۱/ ۵۰۳، ۲/ ۲۸۵، درمنثور سیوطی ۶/ ۷، ۳۰۶، صواعق محرقہ ص ۱۴۷، معجم صغیر طبرانی ۱/ ۱۳۵، منتخب تاریخ ابن عساکر ۵/ ۴۳۶، مقتل الحسین خوارزمی ۱/ ۱۰۴، طبقات کبریٰ ابن سعد ۲/ ۱۹۴ وغیرہ)۔

ان حضرات کی مثال سفینۂ نوح کی ہے کہ جو سفینہ پر سوار ہو گیا وہ نجات پا گیا اور جس نے روگردانی کی وہ غرق ہو گیا۔ (تلخیص المستدرک ذہبی، صواعق محرقہ ص ۱۸۴، تاریخ الخلفاء سیوطی، اسعاف الراغبین ص ۱۰۹، نظم درر السمطین ص ۲۳۵، کفایۃ الطالب گنجی شافعی ص ۳۷۸ وغیرہ)۔

یہ حضرات امت کے لئے ویسے ہی وجہ امان ہیں جس طرح آسمان کے لئے ستارے۔ (صواعق محرقہ ص ۹۱، ۱۴۰، احیاء المیت سیوطی برحاشیہ اتحاف ص ۱۱۴، منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند الامام احمد ۵/ ۹۳)۔

ہم فی الحال تمام نصوص کے اجمالی دلائل کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اس کے بعد مجموعی طور پر باب المیزان میں بیان کریں گے۔

دونوں مرجعیتوں کی حیثیت

سابق میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اہلسنت کے نزدیک بیان قرآن کے مرجع و مدرک صحابہ کرام ہیں جن میں کسی طرح کا استثناء نہیں ہے۔ سب عادل ہیں اور سب جنّتی ہیں۔ ابتداء میں صحابہ کے روایات کا تعلق سرکار دو عالمؐ کے اقوال و افعال سے تھا اور ان کی حیثیت صرف ایک راوی کی تھی۔ اس کے بعد جب متعدد مذاہب پیدا ہو گئے اور علاقوں کی تقسیم کا عمل شروع ہو گیا تو روایات کا دائرہ وسیع ہو کر صحابہ کے

اقوال و اعمال کو بھی شامل ہو گیا اور جدید ترین مسائل میں صحابہ کی رائے بھی شریعت کا تیسرا مصدر و مدرک بن گئی۔

مذاہب اربعہ میں حنفی، مالکی اور حنبلی حضرات آراء صحابہ کے حق میں شافعی حضرات سے زیادہ متعصب تھے اور ابو حنیفہ قیاس کے علمبردار ہونے کے باوجود یہ کہا کرتے تھے کہ قیاس کا مرتبہ صحابہ کی رائے کے بعد ہے اور جب بھی دونوں میں تعارض ہو جائے گا صحابہ کی رائے کو مقدم رکھا جائے گا۔ ان کا مشہور مقولہ ہے کہ "جب میں کتاب خدا اور سنت رسولؐ میں کوئی نص نہیں پاتا ہوں تو اصحاب کے قول پر عمل کرتا ہوں اور جب ان میں اختلاف ہو جاتا ہے تو اپنی رائے سے جس کے قول کو چاہتا ہوں مقدم کر دیتا ہوں لیکن ان کے اقوال کے بعد تابعین کے اقوال کو یہ اہمیت نہیں دیتا ہوں۔

(ابو حنیفہ لابی زہرہ ص ۴، ۳۰، الامام زید ص ۲۱۸)

ابن القیم نے اعلام الموقعین میں بیان کیا ہے کہ" امام احمد کے نزدیک اصول احکام پانچ ہیں۔ اول نص۔ دوم فتویٰ صحابہ . . . . احناف اور حنابلہ اس امر کے بھی قائل ہیں کہ کتاب خدا کو عمل صحابی سے تخصیص دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ صحابی عالم بلا سبب عموم کتاب پر عمل کو نظر انداز نہیں کرتا ہے اور اس کا عموم کے خلاف عمل کرنا علامت ہے کہ تخصیص پر کوئی دلیل موجود ہے اور صحابی کا عمل بھی اس کے قول جیسا ہوتا ہے۔

(المدخل الی علم اصول الفقہ للدوالیبی ص ۲۱۷)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اہلسنت نے تقدیس صحابہ میں کس قدر غلو سے کام لیا ہے کہ اس تقدیس کو عصمت کی منزل تک پہونچا دیا ہے۔

(المدخل ص ۲۱۷)

اس کے بعد جب مذاہب فقہ میں انتشار پیدا ہوا تو اس غلو کو ائمہ اہلبیتؑ سے عقیدت کے مقابلہ میں استعمال کیا جانے لگا اور اقوال صحابہ کو وحی سماوی کا درجہ دے کر اس کے ذریعہ عموم کتاب کو تخصیص اور اطلاق کتاب کو مقید بنانے کا کام بھی شروع ہو گیا۔

(المدخل ص ۲۱۷)

کو دلیل عدالت قرار دیدیا جائے۔ اس کی نہ کوئی دلیل ہے اور نہ اس کا اثبات ممکن ہے۔

شیعہ حضرات منحرف افراد کے اعمال کا پوری حریت فکر کے ساتھ محاسبہ کرتے ہیں اور افراد کو اعمال کی ترازو پر تولتے ہیں۔ وہ دشمنانِ خدا سے محبت نہیں کرتے ہیں اور جن لوگوں نے اپنی قسموں کو سپر بنا کر لوگوں کو دین خدا سے روکا ہے ان سے برائت کرتے ہیں اور اس موقف میں نہ کتاب خدا کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور نہ سنت رسول کی اور نہ سلف صالح کے کردار کی کہ وہ حضرات بھی اچھے بُرے صحابہ میں امتیاز رکھتے تھے۔

اس موقف کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیعوں کے خلاف اتہامات کے دروازے کھُل گئے اور چونکہ انھوں نے اہلسنت سے الگ راستہ اختیار کیا تھا لہٰذا ان کے موقف کے اثرات و نتائج بھی مختلف ہو گئے اور اس طرح اسلام میں مختلف قسم کی مرجعیتیں عالم وجود میں آگئیں۔

تعدد مرجعیت

رسولِ اکرمؐ کی حیات طیبہ میں اکثر صحابہ کے درمیان اختلاف رائے ہوا کرتا تھا اور آپ نہایت درجہ وسعت قلب کے ساتھ اس اختلاف کو سماعت فرمایا کرتے تھے اور اس کے مسئلہ کا حل کتاب یا اپنی سیرت سے پیش فرما دیا کرتے تھے اور سارے مسلمان اس پر ایمان لے آیا کرتے تھے اور اس طرح اختلاف لمحوں میں ختم ہو جاتا تھا اور تمام مسلمان شک کے مرحلہ سے نکل کر یقین کی منزل تک آجایا کرتے تھے۔

اختلاف نظر وسعت فکر کی علامت بھی تھا اور حل اختلاف آسان بھی تھا کہ مرجع صرف ایک تھا اور اس کا قول "قول عدل" اور اس کا حکم "حکم فصل" تھا۔

وحدتِ مرجعیت نے معاشرہ اور عقیدہ کی وحدت کو محفوظ کر رکھا تھا اور اسی کے سہارے امت اسلامیہ، امت واحدہ بنی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے بعد جب مرجعیتیں الگ الگ ہو گئیں تو نتیجہ بھی اسی کے اعتبار سے برآمد ہوا اور وہ خطرہ سامنے

اختلاف ہو جائے تو مجتہد اپنی رائے میں آزاد ہے جس صحابی کے قول کو چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ کہ اگر ایک مسئلہ میں حکم بن عاص اور ابو ہریرہ میں اختلاف ہو جائے اور حذیفہ بن الیمان کی تیسری رائے ہو اور ابو بکر صدیق کی چوتھی رائے ہو تو مجتہد کسی ایک کے اتباع پر مجبور نہیں ہے بلکہ آزاد ہے کہ جس کے قول کو چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ سب صحابہ، سب عادل۔ سب جنتی اور سب کی تنقید و تنقیص حرام ہے۔ تنقید و تنقیص صرف غیر صحابہ کے لئے ہے۔ صحابہ کا مرتبہ اس سے بالاتر ہے۔ یہاں تک کہ احناف و حنابلہ نے قول صحابی سے قرآن کے عموم کو تخصیص دے دی ہے اور ان کے خیال میں صحابی بلا وجہ عمومات کتاب کو نظر انداز نہیں کر سکتا ہے لہٰذا اس کا عموم پر عمل نہ کرنا تخصیص کی دلیل ہے کہ اس کا عمل بھی اس کے قول کی طرح معتبر اور مستند ہے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ حضرات صحابہ سے مراد ان تمام لغوی اور اصطلاحی اصحاب کو لیتے ہیں اور کسی طرح کی تخصیص کے قائل نہیں ہیں اور اس طرح صحابی اس درجہ عصمت تک پہونچ جاتا ہے جہاں اس کی حیثیت صاحب شریعت یا شریکِ شریعت سازی کی ہو جاتی ہے۔

اہلِ تشیع کے نزدیک اس معاملہ میں مسئلہ مختلف ہے۔ وہ اصحاب پیغمبرؐ میں صرف ان حضرات سے محبّت کرتے ہیں جنھوں نے دین کی نصرت میں زحمتیں برداشت کی ہیں۔ جان و مال سے جہاد کیا ہے اور ان تمام کمالات کا مظاہرہ کیا ہے جن کا تذکرہ امام زین العابدین کی دعا میں موجود ہے۔ (صحیفہ سجادیہ، آراء علماء الاسلام ص ۹۳-۹۴)

یہی وہ اصحاب کرام ہیں جن کی شیعیان آل محمدؐ تعظیم و تکریم کرتے ہیں اور ان سے محبت کو اپنا دین و ایمان قرار دیتے ہیں اور ان کی معتبر طریقہ سے وارد ہونے والی احادیث کو اپنی شریعت کا مدرک قرار دیتے ہیں۔

شیعوں کی نظر میں عدالت صرف ان افراد کا حصہ ہے جو عادل ہیں اور ان میں کمال عدالت پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہر صحابی کو عادل قرار دیدیا جائے اور صحابیت

کو دلیل عدالت قرار دیدیا جائے۔ اس کی نہ کوئی دلیل ہے اور نہ اس کا اثبات ممکن ہے۔

شیعہ حضرات منحرف افراد کے اعمال کا پوری حریت فکر کے ساتھ محاسبہ کرتے ہیں اور افراد کو اعمال کی ترازو پر تولتے ہیں۔ وہ دشمنانِ خدا سے محبت نہیں کرتے ہیں اور جن لوگوں نے اپنی قسموں کو سپر بنا کر لوگوں کو دین خدا سے روکا ہے ان سے برائت کرتے ہیں اور اس موقف میں نہ کتاب خدا کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور نہ سنت رسولؐ کی اور نہ سلف صالح کے کردار کی کہ وہ حضرات بھی اچھے بُرے صحابہ میں امتیاز رکھتے تھے۔

اس موقف کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیعوں کے خلاف اتہامات کے دروازے کھُل گئے اور چونکہ انھوں نے اہلسنت سے الگ راستہ اختیار کیا تھا لہٰذا ان کے موقف کے اثرات و نتائج بھی مختلف ہو گئے اور اس طرح اسلام میں مختلف قسم کی مرجعیتیں عالم وجود میں آگئیں۔

تعدد مرجعیت

رسولِ اکرمؐ کی حیات طیبہ میں اکثر صحابہ کے درمیان اختلاف رائے ہوا کرتا تھا اور آپ نہایت درجہ وسعت قلب کے ساتھ اس اختلاف کو سماعت فرمایا کرتے تھے اور اس کے مسئلہ کا حل کتاب یا اپنی سیرت سے پیش فرما دیا کرتے تھے اور سارے مسلمان اس پر ایمان لے آیا کرتے تھے اور اس طرح اختلاف لمحوں میں ختم ہو جاتا تھا اور تمام مسلمان شک کے مرحلہ سے نکل کر یقین کی منزل تک آجایا کرتے تھے۔

اختلاف نظر وسعت فکر کی علامت بھی تھا اور حل اختلاف آسان بھی تھا کہ مرجع صرف ایک تھا اور اس کا قول "قول عدل" اور اس کا حکم "حکم فصل" تھا۔

وحدتِ مرجعیت نے معاشرہ اور عقیدہ کی وحدت کو محفوظ کر رکھا تھا اور اسی کے سہارے امت اسلامیہ، امت واحدہ بنی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے بعد جب مرجعیتیں الگ الگ ہو گئیں تو نتیجہ بھی اسی کے اعتبار سے برآمد ہوا اور وہ خطرہ سامنے

آگیا جس کا احساس کیا جا رہا تھا اور چونکہ اختلاف و اتحاد نا قابل اجتماع امور تھے لہذا حاکم نے لوگوں کی آزادی فکر پر پابندی لگانا ضروری سمجھا اور وحدت اسلامیہ کے لئے بہت سے وسائل سامنے آگئے۔

نظریہ عدالت صحابہ کا سب سے بڑا خطرہ یہی تھا کہ اس نے تمام صحابہ کو مرجع بنا دیا اور امت اسلامیہ میں ہزار ہا ہزار مرجعیتوں نے جنم لے لیا اب ہر مرجع اسلامی کی اپنی الگ رائے ہے اور اس کا الگ گروپ اور امت احزاب میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ہر گروہ کا خیال یہ ہے کہ حق اس کے مرجع کے ساتھ ہے اور رضائے الہٰی تک پہونچنا اسی کے راستے سے ممکن ہے۔ لیکن عملی طور پر صاحبانِ اقتدار ہی سب کچھ ہو گئے اس طرح کہ شرعی قانون معطل ہو گیا اور وسائل ابلاغ صاحبانِ اقتدار کے ہاتھ میں آگئے۔ اب وہ جس مرجعیت پر روشنی ڈال دیں گے وہ نظر آنے لگے گی اور اسی کو فرقہ ناجیہ اور حق مبین قرار دیدیا جائے گا۔ اسی کے فتوے نشر ہوں گے اور اسی کے گرد عظمت کا ہالہ تیار ہو گا اور عوام میں غیر شعوری طور پر اسی کا اعتبار قائم ہو جائے گا۔ انھیں یہ خبر بھی نہ ہو گی کہ اس مرجعیت کی اہلیت وصلاحیت کیا ہے اور یہ قابل اعتماد ہے بھی یا نہیں۔؟

ابو ہریرہ جیسا صحابی جو دور "خلافت راشدہ" میں ایک گمشدہ شخصیت تھا اور لوگوں کی خدمت کر کے اپنا پیٹ پالتا تھا وہ بھی اموی دار الحکومت سے تقرب کی بنا پر ایک عظیم مرجعیت کی شکل اختیار کر گیا اور اس کی بیشمار حدیثیں اس قرآن جیسی ہو گئیں جس کے قریب سے باطل گذر نہیں سکتا ہے اس کی تمام صحابہ کبار سے زیادہ روایتیں نقل ہونے لگیں اور وہ سب سے اہم راوی قرار پا گیا۔ کیوں ؟ اس لئے کہ سرکار نے اس کا انتخاب کر لیا ہے اور اسی کو اپنا مرجع بنا دیا ہے جس کے زیر اثر تمام مرجعیتوں کو زندگی گذارنا چاہیئے۔

تعدد مرجعیت اور حکم شریعت ؟

کھلی ہوئی بات ہے کہ دنیا کے ہر دین کا ہمیشہ ایک مرجع رہا ہے اور ہر دین کے

عقائد ایک ہی مرجع سے حاصل کیے گئے ہیں۔ اسلام کے عقائد و تعلیمات کے لئے بھی مرجعیت سرورِ کائنات کی ذات گرامی تھی۔ انھیں کا قول "قول فیصل" تھا اور انھیں کا بیان دین و مذہب تھا کہ اگر دوسری مرجعیت حکم خدا سے پیدا بھی ہو تو اس کا ارتباط اسی مرجعیت سے ہوگا اور اس کی بنیاد بھی یہی ہوگی کہ یہ جدید مرجعیت پہلی مرجعیت کے احکام سے سب سے زیادہ باخبر اور اس کی تطبیق کے لئے سب سے زیادہ انسب ہے۔

دین یہود میں بھی ایک مرجعیت تھی یعنی حضرت موسیٰ۔ ہارون ان کے تابع تھے کہ اگر موسیٰ قوم سے الگ بھی ہو جائیں تو ہارون ان کے خلیفہ ہی کہے جائیں گے۔ اس کے بعد جب موسیٰ واپس آجائیں گے تو مرجعیت انھیں کے ہاتھ میں رہے گی۔

یہی حال مسیحیت کا بھی تھا کہ ان کے مرجع حضرت عیسیٰ تھے اور حواریین ان سے مرتبط اور ان کے دین کے خادم تھے۔ ان تمام انبیاء کے دنیا سے جانے کے بعد ہونا یہی چاہیئے تھا کہ مرجعیت کی وحدت باقی رہتی اور یہ کام اسی کے حوالہ کر دیا جاتا جو نبی کی زندگی میں پروردگار کی طرف سے اس کام کے لئے معین ہو چکا ہوتا کہ دین و مذہب بے مرجع بھی نہ رہے اور انبیاء و مرسلین کو اپنے فرائض میں کوتاہی کرنے والا بھی نہ کہا جائے کہ امت کو لاوارث چھوڑ دینا بھی کمال دین کے منافی ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے قطعی نصوص کی بنا پر اہلبیت پیغمبر ہی مرجع مسلمین تھے اور انھیں کے نمایاں ترین فرد کو ہر دور کا مرجع قرار دیا گیا تھا۔ اور یہ سوال کہ اہلبیت ہی کیوں؟ مہمل ہے اس لئے کہ یہ ایک فضل خدا ہے وہ جسے چاہتا ہے عنایت کر دیتا ہے ورنہ یہ بھی سوال ہوگا کہ کل کائنات میں پیغمبر ہی کیوں؟

اور دوسرا راز یہ بھی ہے کہ ان حضرات کو پیغمبر نے مرجعیت کے لئے تیار کیا تھا اور انھوں نے پیغمبر اور ان کے پیغام کو مکمل طور سے اپنی پناہ میں رکھا تھا۔ پروردگار نے بھی مختلف طریقوں سے یہ اعلان کر دیا تھا کہ یہ سارے زمانے سے افضل ہیں۔

پیغمبر اسلام کے انتقال کے وقت یہ بات بالکل واضح تھی کہ مسلمانوں کی مرجعیت اہلبیت کے سربراہ حضرت علی کا حصہ ہے۔ انھیں کو رسول اکرم نے سارے صاحبان ایمان

کا مولا بنایا ہے اور انھیں کو حضرت فاروق نے یہ کہہ کر مبارکباد دی ہے کہ "یہ ہمارے اور ہر مومن و مومنہ کے مولا ہیں۔"

لیکن اس کے بعد جب اس مرجعیت کو مسترد کر دیا گیا تو یقینی طور پر دوسری مرجعیت کی ضرورت محسوس ہوئی۔

متبادل مرجعیت

مرسل اعظمؐ کے انتقال کے بعد شرعی مرجعیت کو معطل کر دیا گیا اور اب سرکاری مرجع اور نائب مرجعِ اول وہ شخص ہو گیا جسے خلیفہ کا نام دے دیا گیا اور انقلاب اس منزل تک پہونچ گیا کہ جب شرعی مرجع کے ہاتھ میں اقتدار آیا تو دنیا اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھی جب تک اس کا قتل نہیں ہو گیا۔ اس کے بعد جب امام حسنؑ کے ہاتھ میں حکومت آئی تو آپ نے بھی دیکھ لیا کہ یہ دنیا شرعی مرجع کے قتل سے کم پر راضی نہیں ہوتی ہے لہٰذا آپ نے ہاتھ کھینچ لیا اور حکومت سے الگ ہو گئے۔ اس کے بعد جب امام حسینؑ نے اس ذمہ داری کو سنبھالا تو اس کا بھی انجام یہی ہوا کہ آپ کو کربلا میں قتل کر دیا گیا اور امت شرعی مرجع کے بغیر لاوارث ہو گئی اور کوئی ایسا مرجع نہ رہ گیا جسے حضور نے اپنی زندگی میں باقاعدہ طور پر نامزد کر دیا ہو تو امت کو متبادل مرجعیت کی ضرورت محسوس ہوئی اور بنی امیہ نے سارا زور اس امر پر لگا دیا کہ مرجعیت ان کے ہاتھ میں رہے اور لوگ اس امر سے مطمئن ہو جائیں کہ مرجع شرعی بنی امیہ کے حکام ہیں۔ چنانچہ حکومت کا پروپیگنڈہ اور دنیا پرستوں کی مصلحت نے مل کر کام شروع کیا اور بنی امیہ مرجع شرعی کہے جانے لگے۔

نظریۂ عدالت صحابہ اور متبادل مرجعیت

اس جدید مرجعیت کے قائم کرنے میں سب سے اہم رول اس نظریہ نے ادا کیا۔ جس نے عدالت کا ایسا لباس تیار کیا جو ہر اموی حاکم کے جسم پر فٹ ہو جائے اور امت کو یہ باور کرا دیا کہ ہر صحابی عادل ہوتا ہے اور عادل جھوٹ نہیں بول سکتا ہے اور

وہ جنتی بھی ہوتا ہے لہٰذا اس کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ اموی حاکم عادل ہے، اور وہ مرجعیتِ امت کا سو فیصدی اہل ہے اور اس طرح حالات ایک نئے رُخ پر چل پڑے۔

سرکاری تائید

کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر یہ نظریہ غیر سرکاری راستے سے آیا ہوتا تو یقیناً ناکام ہوگیا ہوتا لیکن اس کی آواز خود صحابۂ کرام کی طرف سے بلند ہوئی تھی اور تائید میں حکام کھڑے ہوگئے تھے اور مادی اور معنوی ہر طرح کا زور صرف ہوگیا تھا اور اصلی مرجعیت کے خلاف روایتیں وضع کرنے والوں کو انعامات دئے جانے لگے تھے اور نظریہ علالت کے مویدین کو عہدے ملنے لگے تھے۔ انھیں جاہ و مال سے نوازا جانے لگا تھا اور حکومت کے سارے وسائل ان کے زیرِ اختیار رکھ دئے گئے تھے تو نظریہ کے ناکام ہونے کا کوئی سوال نہ تھا۔ فطری طور پر یہ سارے حالات صاحبانِ بصیرت صحابہ کرام کو معلوم تھے لیکن ان کے ہاتھ بندھ چکے تھے اور امت منتشر ہوچکی تھی۔ کبار صحابہ نے اس نظریہ کی مخالفت کی لیکن ان کا اختلاف مکانات کے گوشوں میں ولادت کے ساتھ ہی وفات پا گیا اور نظریہ وسائل ابلاغ کے زیرِ سایہ پروان چڑھتا رہا۔ حکومت کی تائید اسے مزید قوت بخشتی رہی اور اس طرح واقعی اور حقیقی مرجعِ امت کی توہین۔ اس پر سب و شتم و لعنت وہ روزانہ کا کاروبار بن گیا جسے امت اسلحہ کے زور پر انجام دے رہی تھی اور اس کی مخالفت کرنے والے کا انجام حجر بن عدی جیسا انجام تھا کہ اسے ایک لقمۂ نان سے بھی محروم کردیا جائے اور آخر میں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

اسی انداز سے متبادل مرجعیت کے قیام کا کام نہایت آسانی کے ساتھ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

متبادل مرجعیت شرعی ہوگئی

صحابہ کرام اور تابعین صادقین کی نسل کا ختم ہونا تھا کہ حزبِ اختلاف ختم ہوگیا

اور ان کی دلیلیں پردۂ راز میں چلی گئیں اب متبادل مرجعیت کو شرعی بنانے اور اس کو روشناس کرانے کے تمام وسائل منظر عام پر آگئے کہ یہ حکومت کے اسناد میں سب سے بڑی سند تھی اور اس طرح دھیرے دھیرے متبادل قیادت شرعی مرجعیت بن گئی اور حقیقت اور اہل حقیقت دونوں کا خاتمہ ہوگیا۔ چند افراد باقی رہ گئے تو ان کی کوئی آواز نہ رہ گئی اور امت نے یہ محسوس کرنا شروع کردیا کہ جس مرجعیت شرعیہ کو خدا نے ایجاد کیا ہے اور جس کے اتباع کا حکم دیا ہے۔ وہ یہی مرجعیت ہے جو سرکاری ذرائع سے پہونچ رہی ہے اور جس کا تعارف حکومت کی مشینری کرا رہی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس مرجعیت سے اختلاف گویا خدا اور رسول سے اختلاف ہوگیا اور یہ وہ اندھی تقلید تھی جس میں بحث کا امکان نہ تھا اور اس سے کسی طرح کا بھی اختلاف انسان کو کافر بنا دینے کے لئے کافی تھا۔

ظاہر ہے کہ شیعوں کا فرض تھا کہ وہ اہلبیتؑ کی مرجعیت و قیادت کے تحفظ کے لئے اس خودساختہ مرجعیت کی مخالفت کریں اور اس کا نتیجہ واضح تھا کہ وہ ہر طرح کے سب وشتم، الزام واتہام۔ لعن وطعن کا مرکز بن جائیں گے۔ انھیں دین کا دشمن قرار دے دیا جائے گا اور ان کے کفر کا فتویٰ رائج ہو جائے۔

چنانچہ یہ بات عوام الناس کے ذہن میں راسخ ہوگئی اور ان افراد کی بھی ذہنیت بن گئی جنھوں نے اسی نظریہ کی یونیورسٹی سے سند حاصل کی تھی اور جن کی تاریخ اسی نظریہ کے زیر سایہ مرتب ہوئی تھی۔

حل؟

ایسی صورت حال میں اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ انسان مشکلات پر صبر کرے اور حضور اکرمؐ کے راستہ سے وابستہ رہے کہ آپ نے ہر طرح کی دشمنی کا مقابلہ کیا لیکن باطل کے سامنے جھکنے کے لئے تیار نہیں ہوئے بلکہ حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعہ شرعی اسالیب، عقلی دلائل اور واضح براہین کا سہارا لے کر اندھی تقلید کے حجابات اٹھاتے رہے اور حقیقت کے چہرہ کو بے نقاب بناتے رہے۔ یہانتک کہ

لوگ آپ کے بیانات سے مطمئن ہو گئے اور راہِ حق پر آنے لگے کہ حقیقت کے عاشقین کے لئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔

شرعی قیادت کی عدم موجودگی

شرعی قیادت کے منظر عام پر نہ ہونے کا یہ اثر ہوا کہ لوگ مختلف احزاب اور جماعتوں میں تقسیم ہو گئے اور ہر گروہ اپنے کو برحق کہنے لگا جب کہ سب کو معلوم تھا کہ شرعی قیادت کی عدم موجودگی میں امت ۷۳ فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی اور ان میں سے بہتر باطل پر ہوں گے اور حق کا ایک ہی راستہ ہوگا جس پر فرقہ ناجیہ کو چلنا ہوگا اور فرقہ ناجیہ وہی ہوگا جو شرعی قیادت کے راستہ پر چلے گا۔

درحقیقت یہ فرقہ واریت انھیں نتائج میں ہے جن کے واسطے نظریۂ عدالت صحابہ ایجاد ہوا تھا تاکہ ہر شخص اپنے افکار و خیالات کو حق کا نام دے سکے اور اپنے ذاتی راستہ کا نام دین خدا رکھ سکے۔

فقہی تقسیم

نصوص اسلامی کے واقعی مفہوم کے بیان کرنے والی قیادت کے نہ ہونے کے باعث مسلمان مختلف فقہی احزاب میں تقسیم ہو گئے اور اس گروہ بندی پر سیاست کی چھاپ نمایاں ہو گئی۔ عالم اسلام کی فقہی تقسیم میں پانچ مسلک نمایاں طور پر دکھائی دیئے۔

۱۔ مذہب اہلبیتؑ۔ جو عالم اسلام کا سب سے پہلا مذہب ہے اور درحقیقت فرقہ ناجیہ کا مسلک ہے جسے امام جعفر صادقؑ کی نسبت سے مذہب جعفری بھی کہا جاتا ہے۔

۲۔ مذہب حنفی۔ اس کی نسبت ابو حنیفہ کی طرف ہے اور انھوں نے اپنے علوم امام جعفر صادقؑ سے حاصل کئے ہیں۔ اس کے بعد ایک مذہب کی بنیاد قائم کر دی۔

۳۔ مذہب مالکی۔ اس کی نسبت مالک کی طرف ہے اور انھوں نے اپنے

علوم ابو حنیفہ سے حاصل کئے تھے اور اس کے بعد ایک مذہب کی بنیاد ڈال دی تھی۔

۴۔ مذہب شافعی۔ اس کی نسبت شافعی کی طرف ہے جنھوں نے مالک سے حاصل کیا اور پھر امام بن گئے۔

۵۔ مذہب حنبلی۔ اس کی نسبت احمد بن حنبل کی طرف ہے جنھوں نے شافعی سے حاصل کر کے استقلال پیدا کر لیا۔

اس اعتبار سے امام صادقؑ تمام مذاہب اربعہ کے ائمہ کے استاذ ہیں اور سب کو اس بات پر فخر بھی ہے جب کہ عوام الناس کا خیال یہ ہے کہ مذہب جعفری کا اتباع کرنے والے گمراہ ہیں اور یہ عوام الناس راہ حق پر ہیں۔

اہلبیتؑ سے مخالفت کی بنیادی جڑیں

۱۔ مخالفین کا اصرار تھا کہ اہلبیتؑ ان تمام خصوصیات سے دستبردار ہو جائیں، جو عالم اسلام میں مالک کائنات کے فضل و کرم سے صرف انھیں حاصل ہیں اور کسی اور کو حاصل نہیں ہیں۔

۲۔ اگر دستبرداری ممکن نہیں ہے تو ان خصوصیات کی تاویل کی جائے اور ان کے معانی و مفاہیم تبدیل کر دئے جائیں۔

۳۔ ان الٰہی خصوصیات کے مقابلہ میں خانہ ساز خصوصیات ایجاد کی جائیں اور ان کے ذریعہ اہلبیتؑ کے امتیازات کا مفہوم بدل دیا جائے۔

۴۔ نظریہ عدالت صحابہ کو تسلیم کر لیا جائے جو جدید خصوصیت ایجاد کرنے کا بہترین ذریعہ ہے اور جس کے بعد اہلبیتؑ کے جملہ امتیازات کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

۵۔ اہلبیت اپنے خصوصیات سے دستبردار ہو کر حالات کو تسلیم بھی کر لیں تو بھی انھیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ان سے مقابلہ بہر حال جاری رہے گا۔

۶۔ حکومت وہ حسین دوشیزہ ہے جسے اہل اقتدار نے اس کے واقعی وارث سے الگ کر لیا ہے تو انھیں ہر وقت یہ احساس ہے کہ جسم ہمراہ بھی رہے تو روح واقعی وارث

کے ساتھ ہی رہے گی اور یہ احساس ہر وقت حکام کے دل میں حسد پیدا کرتا رہے گا اور وہ جنون کا شکار ہو کر رسوا کن انسانیت اعمال انجام دیتے رہیں گے۔

قرابت پیغمبرؐ کا امتیاز

عالم انسانیت کے تمام خاندانوں میں سب سے عظیم خاندان بنی ہاشم کا ہے اور عرب میں بھی نص صریح کی بنا پر اس سے بلند ترین کوئی قبیلہ نہیں ہے۔ اس کے بعد عبدالمطلب کے گھر سے بہتر کوئی گھر نہ عرب میں ہے اور نہ عالم انسانیت میں۔ (طبقات ابن سعد۔ سیرت حلبیہ۔ کنز العمال۔ مستدرک حاکم۔ سنن بیہقی۔ طبرانی۔ ابن عساکر)۔

ہاشم کا شجرۂ نسب یہ ہے: ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب۔

(طبقات ابن سعد ۱/۷۵)

بنی ہاشم میں بھی آل محمدؐ سب سے عظیم ترین افراد ہیں جن کی مودت کتاب خدا میں واجب کی گئی ہے اور ان پر صلوات کو نماز کے ارکان میں شمار کیا گیا ہے۔

حضرت شافعی نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ: "اے اہلبیتِ رسولؐ! تمھاری محبت اللہ کی طرف سے فرض کی گئی ہے اور اس کا حکم قرآن میں نازل ہوا ہے، تمھارے فخر کے لئے یہی کافی ہے کہ جو شخص تم پر صلوات نہ بھیجے اس کی نماز نماز نہیں ہے۔"

(ابن حجر تفسیر آیت صلوات ص ۸۸، الشرف المؤبد نبہانی ص ۹۹)

اہلبیتِ پیغمبرؐ اس امت کا خلاصہ اور اس کا وہ شجرہ ہیں جس سے ہر مرض کا علاج ہوتا ہے۔ انھیں افراد کو عترت کہا جاتا ہے اور عترت ہی کو نسل اور قریب ترین جماعت کہا جاتا ہے۔ (مختارات الصحاح ص ۳۱، ۱۸۵، ۷۰، ۴۱۰، المعجم الوسیط ۱/۲۱، ۲/۵۸۸)

اللہ نے اہلبیت پیغمبرؐ کو طیب و طاہر بنایا ہے اور ان سے ہر رجس کو دور رکھا ہے۔ اہلبیتؑ اللہ کے فضل و کرم اور اپنے مجاہدات کی بنیاد پر تمام کائنات سے بالاتر قرار پائے ہیں۔ یہی مسلمانوں کے واقعی اور قانونی مرجع ہیں اور انھیں کو سیاسی قیادت کا حق حاصل ہے۔ اور یہ وہ شرف ہے جس کا مثل کوئی شرف نہیں ہے اور یہ وہ بزرگی

ہے جس سے کمتر دنیا کی ہر بزرگی ہے اور یہی آل محمدؐ کا عظیم ترین امتیاز ہے جس میں دنیا کا کوئی انسان شریک نہیں ہے۔

خصوصیات کی غرض وغایت

قرابت پیغمبرؐ بظاہر ایک شرف ہے لیکن واقعاً اس کا ایک عظیم مفہوم ہے اور اس کے مختلف مراتب ہیں۔

مفہوم یہ ہے کہ یہ قرابت مسلمانوں کے درمیان ایک مرکزی نقطہ ہے جس کے ذریعہ دائرہ کی تکمیل ہوتی ہے اور مرکز معین ہوتا ہے اور اس کے زیر اثر امت ایک نقطہ پر جمع ہو جاتی ہے، نہ مشرق ومغرب کا خطرہ رہتا ہے اور نہ شمال وجنوب کا۔ ساری امت ایک پاکیزہ قرابت کے ساتھ چلتی ہے اور سب اسی کے گرد جمع ہو جاتے ہیں، یہی دینی مرجعیت بھی ہوتی ہے اور یہی مسلمانوں کی سیاسی قیادت بھی۔ اسی کے ذریعہ مسلمان اور غیر مسلمان دنیا کے لئے دین کی وضاحت ہوتی ہے اور یہی مرجعیت دین کا وہ مثالی مفہوم پیش کرتی ہے جو مقصود الٰہی سے سو فیصدی ہم آہنگ ہو۔

قرابت پیغمبرؐ کے وظائف

۱۔ مسلمانوں کے لئے مرکزی نقطہ۔

۲۔ دین کے بیان کے لئے بہترین مرجع۔

۳۔ ثقل اصغر، جو قرآن کریم کے ساتھ مل کر ہدایت کا نصاب مکمل کرے اور جس کے بغیر گمراہی سے بچنا ممکن نہیں ہے کہ اگر امت قرآن سے تمسک کر کے قرابت پیغمبرؐ کو نظر انداز کر دے تو یقیناً ہدایت یافتہ نہ ہو سکے گی۔ اس لئے کہ قرآن کریم ایک دوا ہے اور عترت طبیب اور طبابت ایک اختصاصی عمل ہے جس کو ہر شخص انجام نہیں دے سکتا ہے۔ (کنز العمال ۱/۴۴، مسند احمد ۵/ ۱۸۲، ۱۸۹، مستدرک حاکم ۳/۱۴۸)۔

۴۔ امت کی سیاسی قیادت۔ کہ جب یہ قیادت عترت پیغمبرؐ کے ہاتھ میں ہوگی تو

نفوس مطمئن رہیں گے کہ یہی وہ بنیادی حل ہے جو اختلافات کو ختم کر کے اطمینان کی فضا قائم کر سکتا ہے اور اس کے بعد طمع و حسد کا سلسلہ ختم ہو سکتا ہے۔

شریعت مقدسہ نے اس امر کی ذمہ داری لے لی ہے کہ اس حقیقت کی وضاحت کردے کہ یہ قیادت کس کے حصہ میں ہو گی اور کس طرح دوسرے کی طرف منتقل ہو گی۔

اقربائے پیغمبرؐ کے لئے یہ خصوصیات کیوں؟

سوال یہ ہے کہ پروردگار نے رسالت کے لئے حضرت محمد مصطفےؐ کا انتخاب کیوں کیا ہے۔ ابو سفیان کا انتخاب کیوں نہیں کیا ہے؟ — جواب یہ ہے کہ یہ فضل الٰہی ہے وہ جسے چاہتا ہے عنایت کر دیتا ہے۔

اب خدا نے بعض انبیاء کو بعض سے افضل کیوں بنایا ہے؟ یہ بھی ایک فضل خدا ہے جسے چاہتا ہے عنایت کر دیتا ہے۔ اب خدا نے محمد مصطفےؐ کو بنی ہاشم میں کیوں قرار دیا ہے، بنی عدی، بنی تمیم یا بنی امیہ میں کیوں نہیں قرار دیا ہے؟ — یہ بھی ایک فضل خدا ہے وہ جسے چاہتا ہے عنایت کر دیتا ہے — لیکن ان سب کے باوجود جب تاریخ اسلام کا جائزہ لیا جاتا ہے تو چند اسباب سامنے آتے ہیں۔

توجیہات

۱۔ پروردگار نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اقربائے پیغمبرؐ ہی بہترین مردم اور افضل الناس ہیں اور بندوں کے حق میں مصلحت یہی ہے کہ ان کی قیادت افضل اور احسن افراد کے ہاتھ میں ہو۔

۲۔ بنی ہاشم کی طرف سے صادر ہونے والا وہ اعلان جس میں تمام قبائل قریش کو مخاطب بناتے ہوئے ابو طالبؑ نے فرمایا تھا کہ اگر تم لوگوں نے محمدؐ کو قتل کر دیا تو میں تم میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑوں گا جب تک خود فنا نہ ہو جاؤں۔

۳۔ قریش کے تمام قبائل نے بنی ہاشم کا بائیکاٹ کر دیا اور یہ دستاویز تیار کر دی

کہ کوئی ان سے رشتہ داری، خرید و فروخت اور ربط و ضبط نہ رکھے اور اسی حالت میں یہ محاصرہ برقرار رہا اور بنو عبد المطلب بن عبد مناف ابو طالب کے ساتھ شعب میں محصور رہے اور قریش نے ہر طرف سے راستے بند کر دیئے کہ بچوں کی فریاد کی آوازیں بلند ہو گئیں اور قریش کا مقصد صرف یہ تھا کہ بنی ہاشم محمدؐ کو قریش کے حوالے کر دیں یا اپنی حمایت کو واپس لے لیں۔ لیکن بنی ہاشم نے اس امر سے انکار کر دیا اور اپنے جان و مال کی قربانی کے لئے تیار ہو گئے۔ تو کیا ان کے علاوہ بھی کوئی اس امر کا حقدار تھا کہ اسے اسلام کی قیادت سپرد کر دی جائے۔

۴۔ جب محاصرہ ناکام ہو گیا تو اقربار رسولؐ ہی کا خوف تھا جس کی بنا پر قریش نے ہر قبیلہ کے ایک ایک فرد کا انتخاب کیا تاکہ رسول اکرمؐ کو قتل کر دیا جائے اور ان کا خون قبائل میں تقسیم ہو جائے اور بنی ہاشم بدلہ نہ لے سکیں۔ یہ اور بات ہے کہ رب کریم نے پیغمبرؐ کو بچا لیا۔

۵۔ اقربائے پیغمبرؐ دورِ جاہلیت میں بھی قریش کی پیشانی شمار ہوتے تھے اور ان کے مشورہ کے بغیر کسی امر کا فیصلہ نہ کیا جاتا تھا۔

۶۔ اقربائے پیغمبرؐ بنص شرعی وسیلۂ نجات ہیں اور انھیں کو وجہ امان قرار دیا گیا ہے۔

یہی وہ اسباب اور خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اقربار رسول کو یہ امتیاز دیا گیا ہے کہ وہ امت کی قیادت کریں۔ علاوہ اس کے کہ ان افراد کو رب کریم نے علمی اور عملی اعتبار سے بھی اس قیادت کے لئے مہیا کیا تھا۔

امتیاز قرابت ایک تاریخی دلیل کی شکل میں

حضرت ابو بکر نے انصار سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ تمام لوگ ہمارے تابع ہیں اس لئے کہ ہم عشیرۂ رسول اللہ سے ہیں۔ (الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ ص ۸۴)

حضرت عمر نے انصار سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: "خدا کی قسم عرب تمہاری حکومت سے راضی نہ ہوں گے جب کہ نبی تم میں سے نہیں ہیں۔ عرب اس امر

کو صرف اسی کے حوالے کریں گے جس کے گھرانے میں نبوت رہی ہو۔ ہمارے پاس عربوں کے مقابلہ میں واضح دلیل اور نمایاں برہان موجود ہے۔ کون ہم سے محمدؐ کی حکومت اور ان کی میراث کے بارے میں جھگڑا کر سکتا ہے جب کہ ہم ان کے قرابت دار اور قبیلہ کے افراد ہیں۔ مگر یہ کہ باطل پرست یا گنہگار یا ہلاک ہونے والا ہو"۔

(الامامۃ والسیاسۃ ص ۸)

بشیر بن سعد نے انصار سے خطاب کر کے دونوں سابق افراد کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ: "حضرت محمد رسول اللہؐ قریش میں سے ہیں اور ان کی قوم ان کی میراث کی زیادہ حقدار ہے۔ خدا نہ کرے کہ میں ان لوگوں سے اس مسئلہ میں اختلاف کروں۔ خدا سے ڈرو اور ان لوگوں سے اختلاف یا جھگڑا نہ کرو"۔ (طبری ۳/ ۱۹۷، ۱۹۸)

انصار نے بشیر کی اس دلیل کو تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ پھر تو ہم علیؑ کے علاوہ کسی کی بیعت نہ کریں گے۔ علیؑ اس موقع پر موجود نہ تھے اور تجہیز و تکفین پیغمبرؐ میں مشغول تھے، جس کی بنا پر حاضرین کی اکثریت نے ابوبکر کی بیعت کر لی اور وہ بشکل خلیفہ سقیفہ سے برآمد ہوئے۔ حضرت عمر کا انداز ولیعہد مملکت کا تھا اور ابو عبیدہ نائب دوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ بیعت کرنے والے لشکر خلافت کے انداز سے ساتھ چل رہے تھے۔ (النظام السیاسی ص ۱۲۰)

حضرت علیؑ کے لئے یہ واقعہ خود ہی ایک حادثۂ ناگہانی تھا کہ اچانک ولیعہد بہادر نے ان سے خلیفہ کی بیعت کا تقاضا کر دیا۔ حضرت علیؑ نے دونوں سے خطاب کر کے فرمایا کہ میں بیعت لینے کا تم سے زیادہ حقدار ہوں اور خلافت دراصل میرا حق ہے۔ تم نے انصار سے اس امر کو اس بنیاد پر حاصل کیا ہے کہ پیغمبرؐ تم میں سے تھے لہٰذا امارت و قیادت ان کے خاندان والوں کو ملنی چاہیئے تو اب تم بھی یہی انصاف کرو (اگر تمہارے پاس دین و ایمان ہے) ورنہ دیدہ و دانستہ ظالموں میں شمار ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

عمر نے کہا کہ بہر حال آپ کو بیعت کے بغیر نہ چھوڑا جائے گا۔

حضرت علیؑ نے فرمایا۔ دودھ دوہو ایک حصہ تمہارا بھی ہے۔ آج انکی حکومت

کو مضبوط بناؤ کل تو پلٹ کر آنے والی ہی ہے۔

"گروہ مہاجرین! ۔ اللہ کو یاد کرو۔ خبردار محمدؐ کی حکومت کو ان کے گھر کے باہر نکال کر اپنے گھروں میں نہ لے جاؤ اور نہ اس کے اہل کو اس کی منزل سے دور ہٹاؤ۔ خدا کی قسم اے مہاجرو! ہم تمام عالم انسانیت سے زیادہ اس امر کے حقدار ہیں۔ ہم اہلبیتؑ ہیں اور اس امر کے اس وقت تک حقدار رہیں گے جب تک ہم میں کتاب خدا کے قاری۔ دین خدا کے فقیہ۔ سنت رسول کے عالم۔ امر رعیت کے ذمہ دار۔ امت سے برائیوں کے دفع کرنے والے اور ان کے درمیان برابر سے تقسیم کرنے والے موجود رہیں گے۔ خدا کی قسم یہ حق ہمارا ہے۔ خواہشات کا اتباع نہ کرو کہ راہ خدا سے بہک جاؤ اور حق سے دور ہوتے چلے جاؤ۔"

بشیر بن سعد نے کہا کہ اگر انصار نے اس کلام کو پہلے سن لیا ہوتا تو دو آدمی بھی تمہارے بارے میں اختلاف نہ کرتے لیکن اب ابوبکر کی بیعت ہو چکی ہے۔

(الامامۃ والسیاسۃ ص ۱۱-۱۲)

جناب فاطمہؑ کے انتقال کے بعد حضرت علیؑ نے ابوبکر کو طلب کیا۔ ابوبکر آئے جبکہ بنی ہاشم کے افراد بھی خانۂ علیؑ میں موجود تھے۔ آپ نے حمد و ثنائے الٰہی کے بعد فرمایا کہ:

"ابوبکر! ہم نے تمہاری بیعت سے انکار فضیلت یا حسد کے عنوان سے نہیں کیا بلکہ ہماری رائے یہ ہے کہ یہ امر ہمارا حق ہے اور تم نے زبردستی قبضہ کر لیا ہے۔"

اس کے بعد رسول اکرمؐ سے اپنی قرابت کا ذکر فرمایا اور اتنی مفصل تقریر فرمائی کہ ابوبکر نے گریہ شروع کر دیا اور فرمایا کہ بیشک رسول اکرمؐ کی قرابت میرے نزدیک اپنی قرابت سے زیادہ محبوب ہے۔

(الامامۃ والسیاسۃ ص ۱۴-۱۶)

دوسری طرف مغیرہ بن شعبہ نے ابوبکر کو مشورہ دیا کہ عباس سے رابطہ قائم کر کے انھیں بھی حکومت میں کوئی حصہ دے دو تاکہ یہ علیؑ اور بنی ہاشم کے مقابلہ میں ایک دلیل بن جائے۔

اس کے بعد ابوبکر۔ عمر۔ ابوعبیدہ اور مغیرہ سب عباس کے پاس آئے اور ابوبکر نے

فرمایا کہ ہم آپ کو حکومت میں حصہ دینے کے لئے آئے ہیں۔ اے اولاد عبدالمطلب اپنے راستہ پر رہو۔ محمدؐ تم میں سے بھی ہیں اور ہم میں سے بھی۔

عباس نے اس گفتگو کے ایک ایک نقطہ کا جواب دیا اور آخر میں کہا کہ اگر رسول اللہؐ ہم اور تم دونوں سے ہیں تو یاد رکھنا کہ ہم اس شجرہ کی شاخیں ہیں اور تم اس کے ہمسایہ۔

(الامامۃ والسیاسۃ ص ۱۴-۱۶)

اس کے بعد خلافت کا سلسلہ حضرت عمر تک پہونچا۔ اس لئے کہ ابوبکر نے ان کے حق میں وصیت کردی اور وہ رسول اکرمؐ کے عشیرہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے بعد خلافت عثمان کو ملی کہ وہ بھی عشیرہ سے تعلق رکھتے تھے اور عملی طور پر عمر نے ان کے حق میں وصیت کردی تھی۔

لیکن علیؑ تک حکومت اس لئے آئی کہ وہ ولی خدا تھے اور لوگوں نے بھی ان کی بیعت کی تھی۔ یہی حال خلافت امام حسنؑ کا تھا۔ لیکن اس کے بعد جب معاویہ نے اقتدار کو غصب کرلیا اور بزور طاقت حکومت پر قبضہ کرلیا تو اس نے بھی یہی استدلال کیا کہ ہم قریش سے ہیں اور رسول اکرمؐ کے قرابت دار ہیں اس لئے کہ ہاشم اور عبد شمس دو بھائی تھے اور یہ قرابت کی بہترین دلیل ہے۔ اس کے بعد تمام بنی امیہ اسی دلیل سے حکومت کرتے رہے اور بنی عباس نے بھی اسی قرابت کو اسلحہ قرار دیا اور پھر اہلبیتؑ پر مصائب کے سلسلہ کو باقی رکھا جس کے نتیجہ میں حضرت علیؑ، امام حسنؑ۔ امام حسینؑ سب شہید ہوگئے اور ذریت طاہرہ کو مسلسل تلواروں کے گھاٹ اتار دیا جاتا رہا اور حکومت پر بزور شمشیر قبضہ ہوتا رہا۔

گویا کہ رسول اکرمؐ کے بعد سے لے کر بنی عباس کی حکومت کے خاتمہ تک ایک ہی تاریخی دلیل کام کرتی رہی کہ ائمہ قریش سے ہوں گے اور قریش قرابتداران پیغمبرؐ ہیں لیکن یہی وہ قرابت تھی کہ جس کے حق سے اہلبیتؑ کو محروم رکھا گیا اور باہر والے فائدہ اٹھاتے رہے۔

سیاسی اعتبار سے قرابتداروں کے ساتھ حکام کا برتاؤ

عمر بن الخطاب ایک جماعت کے ساتھ حضرت علیؑ کے دروازے پر آئے اور جناب فاطمہؑ

کے گریہ کی پرواہ کئے بغیر انھیں گھر سے نکال کر ابو بکر کے سامنے لے آئے اور کہا کہ اب بیعت کرو۔

آپ نے فرمایا کہ اگر بیعت نہ کروں تو کیا ہوگا۔؟

جواب ملا گردن اڑادی جائے گی۔!

فرمایا تو گویا کہ ایک بندۂ خدا اور برادر پیغمبرؐ کا خون ہوگا۔

جواب ملا کہ بندۂ خدا تو تسلیم کرتے ہیں لیکن برادر پیغمبرؐ نہیں تسلیم کرتے ہیں۔

عمر نے خلیفہ سے کہا کہ آپ اپنا حکم صادر فرمائیں۔

خلیفہ نے جواب دیا کہ جب تک فاطمہؑ ان کے پہلو میں ہیں، میں کسی طرح کا جبر نہیں کرسکتا ہوں۔

اس کے بعد حضرت علیؑ نے قبر پیغمبرؐ سے خطاب کر کے فرمایا کہ "برادر! قوم نے مجھے کمزور بنادیا ہے اور اب مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں"۔

جناب فاطمہؑ نے یہ سُن کر بآواز بلند فریاد کی" بابا! یارسول اللہ!۔آپ کے بعد ابن خطاب اور ابن ابی قحافہ نے کیا برتاؤ کیا ہے ذرا ملاحظہ تو فرمائیں۔!

اس کے بعد ایک قوم نے بیعت سے انکار کر کے خانۂ علیؑ میں پناہ لے لی تو ابو بکر نے پھر عمر کو بھیجا اور انھوں نے آکر آواز دی۔ لوگوں نے باہر آنے سے انکار کردیا تو حکم دے دیا کہ لکڑیاں لائی جائیں اور گھر میں آگ لگادی جائے۔ خدا کی قسم اگر یہ لوگ گھر سے باہر نہ نکلے تو ہم گھر میں آگ لگادیں گے۔

کسی نے کہا ابو حفص! اس گھر میں فاطمہ بھی ہیں۔؟

فرمایا کوئی بات نہیں ہے۔

(الامامۃ والسیاسۃ ص ۲۱، العقد الفرید ابن عبد ربہ المالکی ۴/۲۰۹، شرح نہج البلاغہ لابن ابی الحدید ۱/۱۳۴، ۲/۱۹، طبری ۳/۲۰۲، انساب الاشراف بلاذری ۱/۵۸۶، ملحق المراجعات ص ۲۶۱)

اس کے بعد لوگ باہر آگئے اور گھر جلنے سے بچ گیا۔ یہانتک کہ جناب فاطمہؑ کا انتقال

ہو گیا اور وہ راتوں رات دفن ہو گئیں۔ اس لئے کہ ان کی وصیت تھی کہ ابو بکر جنازہ کی نماز نہ پڑھانے پائیں۔ جس کے بعد حضرت علیؑ نے حالات پر صبر کر لیا اور ابو بکر نے اس سکوت کو دیکھ کر عمر کو وصیت کی کہ اہلبیتؑ کے حق کا لحاظ رکھا جائے اور انھیں عطایا میں مقدم کیا جائے، جیسا کہ بلاذری نے فتوح البلدان میں درج کیا ہے۔

دونوں خلیفہ حضرت علیؑ سے مشورہ بھی کرتے رہے اور مسائل میں ان کی طرف رجوع بھی کرتے رہے جس کی بنا پر یہ دور اہلبیتؑ کے لئے بعض اعتبارات سے انتہائی غنیمت دور تھا لیکن بنی امیہ کے برسر اقتدار آتے ہی حضرت علیؑ سے جنگ شروع ہو گئی۔ امام حسنؑ کو زہر دے دیا گیا۔ امام حسینؑ کو قتل کر دیا گیا۔ ذریت رسولؐ کو فنا کر دیا گیا اور حسینؑ و اولاد حسینؑ کو فرات کے پانی تک سے محروم کر دیا گیا۔ اور حکومت کے ہر غیظ و غضب کا مرکز محبانِ اہلبیتؑ کو قرار دے دیا گیا اور معاویہ نے تمام اطراف مملکت میں فرمان بھیج دیا کہ نمازوں میں اور منبروں سے حضرت علیؑ پر لعنت کی جائے۔ (میزان استاد عقاد ص ۱۶)

اب شام میں مجالس وعظ کا خاتمہ سب علیؑ پر ہوتا تھا۔ (ابن عساکر ۳/ ۴۰۷)

اور شیعیانِ اہلبیتؑ کی کوئی گواہی قابل قبول نہ تھی اور حکومت کے دیوان سے ان کے نام کاٹ دئے گئے تھے اور ان کا ہر عطیہ بند کر دیا گیا تھا۔

(المیزان عقاد ص ۱۶، شیخ المضیرہ ص ۱۸۰)

اس کے بعد بنی عباس کا دور آیا تو بقول ابو بکر الخوارزمی "ہارون اس وقت دنیا سے گیا ہے جب اس نے شجرۂ نبوت کو قطع کر دیا تھا اور درخت امامت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا تھا۔" (المیزان عقاد ص ۱۶، شیخ المضیرہ ص ۱۸۰)

یہ منصور دوانیقی ہے جس نے امام صادقؑ کے قتل کا عزم ظاہر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ میں اب تک ذریت فاطمہؑ کے ہزار سے زیادہ افراد قتل کر چکا ہوں اور ان کے سردار و مولا جعفر بن محمدؑ کو چھوڑ رکھا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد امام سے خطاب کر کے کہا کہ میں تمھیں اور تمام گھر والوں کو قتل کر دوں گا تاکہ کوئی تلوار اٹھانے والا نہ رہ جائے اور مدینہ کو یوں تباہ کر دوں گا کہ کوئی دیوار باقی نہ رہ جائے۔

(الحیاۃ السیاسیۃ للامام الرضا ص ۸۷)۔

طبری کا بیان ہے کہ منصور نے اپنے فرزند مہدی کے لئے شہیدوں کے سروں سے بھرا ہوا صندوق بطور ترکہ چھوڑا تھا اور ہر سر کے ساتھ ایک پرچہ تھا جس میں اس امر کی راہنمائی تھی کہ یہ اولادِ فاطمہؑ میں کس کا سر ہے۔ جن میں بوڑھے۔ جوان۔ بچے سب شامل تھے۔

(مناقب ابن شہر آشوب ۳/۳۵۷، بحار ۴/۱۷۸)

یہی وہ منصور ہے جو سادات کو دیواروں میں چنوا دیا کرتا تھا اور قید خانوں میں اس طرح رکھتا تھا کہ لوگ بھوک سے مر جائیں اور پھر ان کی لاش کو بھی باہر نہ نکالا جائے اور باقی افراد بدبو سے ہلاک ہو جائیں۔ حد یہ ہے کہ حوائجِ ضروریہ کے لئے بھی باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔

(تاریخ یعقوبی)

مُردوں کو اتنے دنوں پڑا رہنے دیا جاتا تھا کہ لاش خود ہی گل جاتی تھی۔ اس کے بعد کبھی کبھی زنجیروں میں جکڑے ہوئے قیدیوں پر پوری عمارت گرا دی جاتی تھی اور وہ اسی میں دب کر مر جاتے تھے۔ (طبری ۱۰/۴۴۶، النزاع والتخاصم مقریزی ص ۵۲)

ہارون رشید نے تو قسم کھالی تھی کہ اہلبیتؑ اور ان کے چاہنے والوں کا سلسلہ ہی ختم کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اس کا یہ قول مشہور ہے کہ آخر کب تک اولاد ابو طالب کو برداشت کیا جائے گا۔ خدا کی قسم میں انھیں اور ان کے چاہنے والوں کو قتل کر دوں گا اور ان کے سلسلہ کو مٹا دوں گا۔ چنانچہ وہ برابر ان کی تلاش میں رہا کرتا تھا اور ایک ایک کو قتل کرتا رہتا تھا۔ (الاغانی ابو الفرج اصفہانی ۵/۲۲۵)

منصور دوانیقی نے امام جعفر صادقؑ کو خط لکھا کہ جس طرح تمام لوگ میرے پاس حاضری دیتے ہیں، آپ کیوں نہیں آتے ہیں۔؟

فرمایا کہ ہمارے پاس کوئی ایسی دنیاوی شے نہیں ہے جس کے بارے میں تیرا خوف ہو اور نہ تیرے پاس کوئی ایسی آخرت ہے جس کی امید میں حاضری دی جائے۔ نہ تیرے پاس واقعی نعمت ہے جس کی مبارکباد پیش کی جائے اور نہ کوئی ایسی مصیبت تیرے خیال میں ہے جس کی تعزیت پیش کی جائے۔ تو اب میں آکر کیا کروں۔؟

منصور نے جواب میں لکھا کہ آپ نصیحت کرنے کے لئے میرے ساتھ رہا کریں۔
فرمایا، جسے دنیا کی خواہش ہوگی وہ تجھے نصیحت نہ کرے گا اور جسے آخرت درکار ہوگی وہ تیرے ساتھ نہ رہے گا۔ (العقد الفرید ۲/ ۸۰، کشف الغمہ ابن حمدون ۲/ ۲۰۸، محاضرہ شیخ باقر القرشی در دمشق بتاریخ ۲۶ ستمبر ۹۱ء)

قرابت کی دو قسمیں

۱۔ قرابت قریبہ۔ جس سے مراد حضرات علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ اور انکی نسل طیب ہے۔ یہی پیغمبرؐ کے قریب ترین افراد ہیں اور انھیں پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے گئے ہیں۔ صرف اس لئے کہ ابو طالب نے اسلام اور رسول اسلامؐ کی حمایت میں سخت موقف اختیار کیا تھا اور حضرت علیؑ نے اسلامی جنگوں میں دشمنان اسلام کو فنا کر دیا تھا۔ تو اب خمیازہ انھیں کو برداشت کرنا ہے اور مال غنیمت دوسرے افراد میں تقسیم ہونا ہے۔
۲۔ قرابت بعیدہ۔ جنھوں نے اس بنیاد پر مدتوں حکومت کی ہے کہ یہ رسول اکرمؐ کے قبیلہ میں ہیں اور سارا مال غنیمت انھیں کو حاصل ہوا ہے۔ اہلبیتؑ کا حصہ تو صرف مصائب و آلام تھے اور بس!۔

عترت اطہار کی علیحدگی

حالات کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ جناب فاطمہؑ کی وفات کے بعد عترت پیغمبرؐ کو سماج سے بالکل الگ کر دیا گیا۔ ابتدا اس وقت ہوئی جب عباس کو طلب کیا گیا کہ انھیں اور ان کی اولاد کو حکومت میں حصہ دے کر بنی ہاشم سے الگ کر لیا جائے لیکن اس وقت کامیابی حاصل نہ ہوئی اور عباس نے پیش کش کو ٹھکرا دیا مگر حالات کے ساتھ ایسا انقلاب آیا کہ عترت پیغمبرؐ بنی ہاشم اور عامۃ الناس سب سے الگ ہو گئی۔ اور اس کا سبب یہ تھا کہ ہر شخص یہ دیکھتا تھا کہ یا حکومت کو اختیار کرنا ہے یا حزب اختلاف کو، تو وہ قہری طور پر حکومت کے ساتھ ہو جاتا تھا کہ زمام سلطنت انھیں کے ہاتھ میں ہے اور دوسری طرف

سوائے مصائب کے کچھ نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امت کی اکثریت حکام کے ساتھ ہو گئی اور اہلبیتؑ کے حصہ میں صرف ایک اقلیت آئی اور بقول فرزدق: دل انھیں کے ساتھ رہے لیکن تلواریں بھی انھیں کے خلاف اٹھیں۔

عمر بن سعد بن ابی وقاص جیسا انسان جو امام حسینؑ کے خلاف لشکر یزید کی قیادت کر رہا تھا۔ وہ بھی روز عاشور نماز صبح کے خاتمہ پر پہلے صلوات پڑھ کر نماز تمام کرتا ہے، اس کے بعد قتل حسینؑ و اصحاب حسینؑ کا حکم نافذ کرتا ہے بلکہ قتل کے بعد سروں کو بھی جدا کر دیا جاتا ہے اور ان کی تشہیر بھی کی جاتی ہے اور ان کے لباس کو بھی لوٹ لیا جاتا ہے اور جسموں کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کیا جاتا ہے تاکہ یزید اور ابن زیاد کے دربار میں تقرب حاصل ہو۔

یہ ہے دراصل نتیجہ اس مقولہ کا جس میں اعلان کیا گیا تھا کہ "نبوت اور حکومت ایک خاندان میں جمع نہیں ہو سکتی ہیں۔

امتیازات قرابت کی تاویل

"جسے خدا ثابت بنائے اسے کوئی ہلا نہیں سکتا ہے اور جسے خدا کسی جگہ پر رکھے اسے کوئی ہٹا نہیں سکتا ہے۔"

حکام وقت نے یہ محسوس کر لیا کہ اہلبیتؑ کی خصوصیات اور ان کے امتیازات کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان پر صلوات بہر حال نماز کا فریضہ ہے۔ ان کی طہارت بہر حال قرآن میں مذکور رہے۔ ان کی ولایت بہر حال ثابت ہے۔ ان کی فضیلت کی روایتیں بہر حال گردن دبائے ہوئے ہیں یہانتک کہ اگر ان کے ایک ایک فرد کا خاتمہ کر دیا جائے تو بھی یہ آثار باقی رہیں گے اور صبح و شام حکام کے سامنے آتے رہیں گے۔ لہذا اب ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ ان خصوصیات کی تاویل کی جائے اور تاویل کے سہارے حکومت کا سلسلہ آگے بڑھایا جائے۔

فصل پنجم

نظریۂ عدالت صحابہ سے وابستہ امیدیں

اس نظریہ کے ایجاد کرنے والوں نے اس سے حسب ذیل امیدیں وابستہ کی تھیں:

۱۔ اہلبیتؑ کے امتیازات کی ایسی تاویل کی جائے گی جس کے بعد اس کا مضمون اور مفہوم ہی ختم ہو جائے۔

۲۔ اہلبیتؑ کے امتیاز کے مقابلہ میں ایک متبادل امتیاز ایجاد ہو جائے گا جو حکام کے تعاون سے اہلبیتؑ کی کمی پوری کر دے گا۔

۳۔ ایسے شبہات ایجاد کر دئے جائیں گے کہ امت حیرت وضلالت میں مبتلا ہو جائیگی اور عوام میں تفرقہ پیدا کر کے انھیں جزئی مسائل میں اُلجھا دیا جائے گا اور پھر ان اختلافات کو مزید غذا فراہم کر کے عمیق اور دائمی بنا دیا جائے گا۔

صفات کا مقابلہ

اہلبیت کرامؑ وہ حضرات ہیں جن سے خدا نے ہر رجس کو دور رکھا ہے۔ اور انھیں حق طہارت کی منزل پر فائز کیا ہے۔ ان حضرات میں علیؑ و فاطمہؑ، حسنؑ و حسینؑ کی شخصیت بہرحال مسلمات میں ہے کہ جنھیں مالک کائنات نے طیب و طاہر قرار دیا ہے اور ہر مبشر بالجنۃ سے پہلے جنّت کی بشارت دی ہے۔ یہ حضرات بنصِ رسولؐ سردار جوانان جنت ہیں۔

(کنزالعمال ۱۲/۹۳)

اور ان کی عدالت محتاج بیان نہیں۔ یہ ارباب عصمت ہیں اور جو اکثر کا مالک ہوتا ہے وہ اقل کا مالک بہرحال ہوتا ہے۔ بلکہ بالفاظ دیگر جو دائرہ پر قابض ہوتا ہے

وہ اس کے تمام مشمولات پر بھی قابض ہو جاتا ہے۔

صحابہ۔ میں بزرگ ترین افراد وہ ہیں جنھوں نے اخلاص سے کام کیا ہے اور خدا نے انھیں محترم قرار دیا ہے۔ لیکن کھلی بات ہے کہ مسلمانوں کے حکام اس فہرست میں شامل نہیں ہیں اور ان کی اکثریت ان طلقاء کی ہے جنھوں نے مجبور ہونے کے بعد اسلام قبول کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے جو انھیں اہلبیت کرامؑ کا ہم مرتبہ بنادے۔ صرف ایک نظریہ عدالت صحابہ ہے جو فتح مکہ کے قبل و بعد اسلام لانے والوں کو ایک درجہ میں رکھتا ہے اور قاتل و مقتول کو مساوی قرار دیتا ہے۔

اس نظریہ میں محاصرہ کرنے والوں اور مظلوموں میں کوئی فرق نہیں ہے اور اس دنیا میں مہاجر اور طلیق سب ایک جیسے ہیں۔

اس نظریہ نے منافق کو مومن جیسا بنا دیا ہے اور غیر مخلص کو مخلص جیسا اور سب کو صفت عدالت سے متصف کر دیا ہے۔

گویا کہ اب علیؑ بن ابیطالب جو اہلبیتؑ میں بھی ہیں وہ بھی صحابی ہیں اور معاویہ بھی صحابی ہے۔

یہ بھی عادل ہیں اور وہ بھی عادل ہے۔

یہ بھی جنتی ہیں اور وہ بھی جنتی ہے۔

یہ بھی غلط بیانی نہیں کر سکتے ہیں اور وہ بھی جھوٹ نہیں بول سکتا ہے۔

جب کہ علیؑ بنص رسول ولی خدا اور سابق الاسلام ہیں۔ وہ ہمیشہ لشکر اسلام کے علمبردار رہے ہیں۔ انھوں نے بطل اسلام ہونے کا مظاہرہ کیا ہے اور معاویہ نے اپنے باپ کے ساتھ ہر معرکہ میں اسلام سے مقابلہ کیا ہے اور پھر دونوں نے فتح مکہ کے موقع پر مجبوراً اسلام قبول کر لیا ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ دنیا کی عدالت بھی اس مساوات کو برداشت نہیں کر سکتی ہے چہ جائیکہ آسمانی عدالت۔! اللہ نے بھی دونوں میں فرق رکھا ہے اور رسول اللہ نے بھی۔ بلکہ اعمال و کردار نے بھی۔ تو ایسی صورت میں دونوں کو کس طرح برابر قرار دیا جائے گا اور

نظریۂ عدالت صحابہ کے علاوہ اس کی دلیل، یا اس کا جواز کیا ہوگا۔؟

اس نظریہ نے تمام متقدمین و متاخرین۔ مجاہدین و قاعدین۔ اولین و آخرین کے درمیان پائے جانے والے امتیازات کا خاتمہ کر دیا ہے اور یہ کاروبار صرف اس لئے ہوا ہے کہ اس کے علاوہ اہلبیت کرامؑ کی تطہیر سے مقابلہ کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

ایک واقعی مثال

حضرت علیؑ اہلبیت کے منصوص سردار، ولی امت اور سابق الاسلام ہیں۔ اور اگر کسی کو یہ سبقت گوارا نہیں ہے تو دوسرا درجہ تو بہر حال مسلم ہے اور پھر ارشاد رسولؐ کی بنا پر حق ان کے پیچھے پیچھے چلتا ہے اور ان کی محبّت خدا کی محبت ہے اور ان کی عداوت خدا کی عداوت ہے۔ وہ ہر نظریہ کے اعتبار سے صحابی ہیں اور انھیں جنت کی بشارت حاصل ہے۔

تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ تمام باتیں صحیح ہیں اور علیؑ صحابی رسولؐ ہیں تو منبروں سے ان پر لعنت کیوں کی گئی؟ اور ان پر لعنت کو فریضۂ اسلامی کا درجہ کیوں دیا گیا؟

کیا امت اسلامیہ ہی نے صحابی کو بُرا بھلا کہنے والے کو زندیق۔ کافر قابل مقاطعہ اور ناقابل نماز جنازہ نہیں قرار دیا ہے۔؟

یا نظریۂ عدالت صحابہ سارے صحابہ کے حق میں نافذ العمل رہتا ہے صرف علیؑ کی منزل پر آکر فیل ہو جاتا ہے اور انھیں عدالت کے کمال سے متصف نہیں ہونے دیتا۔

دوسری مثال

حضرت حسنؑ و حسینؑ بنصّ رسول سردار جوانان جنّت ہیں۔ یہ دونوں حضرات رسول اکرمؐ کے پھول اور فرزند ہیں۔ اللہ نے ہر نبی کی ذرّیت کو اس کے صلب سے قرار دیا ہے اور رسول اکرمؐ کی ذریت کو صلب علیؑ سے قرار دے کر انھیں فرزند رسولؐ قرار دیا ہے۔

یہ دونوں حضرات صحابی بھی ہیں اور عادل بھی ہیں۔

صحابی کی توہین و تنقید حرام بھی ہے۔ انھیں بُرا بھلا کہنے والا زندیق۔ کافر اور قابل مقاطعہ بھی ہے۔

لیکن اس کے باوجود جن لوگوں نے امام حسنؑ کو زہر دیا۔ امام حسینؑ اور ان کے بچوں کو قتل کیا۔ ان کی عورتوں کو قیدی بنایا۔ ان پر اور ان کے بچوں پر فرات کا پانی بند کر دیا۔ وہ توہین صحابی کے مجرم نہیں ہیں اور انھیں ان تمام جرائم کے باوجود صحابی عادل ہی کہا جاتا ہے۔

کیا اسلام اور انصاف یہی ہے۔؟

صورت حال کی وضاحت

واضح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ جن لوگوں نے امام حسنؑ کو زہر دیا۔ وہ ہر معنی میں صحابی ہیں۔ جنھوں نے حضرت علیؑ اور امام حسینؑ کو قتل کیا وہ ہر اعتبار سے صحابی ہیں۔ جنھوں نے ذریت رسولؐ کا کربلا میں خاتمہ کر دیا وہ بھی صحابی ہیں۔ جنھوں نے حضرت علیؑ پر سب شتم اور لعنت کی وہ بھی صحابی ہیں اور جنھوں نے محبّانِ علیؑ کی گواہی کو مسترد کر دیا وہ بھی صحابی ہیں۔

سوال؟

تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا امام حسنؑ بھی عادل اور صحابی ہیں اور انھیں زہر دینے والے بھی عادل اور صحابی ہیں۔؟

امام حسینؑ بھی عادل اور صحابی ہیں اور انھیں قتل کرنے والے بھی صحابی اور عادل ہیں۔؟

کربلا میں قتل ہونے والی اولاد رسولؐ بھی صحابی اور عادل ہے اور انھیں قتل کرنے والے بھی عادل اور صحابی ہیں۔؟

جب کہ زہر دینے والا مجرم ہے اور زہر کھانے والا شہید و مظلوم۔ مگر قاتل و مقتول دونوں جنتی ہیں۔ اس لئے کہ دونوں صحابی ہیں اور صحابی عادل اور جنتی ہوتا ہے۔

خدا جانتا ہے کہ اس مساوات نے عقل بشر کو بے قیمت بنا کر رکھ دیا ہے اور انسان کو شرمناک تقلید کی منزل تک پہونچا دیا ہے۔؟ لیکن سچی بات یہ ہے کہ نظریۂ عدالت صحابہ نے اپنا فرض مکمل طور سے ادا کر دیا ہے اور جس کام کے لئے یہ نظریہ ایجاد ہوا تھا اس کا حق ادا ہو گیا ہے۔ اب علیؑ و معاویہ دونوں ایک جیسے ہیں۔ دونوں صحابی۔ دونوں عادل۔ دونوں جنّتی اور دونوں حق بجانب ۔ جو میدان جیت لے وہ واجب الطاعۃ اور جس سال جیت لے وہ عام الجماعۃ۔

مقابلہ اور محافظت

"جس نے اہلبیتؑ کو اذیّت دی اس نے پیغمبرؐ کو اذیّت دی"۔

اس کے مقابلہ میں "جس نے کسی صحابی کو اذیّت دی اس نے پیغمبرؐ کو اذیّت دی"۔

"جس نے اہلبیتؑ سے دشمنی کی وہ جہنمی ہے"۔

اس کے مقابلہ میں۔ "جس نے کسی صحابی سے بغض رکھا وہ جہنمی ہے"۔

صحابیت کی اس مخصوص حمایت کے علاوہ جدید قانون یہ ہے کہ جس نے کسی صحابی کی شان کم کی وہ کافر ہے۔ اس کا بائیکاٹ ضروری ہے اور اس کی نماز جنازہ حرام ہے۔ اسے ایک مُردار کی طرح پھینک دینا چاہیئے۔ گویا کہ نظریۂ عدالت صحابہ نے اہلبیتؑ کی طرح صحابہ کی بھی حمایت کی بلکہ کچھ زیادہ ہی آگے بڑھا دیا۔

مرحلۂ بیان

"قرآن ثقل اکبر ہے اور اہلبیتؑ ثقل اصغر۔ اور ہدایت ممکن نہیں ہے جبتک ثقلین سے تمسک نہ ہو"۔ یہ ہے نص قطعی صریح۔

"اہلبیتؑ کی مثال سفینۂ نوحؑ کی ہے کہ جو اس پر سوار ہو گیا اس نے نجات پائی اور جس نے تخلف کیا وہ غرق ہو گیا"۔ (نص قطعی صریح)

"اہلبیتؑ باب حطہ ہیں جو اس دروازہ سے داخل ہو گیا وہ مغفور ہو گیا"۔

"اہلبیتؑ اس امت کے لئے امان ہیں جس طرح ستارے اہل زمین کے لئے وجہ امان ہوتے ہیں اسی طرح اہلبیتؑ امت پیغمبرؐ کے لئے اختلافات سے بچانے والے ہیں۔"

"امت کی مثال ان کے بغیر اس گدھے کی ہے جس کی کمر ٹوٹ گئی ہو۔"

"اہلبیتؑ کا سردار وفات پیغمبرؐ کے بعد ان تمام امور کی وضاحت کرے گا جن میں اختلاف ہوگا۔"

نظریۂ عدالت صحابہ کے عطایا

"میرے اصحاب کی مثال امت میں ایسی ہی ہے جیسے کھانے میں نمک، کہ نمک کے بغیر کھانا اچھا نہیں ہوسکتا۔ (استیعاب برحاشیہ اصابہ ۱/۷، کنز العمال ۱۲/۲۲)

"اہل زمین کو غرق ہونے سے بچانے والے قریش ہیں اور اختلاف سے بچانے والی قریش کی محبت ہے۔ قریش اہل اللہ ہیں۔ جو قبیلہ بھی قریش سے اختلاف کرے گا وہ گروہ ابلیس میں ہوگا۔" (طبرانی معجم کبیر، حاکم در مستدرک)

"دیکھو میرے اصحاب کے بارے میں خدا کو یاد رکھنا۔ انھیں نشانۂ اعتراض نہ بنانا۔ ان کا دوست میرا دوست ہے۔ اور ان کا دشمن میرا دشمن ہے۔ جس نے ان کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھے اذیت دی اس نے خدا کو اذیت دی اور خدا کو اذیت دینے والا عنقریب پکڑا جائے گا۔ (اصابہ ص ۱۹)

قابل تدبّر احادیث

رسول اکرمؐ نے فرمایا۔ "یا علیؑ جو مجھ سے جُدا ہوا وہ خدا سے جُدا ہوگیا اور جو تم سے جُدا ہوا وہ مجھ سے جُدا ہوگیا۔" (مستدرک حاکم ۳/۱۲۴)

"جس نے علیؑ کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔" (مستدرک حاکم ۳/۱۳۰)

"جس نے علیؑ سے محبّت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے علیؑ سے عداوت کی اس نے مجھ سے عداوت کی۔" (مستدرک حاکم ۳/۱۳۰)

"یا علی، تمھارا دوست میرا دوست ہے اور میرا دوست خدا کا دوست ہے۔ تمھارا دشمن میرا دشمن ہے اور میرا دشمن خدا کا دشمن ہے۔ ویل ہے اس کے لئے جس نے میرے بعد تم سے دشمنی کی۔" (مستدرک حاکم ۳/۱۳۵)

"طوبیٰ ہے اس کے لئے جس نے تم سے محبت کی اور تمھارے بارے میں سچ بولا۔ اور ویل ہے اس کے لئے جس نے تم سے دشمنی کی اور غلط بیانی سے کام لیا۔"

(معجم کبیر طبرانی، کنز العمال ۳/۱۵۴)

"میں اپنے اوپر ایمان لانے والے اور اپنی تصدیق کرنے والوں کو ولایتِ علیؑ کی وصیت کرتا ہوں کہ ان کا دوست میرا دوست ہے اور میرا دوست خدا کا دوست ہے۔ جس نے ان سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی اس نے خدا سے محبت کی۔ جس نے ان سے عداوت کی اس نے مجھ سے عداوت کی اور جس نے مجھ سے عداوت کی اس نے خدا سے عداوت کی۔" (کنز العمال ۶/۱۵۵ حدیث ۲۵۷۶)

"ستارے اہل زمین کو ڈوبنے سے بچاتے ہیں اور اہلبیتؑ امت کو اختلافات سے بچانے والے ہیں۔ جب بھی کوئی قبیلہ ان سے اختلاف یا ان کی مخالفت کرے گا وہ حزب ابلیس میں ہوگا۔"

دریافت طلب امور

۔ اگر کوئی صحابی علیؑ سے عداوت رکھے یا انھیں اذیت دے تو ہمارا موقف کیا ہوگا؟

۔ اگر علیؑ کسی صحابی سے عداوت کریں یا اسے اذیت دیں تو ہمیں کیا کرنا ہوگا۔؟ کون حق پر ہوگا اور کون باطل پر۔؟

۔ اگر قریش یہ کہیں کہ اختلاف سے بچانے والے ہم ہیں اور اہلبیتؑ یہ کہیں کہ اختلاف سے پناہ دلانے والے ہم ہیں، تو ہم کس کی تصدیق کریں گے۔؟

۔ اگر امت کا ایک حصہ قریش کے ساتھ ہو اور ایک اہلبیتؑ کے ساتھ، تو ہم کس کو حق بجانب قرار دیں گے۔؟

۔ اگر صحابہ کا ایک حصہ "اصحابی کالنجوم" (جیسی جھوٹی روایت جسے ابن تیمیہ نے المنتقی ص ۵۱۱ پر ضعیف قرار دیا ہے) کی روشنی میں علیؑ کے ساتھ ہو جائے اور دوسرا حصہ معاویہ کے ساتھ ہو، اور تیسرا غیر جانبدار ہو جائے اور چوتھا حالات کا انتظار کرتا رہے تاکہ غالب آنے والے کے ساتھ ہو جائے۔ تو کیا ہر قسم کا اتباع کرنے والا حق پر ہوگا، یا کسی کو باطل بھی قرار دیا جائے گا۔؟

۔ اس وقت کیا کرنا ہوگا جب ایک صحابی یہ کہے کہ حق میرے ساتھ مشرق میں ہے اور دوسرا کہے کہ میرے ساتھ مغرب میں ہے، اور تیسرا کہے کہ میرے ساتھ شمال میں ہے اور چوتھا کہے کہ میرے ساتھ جنوب میں ہے، اور پانچواں کہے کہ میرے ساتھ ۴۵ ڈگری شمال کے زاویہ میں ہے اور امت ۷۳ حصوں میں تقسیم ہو جائے اور ہر ایک کے پاس ایک ذریعہ ہو۔ تو کیا عقل وشرع کی روشنی میں سب کو برحق کہا جا سکتا ہے جب کہ حق ایک ہی ہوتا ہے اور افتراق جرم ہے۔ کیا پیغمبرؐ نے امت میں تفرقہ پیدا کرنا چاہا ہے جبکہ اتحاد قربت الٰہی کا ذریعہ ہے۔

بالواسطہ اتمام حجت

رسول اکرمؐ نے علیؑ کو مخاطب کر کے فرمایا "تم میرے پیغام کے پہونچانے والے میری آواز کے سُنانے والے اور اختلافات کی وضاحت کرنے والے ہو"۔ (شرح نہج البلاغہ)

ابو حنیفہ باوجودیکہ قیاس کے زبردست حامی تھے لیکن ان کا بھی یہ طریقہ تھا کہ وہ صحابی کی رائے کو قیاس پر مقدم کر دیتے تھے۔ (المستصفیٰ للغزالی ص ۱۳۵-۱۳۶)

ان کا مشہور قول تھا کہ "اگر مجھے کتاب خدا اور سنت رسولؐ میں کوئی حکم نہیں ملتا ہے تو میں قول اصحاب کو اخذ کرتا ہوں، اور اگر ان کی رائے میں اختلاف ہوتا ہے تو جس کی رائے کو چاہتا ہوں لے لیتا ہوں اور جس کو چاہتا ہوں نظر انداز کر دیتا ہوں لیکن ان کے قول کو چھوڑ کر تابعین کے قول کو اختیار نہیں کرتا۔ (ابو حنیفہ لابی زہرہ، ص ۳۰۴)

ابن القیم اعلام الموقعین میں رقم طراز ہے کہ "امام احمد کے نزدیک اصول احکام پانچ ہیں، ۱۔ نص ۲۔ فتویٰ صحابہ۔ احناف اور حنابلہ اس بات کے قائل ہیں کہ کتاب خدا

کو عمل اصحاب سے تخصیص دیا جاسکتا ہے اس لئے کہ صحابی عالم بلا وجہ عمومات کتاب کو نظر انداز نہیں کرتا ہے اور جب وہ عموم پر عمل نہیں کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تخصیص پر کوئی دلیل موجود ہے اور صحابی کا عمل اس کے قول ہی کی طرح سند ہے"۔

(المدخل الی علم اصول الفقہ لمعروف الدوالیبی)

اس مقام پر پہلے سنت رسولؐ (قول و عمل و تقریر) کو یاد کیجئے اس کے بعد اس فتویٰ کا جائزہ لیجئے کہ قول صحابی سے عمومات کتاب کو تخصیص دیا جاسکتا ہے۔ گویا کہ قول صحابی کوئی وحی سماوی ہے جس میں باطل کا کسی طرف سے گذر نہیں ہے۔

نظریۂ عدالت صحابہ نے صحابہ کو وہ حق دے دیا ہے جو شریعت نے ائمہ اہلبیتؑ کو بھی عطا نہیں کیا ہے۔

ابن خلدون کا بیان ہے کہ سارے صحابہ اہل فتویٰ نہیں تھے اور نہ سب سے دین اخذ کیا جاسکتا ہے۔ یہ کام صرف حاملان قرآن کا تھا جو ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ وغیرہ سے باخبر تھے اور دیگر ادلہ کا بھی ادراک رکھتے تھے۔ اور اسی بنا پر انھیں قراء کہا جاتا تھا کہ عرب امی محض تھے اور جسے قرآن مجید کا ادراک ہوتا تھا اسے قراء کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا اور یہ سلسلہ صدر اسلام میں جاری رہا۔

محمد بن ابی سہل بن ابی خیثمہ نے اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ" عہد پیغمبرؐ میں جو حضرات فتویٰ دیا کرتے تھے وہ تین افراد مہاجرین میں سے تھے اور تین انصار میں سے، عمر و عثمان، علیؑ۔ ابی بن کعب، معاذ بن جبل۔ زید بن ثابت۔

عبدالرحمٰن بن القاسم نے اپنے باپ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر کو جب کسی مسئلہ میں مشورہ کی ضرورت ہوتی تھی تو مہاجرین و انصار میں سے مخصوص افراد عمر، عثمان، علیؑ، عبدالرحمٰن بن عوف، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، زید بن ثابت کو طلب کیا کرتے تھے اور یہی افراد ان کے دور خلافت میں فتویٰ دیا کرتے تھے۔ ابوبکر کے بعد دور خلافت عمر میں بھی یہی افراد مرکز فتویٰ بنے رہے۔

(طبقات ابن سعد ۳/۱۶۸، آراء علماء المسلمین ص ۵۰)

تفقہ کی وسعت

نظریۂ عدالت صحابہ نے رسول اکرمؐ کی طرف سے حضرت علیؑ کو ملنے والی حیثیت کا بھی خاتمہ کر دیا اور خلفاء اسلام کے دور حکومت کی سیرت کا بھی خاتمہ کر دیا کہ حضرت ابوبکر و عمر مخصوص انصار و مہاجرین کو صاحب رائے اور صاحب فتویٰ تصور کرتے تھے اور اس نظریہ نے ہر صحابی کو فقیہ بنا دیا کہ جس کا جی چاہے اپنی رائے کو مذہب میں داخل کر دے اور پھر مجتہد کو یہ اختیار بھی رہے کہ جس کی رائے کو چاہے اخذ کر لے اور جس کی رائے کو چاہے مسترد کر دے اور یہ سب صرف اس لئے ہے کہ سب صحابہ ہیں اور سب عادل ہیں اور سب کے سچے اور جنتی ہونے کی ضمانت موجود ہے اور سب کا دشمن کافر ہے۔ گویا کہ اس طرح تمام اوراق مخلوط ہو گئے اور مقدم و موخر، طلیق و مہاجر کا فرق بالکل ختم ہو گیا اور سب عادل قرار پا گئے اور کسی کو زبان کھولنے کا حق بھی نہیں ہے کہ نظریۂ عدالت نے سب کی رائے، سب کی روایت کو ایسا معتبر بنا دیا ہے کہ اس میں کسی طرف سے باطل کا امکان نہیں ہے۔ اب صحابہ کرام عموم کتاب کو تخصیص دے سکتے ہیں۔ مطلق کو مقید بنا سکتے ہیں۔ اسی لئے علماء اسلام نے سارا زور راویوں کے حالات اور ان کی سیرت و امانت و صداقت پر صرف کر دیا کہ اگر راوی کا اعتبار ثابت ہو گیا اور روایت صحابی تک پہونچ گئی تو آگے کوئی مسئلہ نہیں ہے کہ روایت صحابی سے صادر ہوئی ہے اور صحابی بہرحال عادل ہوتا ہے۔

راویوں کی عقائدی پابندی

راوی کو یہ اختیار ہے کہ وہ ابوبکر، عمر، عثمان، سعد یا کسی بھی صحابی کا چاہنے والا ہو جائے اس کی صداقت و امانت پر کوئی اثر نہ پڑے گا اور اس کی روایت معتبر ہی رہے گی لیکن اگر کہیں علیؑ اور اہلبیتؑ کا موالی ہو گیا اور ان کے شیعوں میں شمار ہو گیا تو اس کا ثقہ ہونا محال ہو جائیگا اور اس کی روایت ہرگز قابل اعتبار نہ ہو گی بلکہ اگر روایت کے متعدد راویوں کے درمیان ایک بھی محب اہلبیتؑ نکل آیا تو روایت کا اعتبار ختم ہو جائیگا۔ اس لئے کہ علماء اسلام صرف ثقہ راویوں

کی روایت قبول کرتے ہیں اور ثقہ آدمی محب اہلبیتؑ نہیں ہو سکتا ہے۔ (انا للہ.....)

ابو عمر بن عبد البر کا بیان ہے کہ ہم سے محمد بن وضاح کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے کہ میں نے یحییٰ بن معین سے محمد بن ادریس الشافعی کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ ثقہ نہیں ہیں۔ جب کہ یحییٰ ابن معین ائمہ جرح و تعدیل میں عظیم شخصیت کے مالک ہیں اور ان کے قول کو حجت تسلیم کیا جاتا ہے۔ اب آپ سوچیں کہ ابن معین کی نظر میں امام مذہب بھی معتبر نہیں ہیں اس لئے کہ ان میں اہلبیتؑ کی طرف رجحان پایا جاتا ہے۔

ذہبی نے اس نکتہ کا احساس کیا کہ یہ بات انتہائی غیر معقول ہے لہٰذا انھوں نے کہا کہ شافعی کے بارے میں ابن معین کا قول تعصب و خواہشات کی بنا پر لغزش زبان کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

دوسری طرف امام جعفر صادقؑ جو مذاہب اربعہ کے ائمہ کے استاد اور ایک ایسے مدرسۂ فکر کے موسس ہیں جس میں چار ہزار رجال فکر نے علم حاصل کیا ہے اور مذہب اہلبیتؑ کے ذمہ دار ہیں۔ انھیں ابو حاتم اور نسائی نے معتبر قرار دیا ہے لیکن بخاری نے ان کی روایت سے استدلال نہیں کیا ہے اور گویا انھیں غیر معتبر قرار دے دیا ہے جب کہ مروان بن الحکم سے روایت کی ہے۔

یحییٰ بن معین سے سعید بن خالد البجلی کی وثاقت کے سلسلہ میں کہا گیا کہ وہ بھی تو شیعہ تھے تو انھوں نے فرمایا کہ شیعہ تھے اور ثقہ۔ گویا یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ انسان شیعہ بھی ہو اور معتبر بھی ہو۔ ہاں محب اہلبیتؑ نہ ہو تو یقیناً معتبر ہے جیسا کہ عجلی نے قائد لشکر یزید عمر بن سعد بن ابی وقاص کے بارے میں کہا ہے کہ تابعی ثقہ تھا اور اس سے بہت سے لوگوں نے روایت کی ہے۔

یہی بیان عجلی کا عمران بن حطان کے بارے میں ہے جس نے ابن ملجم کے قاتل علیؑ ہونے پر اس کی شان میں قصیدہ لکھا ہے کہ "یہ ایک مرد متقی کی ضربت تھی جس کا مقصد صرف رضائے الٰہی کا حاصل کرنا تھا۔"!

باب سیوم

مرجعیت

فصل اوّل

مرجعیت

یہ ایک انتہائی واضح امر ہے کہ نظریۂ عدالت صحابہ نے ایک ایسی مرجعیت ایجاد کر دی جس کے اثرات فقہ اور سیاست دونوں پر پڑے اور مسلسل نقل و تقلید کی بنا پر اسے ایک شرعی مرجعیت کی حیثیت حاصل ہو گئی اور پھر واقعی مرجعیت ایسی نظر انداز ہو گئی کہ ایک عجیب و غریب شے نظر آنے لگی اور اس کا سبب یہ تھا کہ ہر دور میں اسے بھلایا گیا اور متبادل مرجعیت کا پروپیگنڈہ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے یہ گمان کرنا شروع کر دیا کہ قانونی مرجعیت ہی غیر قانونی ہے اور متبادل مرجعیت ہی قانونی مرجعیت ہے۔ "وان بعض الظن اثم"۔

اس سلسلہ میں پاکیزہ شرعی حقائق کے بیان کرنے کے لئے ایک مستقل باب کی ضرورت ہے۔

مفہوم مرجعیت

مرجعیت سے مراد اسلام کا وہ حصہ ہے جہاں عقائد و احکام کو تخمینی اور فرضی انداز سے بیان نہیں کیا جاتا ہے بلکہ حقیقی اور یقینی اعتبار سے واضح کیا جاتا ہے کہ گویا یہی بیان حکم واقعی اسلام ہے اور انسان اس بیان کے طفیل میں عقائد کو ایک ایمانی اور عقلی حقیقت کے انداز سے اختیار کرتا ہے اور یہیں سے عقلی اور فکری حرکت کا آغاز ہوتا ہے جس پر مذہب کی پوری عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔

نبی خدا اپنی زندگی میں واقعی مرجع مسلمین ہوتا ہے جس کی طرف تمام عقائدی امور میں رجوع کیا جاتا ہے اور اس کا بیان قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے کہ وہ تمام احکام میں سب سے

زیادہ واقفیت رکھتا ہے۔ نبی کے بعد یہ حیثیت اہلبیتؑ کے سربراہ کی ہوتی ہے کہ وہ شیعی نقطۂ نظر سے عقائد و احکام میں ساری امت سے اعلم ہوتا ہے۔ اور اہلسنت کے نزدیک یہ مرجعیت افراد یا اجتماع صحابہ کا حصہ ہے کہ وہ اجتماعی طور پر سب عادل اور جنتی ہیں اور انھیں کے ذریعہ دین ہم تک پہونچا ہے لہذا وہ دین کا مرجع ہیں۔ ان میں سے جس کی بھی اقتدا کر لی جائے گی ہدایت حاصل ہو جائے گی اور صحابہ کے مرجانے کے بعد یہ حیثیت حاکم اسلامی کی ہو گی کہ وہ میدان میں آجانے والی تمام فکروں میں سے کسی ایک فکر کا انتخاب کر لے گا اور اسی کی روشنی میں فیصلہ کرے گا۔ یہ فکریں اگرچہ صحابہ ہی کے اجتہادات کا نتیجہ ہیں۔ لیکن ان میں انتخاب کا حق حاکم کو ہو گا۔ اس لئے کہ اس نے غلبہ حاصل کر لیا ہے اور بقول "حضرت عبداللہ بن عمر" ہم اس کے ساتھ ہیں جس کے ساتھ غلبہ ہو۔ لہذا غالب ہی مرجع ہے اور وہی اجتہاد کرے گا یا مختلف آراء و افکار کے درمیان انتخاب کرے گا اور باقی لوگ اس کا اتباع کریں گے۔ چاہے وہ غلبہ حاصل کرنے والا خود مجتہد ہو یا نہ ہو۔ اور جن کے افکار کے درمیان انتخاب کیا ہے وہ خود مجتہد رہے ہوں یا نہ رہے ہوں۔

عقیدہ اور مرجعیت کا تلازم

حقیقت امر یہ ہے کہ عقیدہ اور مرجعیت کے درمیان گہرا رابطہ پایا جاتا ہے کہ مرجعیت عقیدہ ہی سے پیدا ہوتی ہے اور نہ عقیدہ کے بغیر کوئی مرجعیت ہے اور نہ مرجعیت کے بغیر کوئی عقیدہ ہے۔ مرجعیت کا مصرف ہی عقائد کا بیان اور ان کی تشریح ہے۔ نبی ان عقائد کو اسی انداز سے بیان کرتا ہے جس طرح خدا کا مقصود ہوتا ہے اور مرجع نبی کے بعد اسی طرح وضاحت کرتا ہے جس طرح خدا و رسولؐ کا ارادہ ہوتا ہے۔

عقیدۂ الٰہیہ ہی اقوال و افعال کے معانی و مفاہیم طے کرتا ہے اور عقیدہ ہی سے اس کے وسائل اور اہداف طے پاتے ہیں اور ماننے والوں کے درمیان روابط اور تعلقات کی تحدید ہوتی ہے۔ گویا مرجعیت کا بنیادی عمل عقائد کا مکمل بیان اور حالات

ہران کی مکمل تطبیق ہے۔ مرجع ہی اس امر کا ذمہ دار ہوتا ہے کہ نصوص و قواعد و اہداف کی وضاحت کرے اور پھر انھیں نظریات سے تطبیق کی منزل تک لے آئے اور کلمہ سے حرکت کی طرف قدم آگے بڑھا کر دعوت کو دولت و حکومت کے سانچے میں ڈھال دے۔

نبی کے ذریعہ عقیدہ الٰہیہ کا بیان دین کا ایک حصہ ہے اور عقیدہ ہی کا ایک مفہوم ہے کہ وہ نبیِ خدا ہے اور اسے اسی کام کے لئے بھیجا گیا ہے۔ لیکن اس کے بعد کسی بھی امام در ہنما کا بیان عقیدہ کا جزء نہیں ہے بلکہ ایک دستوری وضاحت ہے جو ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو اپنے عمل کو مقصود الٰہی کے مطابق انجام دینا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس مرجعیت کا اتباع واجب ہے اور اس کی مخالفت حرام ہے کہ وہ شرعی امام ہے اور نبی کا قائم مقام ہے اور اس کی اطاعت بھی گویا نبی ہی کی اطاعت ہے۔

مرجعیت ایک فنی عمل

عقیدہ ایک سفینہ ہے اور مرجع اس کا ناخدا۔

عقیدہ خدائی منصوبہ کا نقشہ ہے اور مرجع اس کا انجینیر جو اس کے نقوش کی وضاحت کرتا ہے اور اسے کاغذ سے نکال کر زمین تک پہونچا دیتا ہے۔

اس کی حیثیت عمارت کے معلم کی ہے اور یہ ایک مجنونانہ کام ہے کہ انسان نقشہ دیکھ کر تعمیر کا کام شروع کر دے اور معلم یا انجینیر سے مشورہ بھی نہ کرے اور اس کی ہدایت سے فائدہ بھی نہ اٹھائے۔

اسلامی عقائد کی دنیا میں مرجع کو تمام اہل زمانہ سے زیادہ اعلم ہونا چاہیئے۔ اس کے اخلاص کو سب سے بہتر ہونا چاہیئے۔ اس کا اعتماد خدا پر سب سے زیادہ ہونا چاہیئے۔

وہ سب سے افضل ہو اور قیادت و مرجعیت کے لئے سب سے زیادہ موزون و مناسب ہو۔

کہ وہی فیصلہ کرنے والا ہوتا ہے اور اسی کو حکم الٰہی کا ترجمان کہا جاتا ہے اور اسی کا اقدام مقصود الٰہی کا بیان و ترجمان تصور کیا جاتا ہے۔

تعدد مراجع

اسلامی عقیدہ میں واقعی مرجع ایک ہی ہوتا ہے جو پہلی منزل پر نبی خدا ہوتا ہے جس طرح موسیٰ اپنے دور کے مرجع اعلیٰ تھے اور ان کے قوم سے جُدا ہونے کے بعد ہارون ان کی جگہ پر مرجع اور ان کے تابع تھے ورنہ دونوں جمع ہو جائیں تو مرجع دو نہیں بلکہ مرجع موسیٰ ہیں اور ہارون ان کے تابع۔ یہی حال جناب عیسیٰ کا تھا کہ وہ دین مسیحیت کے جملہ معاملات میں مرجع وحید تھے اور ان کے علاوہ دوسرا کوئی مرجع نہ تھا ورنہ ایک عقیدہ میں مرجعیت کا تعدد حتمی طور پر عقیدہ کو پراگندہ کر دے گا اور اس کے ماننے والے مختلف جماعتوں میں تقسیم ہو جائیں گے اور ہر شخص نئے عقائد کا استنباط کرے گا۔

اسلام میں "عقائد کی دنیا میں" مرجعیت ایک مرجعیت ہے اور وہ ایک تخصص اور امتیاز ہے جو دین کی عظیم ترین ضرورت بھی ہے مرجعیت کا خاتمہ ہو جائے تو ہر مسلمان بلکہ پورا اسلامی معاشرہ بے لگام ہو جائے گا اور غلطیوں کے مسلسل ارتکاب کی بنا پر اسی کو حق سمجھ لے گا کلمۂ اسلام متفرق ہو جائے گا۔ امت اسلامیہ منتشر ہو جائے گی اور اس وقت تک دوبارہ اتحاد نہ پیدا ہوگا جب تک کوئی ایسا مرجع نہ پیدا ہو جائے جس کا کلمہ حقیقتاً کلمۂ عقل و ایمان ہو اور اسے تمام مسلمان بطیب خاطر منظور کریں کہ دعوت اسلامیہ کا یہی ایک راستہ ہے۔

عقیدہ و مرجعیت کا فرق

عقیدہ و مرجعیت میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو دعوت اور داعی میں پایا جاتا ہے۔ دعوت محمدی درحقیقت دو بنیادوں پر قائم تھی۔ قرآن کریم اور سنت رسولؐ۔

قرآن کریم عقیدہ ہے اور قرآن کریم کا وہ بیان جو قول و فعل و تقریر رسولؐ کی شکل میں سامنے آیا ہے وہ عقیدہ کا ایک جزء لاینفک ہے۔ اس پر اعتماد و ایمان اور اس کی محبت و اطاعت سب ضروری ہے کہ رسول بھی دین کا ایک جزء لاینفک ہے۔ اس کا

قول ہر مسئلہ میں قول فیصل ہے اور وہ اعلم بالعقیدہ بھی ہے اور افضل امت بھی ہے اور قیادت امت کے لئے انسب بھی ہے۔

اس کے بعد جب دین مکمل ہوگیا اور نعمت الٰہی تمام ہوگئی۔ قرآن نے تمام عقائد بیان کردئے۔ رسول اکرمؐ جوار رحمت الٰہی میں پہونچ گئے تو اب عقیدہ یعنی قرآن حکیم اور بیان عقیدہ یعنی قول وعمل وتقریر رسولؐ باقی رہ گیا۔ اور مرجعیت ایک دوسرا موضوع ہے جس کا کام عقیدہ الٰہیہ کی وضاحت اور اسے زندگی کے وقائع پر منطبق کرنا ہے۔

واضح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ عقیدہ ایک سفینہ ہے اور مرجع اس کا ناخدا۔

عقیدہ ایک خدائی نقشہ ہے اور مرجع اس کا مہندس۔

عقیدہ تعمیر کا بنیادی مواد ہے اور مرجع معلم تعمیر۔

عقیدہ ایک فکری تعمیر ہے اور مرجع اس کے موقف کا ترجمان۔

عقیدہ ایک عظیم دواخانہ ہے جس میں ہر مرض کا علاج پایا جاتا ہے اور مرجع اس کا طبیب جو مرض کی تشخیص کرکے مناسب دوا استعمال کراتا ہے۔

لٰہذا مرجع کے بغیر عقیدہ نہ مفید ہوسکتا ہے اور نہ اس منزل تک پہونچا سکتا ہے جس کے لئے اس عقیدہ کا نزول ہوا ہے۔

وجود مرجعیت کی حکمت

اگر پروردگار عالم ہر انسان کی طرف وحی نازل کرکے اسے خیر کی طرف کھینچ لیتا اور ہر ایک کے ساتھ ایک مَلک مقرر کردیتا جو اسے ہر آن نیکی کے راستے پر چلاتا رہے تو انسان مجبور ہوکر نیک عمل تو کرلیتا لیکن اجر وثواب کا حقدار نہ ہوتا۔ اس لئے نظریہ ابتلاء الٰہی کا تقاضا تھا کہ پروردگار انسان کو حق وباطل کی تمیز دیدے اور پھر حق وباطل کی وضاحت کردے اور انسان کو اس کے ارادہ واختیار کے رحم وکرم پر چھوڑدے تاکہ وہ حق یا باطل کو اپنے ارادہ، اپنی آزادی اور اپنی مرضی کے مطابق اختیار کرے۔ اور

اس طرح ثواب یا عذاب کا حقدار قرار دیا جا سکے۔

یہی وہ سرزمین ہے جہاں سے الٰہی رسالت اور مرجعیت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ رسالت انسانی ہدایت کا سرچشمہ ہے اور مرجعیت بیان رسالت الٰہیہ کی ضرورت ہے۔ گویا نظریہ رسالت کے دو محور ہیں:

۱۔ رسول جو پیغام الٰہی کو پہونچاتا ہے اور وہ رسالت کا زمینی مرجع ہوتا ہے۔

۲۔ پیغام جس کا ایک مضمون ہوتا ہے اور اس کا زمین تک پہونچنا رسول یا مرجع کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ پیغام خدا کی طرف سے تیار کیا گیا ہے اور ایک طرح کا الٰہی منصوبہ ہے۔ جہاں اللہ خود بھی تمام مسائل رسالت میں رسول کا مرجع اعلیٰ ہے۔

پہلے مرحلہ پر رسول یا مرجع کا انتخاب ہوتا ہے۔ اس کے بعد رسول کو رسالت کے مفاہیم و مضامین سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد تیسرے مرحلہ میں رسول اس پیغام کو قوم تک پہونچاتا ہے اور اسے واضح طور پر بیان کر کے اس کے ردعمل کو دیکھتا رہتا ہے لوگ اس کی طرف اس لئے رجوع کرتے ہیں کہ وہ تنہا وہ مرجع ہے جو پیغام کو یقینی طور پر جانتا ہے اور مشکلات میں اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرتا ہے۔

تاریخ میں ہر رسول اپنی قوم کا مرجع رہا ہے۔ وہی عقیدہ کی وضاحت کرتا رہا ہے اور اسی نے مضامین رسالت کو افکار سے تطبیق کی منزل تک پہونچایا ہے اور اس کے نفاذ کا خدا پسند انتظام کیا ہے۔

اس کے بعد جب رسول دنیا سے رخصت ہو گیا تو عقیدہ بہرحال باقی رہ گیا اور اس کے ماننے والے بھی باقی رہ گئے، جس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مرجع بھی ہونا چاہیئے تاکہ وہ مضامین عقیدہ کی وضاحت کرتا رہے اور تطبیق و نفاذ کی نگرانی بھی کرتا رہے۔

مرجعیت ناقابل انکار حقیقت

میرا وہ مضمون جو ۱۷ صفر ۱۴۱۲ھ کو اردن کے جریدہ "اللواء" عدد ۹۵۵ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں میں نے اس حقیقت کا اعلان کیا تھا کہ:

"عربوں کے تمام دینی گروپ جانتے ہیں کہ تاریخ بشریت میں اس روئے زمین پر کبھی الٰہی رسالت کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا ہے تو اب ان تمام احزاب سے میرا یہ سوال ہے کہ پروردگار عالم نے کس دور میں رسالت کو بغیر رسول کے بھیجا ہے یا عقیدہ قوم کو بغیر کسی مرجع کے دے دیا ہے۔ یہ دنیا کی وسعت ہے طول و عرض، تحت و فوق۔ آدم سے لے کر آج تک ہر دور کا جائزہ لے کر بتاؤ کہ کب ایسا حادثہ ہوا ہے اور اگر ایسا ممکن نہیں ہے تو اندھی تقلید کو چھوڑو اور اپنے نفس اور دین کے بارے میں خدا سے ڈرو اور اس بشریت پر رحم کرو جو تم سے بڑی امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہے کہ تم اسے مادیت کے چنگل سے آزاد کرا کے الٰہی احکام کی وسعتوں تک پہونچاؤ گے۔

عقیدہ اسلامیہ کا ایک مرجع تھا جس کا نام تھا رسول اکرمؐ۔ اور اس نے اپنے بعد کے لئے مرجع معین کر دیا ہے۔ اس لئے کہ مرجعیت ایک ضرورت زندگی ہے۔ ہر خاندان کا ایک مرجع ہوتا ہے۔ ہر حکومت کا ایک مرجع ہوتا ہے۔ ہر نظام کا ایک مرجع ہوتا ہے۔ ہر عقیدہ کا ایک مرجع ہوتا ہے جو اسے دعوت سے دولت تک پہونچاتا ہے۔ امت اسلامیہ کی سب سے بڑی مصیبت یہی ہے کہ وہ الٰہی مرجعیت سے دور ہو گئی ہے اور اس نے متوازی مرجعیت کو اختیار کر لیا ہے جسے غلبہ نے مسلط کیا ہے اور اندھی تقلید نے مقبول بنا دیا ہے۔" (انا للہ)

فصل دوم

عقیدہ

عقیدہ اور مرجعیت کے درمیان ایک بنیادی رابطہ پایا جاتا ہے کہ جہاں بھی کوئی عقیدہ ہو وہاں ایک مرجعیت کا ہونا ضروری ہے اور اس کے بغیر عقیدہ کا وجود صرف خیالی بن کر رہ جائے گا۔

اس امر کی وضاحت کے لیے چند باتیں عقیدہ سے متعلق بیان کرنا ضروری ہیں تاکہ اس تلازم اور ضرورت کا احساس کیا جا سکے۔

عقیدہ کیا ہے؟

عقیدہ عام طور سے افکار۔ مبادی۔ قواعد اور اقدار کے اس مکمل مجموعہ کا نام ہوتا ہے جو موجودہ کائنات کی تفسیر کرتا ہے اور آئندہ کے بارے میں لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ عقیدہ حال اور مستقبل دونوں سے متعلق ہوتا ہے چاہے وہ صحیح ہو یا غلط۔ جامع ہو یا محدود۔ کامل ہو یا ناقص۔

عقیدہ ہر اس جماعت کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے جو اس سے مطمئن ہو جائے اور پھر اسی کی روشنی میں قوم اپنے اہداف اور وسائل کا تعین کرتی ہے۔

عقیدہ ایک مرکزی نقطہ اور ایک توجیہی نظام ہے جو قوم کی زندگی کو مشروع اور مطابق اصول بناتا ہے اور پھر اس کے خیر و صلاح کا سرچشمہ ہوتا ہے۔

اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ عقیدہ اپنے ماننے والوں کے درمیان ایک سیاسی طاقت کا بھی طلبگار ہوتا ہے تاکہ ان کے مشکلات کا مناسب حل پیش کر سکے اور ان کے

مستقبل کو درخشاں بنا سکے اور اسے یہ اطمینان رہے کہ عقیدہ کے پاس قوم کے خیر عام کے فراہم کرنے کے وسائل موجود ہیں۔

یہی وہ شے ہے جو ماننے والوں کے دلوں میں راسخ ہو جاتی ہے اور انھیں ایک خاص راستہ پر آگے بڑھاتی رہتی ہے اور عقیدہ یہ ثابت کرتا رہتا ہے کہ اس میں قوم کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور وہ مخصوص نظریات کی روشنی میں قوم کو آگے بڑھا سکتا ہے۔

یہ سیاسی طریقۂ کار ہی وہ مکمل سیاسی پروگرام ہوتا ہے جسے عقیدہ پیش کرتا ہے اور اس کی روشنی میں یہ اعلان کرتا ہے کہ ہمارے پاس نکتہ، فلسفہ، مبادی کا وہ ذخیرہ ہے جسے کسی وقت بھی آزمایا جا سکتا ہے اور ہمارے پاس اہداف کے حصول کے وہ وسائل پائے جاتے ہیں جن سے کسی وقت بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

عملی طور پر یہ ساری باتیں اسی وقت ممکن ہوتی ہیں جب ایک حکومت اور اقتدار ہو جو اس حیاتی پروگرام کو عالم افکار سے نکال کر عالم واقعیات تک لے آئے اور اپنی صلاحیت کا اثبات کر سکے۔

عقیدہ کی اس تفسیر کی بنا پر سرمایہ داری بھی ایک عقیدہ ہے اور اشتراکیت بھی ایک عقیدہ ہے جو اپنے مکمل پروگرام کے ذریعہ عالم انسانیت کے لئے خیر وصلاح وفلاح کے پیش کرنے کا دعویدار رہا ہے۔

عقیدہ کی دو قسمیں

عالم بشریت میں ہمیشہ دو طرح کے عقائد اور نظام رہے ہیں:

۱۔ الٰہی عقیدہ و نظام جسے مالک کائنات نے مرتب کیا ہے۔

۲۔ دنیاوی نظام جسے فرد یا جماعت نے تیار کیا ہے۔

عقیدہ سازی کے لوازمات

اگر کوئی انسان عقیدہ اور اس کی ترکیب کے بارے میں غور کرے گا تو اسے صاف

محسوس ہو جائے گا کہ انسان عقیدہ کو سمجھ سکتا ہے لیکن عقیدۂ صحیحہ کی تشکیل نہیں کر سکتا ہے۔ اس میں اس کام کی صلاحیت ہی نہیں رکھی گئی ہے اور وہ اس کام کے لئے پیدا ہی نہیں ہوا ہے یا دوسری لفظوں میں یوں کہا جائے کہ سارا عالم بشریت ایک نقطہ پر متحد بھی ہو جائے تو بھی ایک صحیح اور یقینی عقیدہ کی تشکیل نہیں کر سکتا ہے جب کہ سارے عالم بشریت کا ایک پلیٹ فارم پر اجتماع خود ہی ایک نامکمل عمل ہے۔

عقیدہ کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ بنانے والا عالم انسانیت کے پورے ماضی پر نظر رکھتا ہو اور اس کا ذاتی تجربہ رکھتا ہو تاکہ اسی کی بنیاد پر دوسری منزل کی تعمیر کر سکے۔

اس کے علاوہ اس کے پاس فطرت انسانی۔ ضروریات فطرت۔ جذبات و محرکات کا مکمل اور یقینی علم ہو اور پھر مستقبل کی یقینی معرفت بھی رکھتا ہو۔ اس لئے کہ مستقبل ہی عقیدہ کی کامیابی یا ناکامیابی کا فیصلہ کرے گا اور اسی کے واسطے عقیدہ تیار کیا جاتا ہے۔ ان سب کے علاوہ خود کائنات کا بھی یقینی علم رکھتا ہو تاکہ عقیدہ نظامِ کائنات سے متصادم نہ ہونے پائے اور یہ تمام باتیں وہ ہیں جن کا دعویٰ نہ کوئی فرد کر سکتا ہے اور نہ اجتماع اور نہ یہ کام عالم بشریت کے بس کا ہے۔

بشر کا بنایا ہوا نظام بہر حال ناکام ہوگا چاہے جلدی ہو یا بدیر اور اس کا بنیادی راز یہی ہے کہ بشر کی فطرت میں اس کام کی صلاحیت نہیں رکھی گئی ہے۔

یقینی عقیدہ جو ہمیشہ اقتدار کی صلاحیت رکھتا ہے صرف خدا سازعقیدہ ہے جسے مالک کائنات نے پیش کیا ہے اور جس کا نام اسلام ہے اور جس کی بنیاد پر حضرت محمد مصطفیٰؐ نے اسلامی حکومت قائم کی تھی۔

اسلامی عقیدہ کے مظاہر

۱۔ عملی سطح پر۔ اسلام، مالک کائنات کے سامنے جملہ شئونِ حیات، دنیویہ و اخرویہ میں مکمل طور پر انقیاد اور خضوع کا نام ہے جہاں مسلمان فرد۔ مسلمان جماعت اور مسلمان

حکومت کے سب اعمال الٰہی اوامر و نواہی کے تابع فرمان ہوتے ہیں اور ان کی تشکیل وہ رسالت کرتی ہے جو ہمیشہ کے لئے نافذ العمل ہوتی ہے۔ عمل سے مراد وہ حرکت ہے جو شرعی فکر اور شرعی نیت کے ذریعہ مرتب ہوتی ہے۔

۲۔ فکری سطح پر۔ اسلامی عقیدہ ان قواعد، احکام، مبادی، اوامر۔ نواہی اور معلومات عامہ کا مجموعہ ہے جسے مالک کائنات نے اپنے رسول حضرت محمد مصطفےٰؐ پر نازل کیا ہے اور آپ نے عالم انسانیت کے لئے اس کی مکمل وضاحت کی ہے چاہے وہ دعوت کی سطح پر ہو یا حکومت کی سطح پر۔ پھر آپ ہی نے اسے منطبق بھی کیا ہے اور دعوت کی قیادت بھی خود ہی کی ہے اور حکومت کی ریاست کا فرض بھی خود ہی انجام دیا ہے۔

عقیدہ اس فرمان کو بھی شامل ہے جسے خدا نے بذریعہ وحی نازل کیا ہے اور ان تعلیمات کو بھی شامل ہے جو رسول اکرمؐ کے قول و فعل و تقریر سے سامنے آئے ہیں۔

عقیدہ ہی سے اس امر کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ حیات کس طرح عالم وجود میں آئی ہے اور کیوں آئی ہے اور کب اور کس طرح فنا ہونے والی ہے اور اس کا آخری انجام کیا ہوگا۔؟

پھر عقیدہ ہی زندوں کے درمیان تعلقات کی تنظیم کرتا ہے اور زندہ کائنات کو خالق سے مربوط کرتا ہے اور اس کائنات سے وابستہ بناتا ہے جو اس کے وجود کے لئے ضروری ہے اور جس کی تخلیق اس کی خدمت کے لئے ہوئی ہے۔

عقیدہ دورِ حیات کے خاتمہ کی کیفیت۔ زندہ مخلوق کے آخری انجام اور پھر اس کے بعد ایک نئی زندگی کا انکشاف بھی کرتا ہے۔

اس کی حیثیت اس عدالت کی ہے جہاں ہر زندہ مخلوق کے اعمال کا محاسبہ ہونے والا ہے یا ہر مخلوق کو اس کے اعمال کا بدلہ ملنے والا ہے کہ نیکوکار کو اجر کامل حاصل ہو اور بدکار اور خطار اپنے عقاب کو برداشت کرے۔

عقیدہ درحقیقت ایک مکمل دفتر ہے جس میں تمام مخلوقات اور بالخصوص بنی نوع انسان کی پوری تاریخ درج ہے اور اس کے تجربات کا مکمل نقشہ موجود ہے جس نے اسے آواز،

شکل، حرکت، ظاہر اور باطن کے اعتبار سے نہایت درجہ خوبصورت اور قابل دید بنا دیا ہے۔

یہ فرد کی انفرادیت، سماج کی اجتماعیت، حکومت کے اقتدار اور پورے عالم بشریت کے جملہ حالات کے لئے ایک مکمل نظام ہے جو ہر شخص کی انفرادی زندگی کو بھی منظم کرتا ہے اور اس کے اجتماعی تعلقات بھی طے کرتا ہے۔ پھر خالق ومخلوق کے روابط کی بھی تحدید کرتا ہے اور پوری کائنات سے اس کے تعلقات کی وضاحت کرتا ہے اور یہ سارا کام ایک دعوت کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ پھر دعوت کو دولت کی طاقت حاصل ہوتی ہے اور دولت کو اہداف اور اعلیٰ اقدار کی قوت سے نوازا جاتا ہے۔

یہ عقیدہ بامقصد ہے۔ اہداف کی تعیین کرتا ہے۔ اس کے ہر قاعدہ کا ایک خاص ہدف ہوتا ہے جس کے لئے اس کی تشکیل ہوئی ہے۔ اس کے نزدیک فرد کا بھی ایک ہدف ہے اور جماعت کا بھی۔ حکومت کا بھی ایک ہدف ہے اور عام انسانی نسل کا بھی۔ اور ان سارے اہداف کا ایک مرکزی ہدف ہے جو اسلام کا بنیادی مقصد ہے اور اسی کی روشنی میں ان سارے اہداف کی تعیین ہوتی ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ فرد، جماعت، حکومت، عالم انسانیت میں کس قدر طاقت پائی جاتی ہے اور اسی کے اعتبار سے اس کے ہدف کی تعیین کی جاتی ہے کہ نہ ذرہ برابر کم ہو نہ ذرہ برابر زیادہ۔

اسلامی عقیدہ نے صرف اہداف ومقاصد کی تعیین پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ ان کی تحصیل کے وسائل بھی معین کر دئے ہیں اور انہیں اسقدر واضح کر دیا ہے کہ ان میں کسی طرح کا ابہام نہ رہ جائے۔

یقینی تصوّر

اسلام ایک عقیدہ ونظام ہونے کی حیثیت سے وہ شامل وکامل تصور پیش کرتا ہے جس کی بنیاد جزم ویقین پر ہے اور اس یقین کو تمام اہداف ووسائل پر شامل بنا کر پیش کرتا ہے جہاں فرد، جماعت، حکومت، بشریت، سیاست، اقتصاد۔ اجتماع کسی مرحلہ پر بھی کسی طرح کا شک اور شبہ نہ ہو۔

اسلام کا یہ یقینی تصور ایک تفصیلی اور دقیق نقشہ کی حیثیت رکھتا ہے جس میں موجودہ کائنات

اور اس کے مستقبل دونوں کا عکس پایا جاتا ہے اور پھر اس مستقبل کے حسین بنانے کا نظام بھی پایا جاتا ہے جس کے ذریعہ یہ نقشہ دھیرے دھیرے اس آخری غرض تک لے جاتا ہے جہاں تک پہونچنے کا راستہ مختلف بھی ہو اور کم سے کم تکلیف دہ بھی ہو۔

ایسی صورت میں یہ عقیدہ قائد بھی ہے اور موجہ بھی۔ شریعت کا سرچشمہ بھی ہے اور فکر کی بنیاد بھی۔ اور یہی بنیادی استقرار ہے جو انسان میں اطمینان پیدا کراتا ہے اور اسے جزم ویقین کے ساتھ عقیدہ سے راضی بناتا ہے۔ ورنہ دنیا کے تمام عقائد اور نظام اس خصوصیت سے عاری ہیں اور ان کی بنیاد ظن وتخمین پر ہے جس کا فطری اثر یہ ہے کہ انھیں ایک دن فنا ہو جانا ہے وہ جلد ہو یا بہ دیر۔

الٰہی حقوقی نظام

اسلامی عقیدہ ان قواعد احکام، مبادی، اوامر، نواہی، معلومات عامہ کا مجموعہ ہے جنھیں پروردگار عالم نے اپنے عبد خاص حضرت محمد مصطفےٰ ؐ پر نازل کیا ہے اور انھوں نے دعوت اور دولت دونوں کے ذریعہ اس کی مکمل وضاحت کی ہے۔

مالک کی طرف سے اسی نازل ہونے والے پیغام اور قول وفعل وتقریر رسول ؐ کے ذریعہ اسی واضح ہونے والے نظام نے ایک مکمل الٰہی حقوقی نظام کی تشکیل کر دی ہے جو اس قانون کی منزل پر ہے جو ہر زمانہ میں نافذ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اب اس نظام کا شارح اور مفسر رسول اکرم ؐ کے بعد وہی شخص ہوگا جو شرعی مرجع کی حیثیت رکھتا ہو۔

فصل سیوم

مرجعیت کی تعیین کون کرے؟

یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ ہر عقیدۂ الٰہیہ کے لئے ایک شرعی مرجعیت کا ہونا ضروری ہے جس کے زیر سایہ عقیدہ تکامل کی منزلیں طے کرے اور ایسی مرجعیت کے بغیر عقیدہ کا وجود مستحیل ہے۔

اس مرجع کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عقیدہ کا سب سے بڑا عالم۔ سب سے زیادہ ادراک اور اخلاص رکھنے والا ہو۔ تمام موجودین سے افضل اور انسب ہو اور وہ بھی اندازہ و گمان کی بنیاد پر نہیں بلکہ علم و یقین کی بنیاد پر۔ اور یہ وہ شرائط ہیں جن کا ادراک خدائے علیم و قدیر کے علاوہ کسی کے امکان میں نہیں ہے کہ وہ عالم اسرار و خفیات اور واقف ضمائر و نیات ہے۔

اسی بنا پر مرجع کا تعیّن اُس کے علاوہ اور کسی کے شایان شان نہیں ہے جس حقیقت کا ایک جاہل معاند کے علاوہ کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے۔

عنایات ربّانیہ نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا ہے کہ یہ صفات ہر دَور میں ہر نبی مرسل میں مجتمع رہی ہیں اور اسی بنیاد پر انھیں تبلیغ رسالت کا ذمہ دار بنایا گیا ہے اور معترضین کے اعتراض کی کوئی پرواہ نہیں کی گئی ہے "یہ قرآن مکہ اور طائف کی کسی عظیم شخصیت پر کیوں نازل نہیں کیا گیا"۔ "یہ تو بہت معمولی انسان ہے اور صاف بول بھی نہیں سکتا ہے"۔ وغیرہ

ان اعتراضات کا سرچشمہ وہم و گمان اور اندازہ و تخمین ہے اور رب العالمین کا اختیار و انتخاب قطعی اور یقینی بنیادوں پر ہے کہ یہ افراد اعلم، افہم اور بہترین اخلاص

رکھنے والے ہیں اور انھیں کو عقیدۂ الٰہیہ کا بیان، سفینۂ اسلام کی قیادت اور امت اسلامیہ کی حکومت زیب دیتی ہے۔

مالک کائنات نے ہر دور میں تعیین مرجعیت کا کام انجام دیا ہے اور وہی اس امر کا واقعی اہل ہے کہ صلاحیتوں کو دیکھ کر یقینی بنیادوں پر مرجع امت کا تعین کر دے اور مسئلہ کو امتوں کے اہواء و آراء کے حوالے نہ ہونے دے۔

مقاصد و فرائض مرجعیت الٰہیہ

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انبیاء کرام وہ مراجع تھے جن کا تقرر مالک کائنات نے کیا تھا اور ان کے انتخاب کا اعلان بھی اسی نے کیا تھا۔

اب سوال صرف یہ ہے کہ اس مرجعیت کا مقصد اور اس کے فرائض کیا تھے؟ تو اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ بیان و تشریح:

تمام انبیاء کا ایک مشترکہ فریضہ رہا ہے کہ وہ عقیدہ الٰہیہ کے قواعد کی تشریح کریں اور علمی اور عملی دونوں منزلوں پر اس کی مکمل توضیح کریں، چاہے دعوت دولت کی منزل تک پہونچ جائے جیسا کہ سرکار دو عالمؐ کے دور میں ہوا یا ایسا نہ ہو سکے جیسا کہ اکثر انبیاء کرام کے دور میں ہوا کہ دعوت صرف دعوت ہی رہ گئی اور حکومت قائم نہ ہو سکی۔

اس مرجعیت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نظریاتی طور پر الٰہی قواعد کی مکمل توضیح ہو جائے اور اس میں کسی طرح کی کمی یا زیادتی نہ ہونے دے۔ اس کے بعد اس نظریہ کو عالم تطبیق میں لانے کی کوشش کرے تاکہ بیان علم و عمل دونوں منزلوں کو شامل ہو جائے۔

الٰہی مرجع ہی وہ شخص ہوتا ہے جو واقعات پر احکام و نصوص کا وہ رنگ چڑھاتا ہے، جو خدائی طور پر مطلوب ہے اور پھر یہ طے کرتا ہے کہ الٰہی نصوص کا مقصد اس واقعہ سے حاصل ہو رہا ہے یا نہیں۔؟

۲۔ تحدید دائرہ شریعت :

نبی کی مرجعیت کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ شریعت و مشروعیت کے حدود کی تعیین کرے اور یہ کام انبیاء کرام نے اس طرح انجام دیا ہے کہ اولاً اس عقیدۂ الٰہیہ کی تشریح کی جو اس دائرہ کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے اور جسے خدائے کریم کی طرف سے نازل کیا گیا ہے چاہے لفظ و معنی دونوں اعتبارات سے ہو جیسا کہ توریت و انجیل و قرآن میں ہوا ہے یا صرف معانی کے اعتبار سے ہو جیسا کہ احادیث قدسیہ میں ہوا ہے۔

ثانیاً اس عقیدہ کے فطری اور عملی دونوں پہلوؤں کی مکمل وضاحت کی۔

ثالثاً عقیدہ اور تشریع میں یگانگت کو محفوظ رکھا اور کسی طرح کا فاصلہ نہیں ہونے دیا۔ گویا کہ یہ دونوں ایک ہی سکہ کے دو رُخ ہیں اور جس طرح عقیدہ کا ادراک بیان کے بغیر ناممکن ہے۔ اسی طرح بیان کا ادراک بھی اس کی اساس کے بغیر ناممکن ہے تنزیل الٰہی ایک اساس ہے اور تشریح انبیاء عمارت کے مختلف ابواب۔

۳۔ پیروکاروں کی حکومت

نبی کے فرائض میں یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ عقیدہ کے ماننے والوں کا ولی اور حاکم ہو اور وہی احکام الٰہیہ کے مطابق ان کے امور کو مرتب و منظم کرے اور یہ بات سرکار دو عالمؐ کے دور میں واضح بھی ہو گئی ہے کہ آپ ہی امت کے دینی مرجع بھی تھے اور آپ ہی ولی و حاکم اور امام و قائد بھی تھے۔ آپ ہی نے دعوت کی قیادت بھی کی ہے اور آپ ہی نے دولت کی ریاست کا کام بھی انجام دیا ہے۔ آپ ہی پر قرآن نازل بھی ہوا ہے اور آپ ہی نے اس کی تشریح و تطبیق کا کام انجام دیا ہے۔

۴۔ گمراہیوں کا سد باب

"نبی مرجع" کے دور میں ہدایت کا وجود اور ضلالت کا فقدان دو اسباب کی بنا پر ہوا کرتا ہے :

۱۔ ایک رکن عقائدی ہوتا ہے جس کا مفہوم الٰہی نظام حقوق کا اتباع اور نبی مرسل کی طرف سے اس کی توضیح و تشریح۔

ب ۔ دوسرا رکن شخصی ہوتا ہے کہ نبی ولی و حاکم ہوتا ہے اور وہی عقیدہ الٰہیہ
کو اس طرح منطبق کرتا ہے جس طرح اس نے مالک کائنات سے حاصل
کیا ہے اور اس میں کسی طرح کا خلل اور نقص واقع نہیں ہونے دیتا۔

حقیقت امر یہ ہے کہ انھیں دونوں ارکان کی وحدت و یگانگت ہی ہے جو ہدایت و شریعت کی ضمانت فراہم کرتی ہے ورنہ ان میں کسی طرح کا فصل بھی گمراہی کے راستے کھول سکتا ہے۔ نبی کی زندگی کی شخصی حیثیت بھی قانونی حیثیت سے کمتر نہیں ہے۔ یہ ایک مکمل معاملہ ہے جس میں تفرقہ کی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی شخص محمد مصطفےٰ کا نظام لے لے اور ان کی شخصیت کو نظر انداز کر دے۔ یہ شخصیت نظام کا اور یہ ولایت عقیدہ کا جزء لاینفک ہے اور ان میں کسی طرح کے فصل کی کوشش گمراہی کے راستہ کو کھولنا ہے اور بس۔!

۵۔ سفینۂ نجات :

"نبی مرجع" نجات کا ایک سفینہ ہوتا ہے کہ جو اس سفینہ پر سوار ہو گیا نجات پا گیا اور جو اس سے الگ ہو گیا یا کسی اور سفینہ پر سوار ہو گیا وہ ہلاک ہو گیا۔

۶۔ باب مغفرت :

"نبی مرجع" مغفرت کا ایک دروازہ ہوتا ہے کہ جو اس دروازہ سے داخل ہو گیا اللہ نے اس کے گناہ بخش دئے اور جس نے اس دروازہ کا انکار کر دیا وہ اپنا بوجھ لاد کر خدا کے حضور حاضر ہوگا۔

۷۔ نبی قائدِ راہِ ہدایت ہوتا ہے :

کہ جو نبی کا اتباع کر لیتا ہے گویا اس نے خدا کا اتباع کر لیا۔ نبی کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے اور خدا کی اطاعت ہی راہِ ہدایت ہے۔ نبی کا نافرمان خدا کا نافرمان ہے اور خدا کا نافرمان گمراہی میں بہت دور تک چلا جاتا ہے۔

۸۔ "نبی مرجع" امان امت اور مانع اختلافات ہوتا ہے :

امت جب نبی کا اتباع کرتی ہے تو امان کے راستہ پر چلتی ہے۔ نبی کا راستہ

خدا کی طرف سے سمجھا ہوا ہوتا ہے اور اس میں کسی لغزش کا امکان نہیں ہوتا ہے۔ البتہ اس مرجعیت کے نہ ہونے کی صورت میں اختلافات سر اٹھاتے ہیں اور امن و امان برباد ہو جاتا ہے۔ لوگ بہک جاتے ہیں اور ہر شور مچانے والے کا اتباع کرنے لگتے ہیں۔

ایک ایسے مثالی مرجع کا ہونا جس کا ادراک مذہب بھی مثالی ہو، امت کو ہر اختلاف سے بچا سکتا ہے اور مکمل امان کی ضمانت دے سکتا ہے۔

۹۔ مرجع ایک مرکز ہوتا ہے:

جس کے اتباع کے بعد نہ کوئی ساقط ہو سکتا ہے اور نہ ضائع ہو سکتا ہے۔

۱۰۔ مرجع علم و تقویٰ اور پابندی احکام میں نمونہ ہوتا ہے۔

۱۱۔ مرجع کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تمام ایمانی طاقتوں کو اس طرح مرتب اور منظم کر دے کہ ہدایت کا سلسلہ تمام نوع بشر تک عام ہو جائے اور کوئی محروم ہدایت نہ رہنے پائے۔

حیات پیغمبرؐ میں مرجعیت

اللہ کی اطاعت درحقیقت اوامر و نواہی پیغمبرؐ کے اتباع ہی سے ظاہر ہوتی ہے اس لئے کہ پیغمبرؐ ہی اس کے احکام کی حقیقت کا جاننے والا ہوتا ہے اور اسی کی اطاعت عملاً اطاعت خدائے متعال ہوتی ہے اور اسی کی معصیت کا نام معصیت خدا رکھا جاتا ہے۔

قرآن حکیم نے اس حقیقت کا نو۹ مقامات پر اعلان کیا ہے اور یہ واضح کر دیا ہے کہ رسول ہی دین کا ذمہ دار، اس کے اسرار کا عالم، اس کے مخفی رموز کا دانا اور اس کے عمومات کو تخصیص دے کر حقیقت کا آشکار کرنے والا یا متعدد معانی کے درمیان کسی ایک واقعی معنیٰ کی تعیین کرنے والا ہوتا ہے۔

حیاتِ پیغمبرؐ میں مرجعیت اس کی ذات تک محدود ہوتی ہے اور اس کے علاوہ

کسی مرجع کی ضرورت نہیں ہوتی ہے کہ اللہ نے اسے معصوم بنا کر اس عظیم مقصد کے لئے اس کا انتخاب کیا ہے اور اس کے کسی پیرو میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اوامر و نواہی الٰہیہ کا ایسا ادراک حاصل کر سکے جیسا کہ پیغمبرؐ کو حاصل ہے۔

پیغمبر خدا کی طرف سے منتخب ہوتا ہے لہٰذا اسے اعلم، افہم اور افضل ہونا چاہئے تاکہ اس کا اتباع واجب کیا جا سکے۔ اپنی زندگی تک وہ اسلام کے بیان اور مسلمانوں کی قیادت دونوں مراحل میں مرجع وحید ہوتا ہے جس کا انکار مسلمانوں میں کوئی شخص نہیں کر سکتا ہے کہ یہ ایک ایمانی اور عقلی حقیقت ہے اور اسی پر مسلمانوں کا اجماع اور اتفاق بھی ہے۔

مرجعیت بعد رسولؐ

ابتدائی مطالعہ! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سرکار دو عالمؐ کے جوار رحمت الٰہیہ میں جانے سے پہلے دین کامل ہو گیا اور نعمتیں تمام ہو گئیں۔ عقیدۂ الٰہیہ راسخ ہو گیا اور احکام کی تطبیق ہو گئی۔ اسلامی نظام قائم ہو گیا اور حضور کی دس سالہ قیادت نے اس کے اصول واضح کر دئے۔

لیکن اس کے باوجود آخری دین ہونے کے اعتبار سے اسلام کے مزاج۔ اس کے قواعد کی عمومیت و شمولیت، مسلمانوں کی گردن پر عائد ہونے والی ذمہ داری کہ کفر پر عرصہ حیات تنگ ہو جائے اور نوع بشر کے لئے ہدایت عام ہو جائے۔ ان سب کا تقاضا یہ تھا کہ رسول اکرمؐ کے بعد بھی مسلمانوں کے درمیان ایک اعلیٰ مرجعیت رہے جس کی ضرورت کا اندھی تقلید کے خوگر کے علاوہ کوئی صاحب فہم و شعور انکار نہیں کر سکتا ہے۔

ممکن ہے کہ اس مقام پر دینی گروپ کے لیڈر یہ کہہ دیں کہ یہ کام علماء مسلمین کے ذمہ ہے کہ وہ مرجعیت کا فرض انجام دیں یا خلیفۂ مسلمین مرجع مسلمین ہو جائے۔ لیکن اس کا واضح سا جواب یہ ہے کہ پہلا حل غیر عملی ہے۔ علماء اسلام ایک مقام پر جمع بھی ہو جائیں تو ایک رائے پر جمع نہیں ہو سکتے اور ہر ایک کے پاس ایک نیا موقف ہوگا اور ظاہر شریعت

کے اعتبار سے اس کا جواز بھی ہوگا۔ ہر ایک اپنے فن کا عملاق ہوگا اور ہر ایک کے کچھ پیرو کار ہوں گے اور ایسی صورت میں مسلمان کس فریق کا اتباع کرے گا اور کس رائے کو باطل قرار دے گا؟۔ یہ ایک ہنگامہ خیز مسئلہ ہے۔

دینی گروہ بندی کے پاس اس کا جواب یہ ہوگا کہ حاکم وقت ان کے درمیان کسی مناسب رائے کا انتخاب کرے گا اور باقی لوگ اسی رائے کا اتباع کریں گے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ علماء کا اتباع ہوگا یا حاکم وقت کا؟ اور پھر حاکم وقت بھی تو مختلف قسم کے ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں اگر علیؑ و ابوبکر جیسے "محترم افراد" ہوتے ہیں تو مروان و معاویہ و یزید جیسے متفق علیہ نالائق بھی ہوتے ہیں کہ بعض "قواعد اسلامی" کے تحت حکومت حاصل کرتے ہیں اور بعض بزور شمشیر اقتدار پر قبضہ کر لیتے ہیں اور پھر امت اسلامیہ بحکم غلبہ بیعت کر لیتی ہے۔ ایسی صورت میں کس حاکم کے انتخاب کو مرجع قرار دیا جائے گا اور کسے نظر انداز کر دیا جائے گا۔

ضرورت مرجعیت بعد النبیؐ

ہمارے عقیدہ میں ہر نبی اپنے دور کا مرجع ہوتا ہے جیسے پروردگار مختلف مقاصد و وظائف کا ذمہ دار قرار دیتا ہے اور حضرت خاتم النبیین محمد مصطفیٰؐ نے اسی بنیاد پر دعوت الی اللہ کی قیادت فرمائی اور اپنی دعوت میں کامیاب بھی ہوئے کہ اس کے نتیجہ میں ایک حکومت منظر عام پر آگئی جس نے عقیدۂ الٰہیہ کو مکمل طور پر منطبق کیا اور یہ اعلان کر دیا کہ اللہ نے مسلمانوں کے لئے دین کو کامل بنا دیا ہے اور نعمتوں کو تمام کر دیا ہے۔ جس کے بعد حضورؐ نے جوارِ الٰہی میں رہنا پسند فرمایا اور یہ کوئی اچانک حادثہ نہیں تھا بلکہ اس سے پہلے بستر بیماری پر رہے اور چند دنوں کے بعد ایک مکمل دعوت و دولت چھوڑ کر جوارِ خداوندی کی طرف تشریف لے گئے۔ آپؐ نے ایک ایسا دین چھوڑا جس میں ہر شے کا بیان موجود تھا اور جو ساری دنیا کے لئے باعث فخر و مباہات تھا۔

سوال یہ ہے کہ آپ کے بعد اس دین کا مرجع کون ہوگا؟ پیغمبرؐ کی ذمہ داریوں کو

کون سنبھالے گا۔ عقیدۂ الٰہیہ کے واقعی احکام کو کون بیان کرے گا۔؟ مختلف امور کی شرعی حیثیت کی تعیین کون کرے گا؟ امت اسلامیہ اور اس کی عظمتوں کا ولی و سرپرست کون ہوگا؟ کون سفینۂ نجات اور باب مغفرت ہوگا؟ کون امت اسلامیہ کے لئے باعث امن و امان ہوگا؟ کسے ثقل اکبر قرار دیا جائے گا؟ کون مثل اعلیٰ اور بہترین نمونۂ اسلام ہوگا؟ کون ایمانی کارواں کی قیادت کرکے سارے عالم بشریت کو ظلمات سے نکال کر نور کی منزل تک پہونچائے گا۔؟

سوال محتاج جواب؟

ان سوالات کو جوابات کی ضرورت ہے۔

اگر مسلمان یہ کہہ دیں کہ رسول اکرمؐ نے کسی مرجع کی تعیین نہیں کی ہے اور اپنا کوئی قائم مقام نامزد نہیں کیا ہے اور نہ کسی احکام الٰہیہ کے بیان کرنے والے کی نشاندہی کی ہے۔ نہ شریعت اور مشروعیت کا کوئی مدرک مقرر کیا ہے۔ نہ کسی کو ولی امت بنایا ہے اور نہ کسی کو اس کی عظمتوں کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ نہ کوئی ثقل اکبر ہے اور نہ کوئی مثال اعلیٰ۔ نہ کسی کو قائد امت بنایا گیا ہے اور نہ کوئی آزادی بشر کی تحریک کا محافظ ہے۔

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ دین کامل ہوا ہے اور نہ نعمتوں کا اتمام ہوا ہے۔

یہ مسائل اصل دین میں شامل ہیں اور ان کا تعلق صمیم نعمت سے ہے۔ عقیدۂ الٰہیہ ان امور کو نظر انداز کر دے اور پھر کمال دین اور اتمام نعمت کا دعویٰ کرے یہ ایک امر غیر معقول ہے۔ عقیدۂ الٰہیہ تو خود ہی ایسے نظریات کا دشمن اور اسے باطل قرار دینے والا ہے۔

مسلمانوں کا یہ اصرار عقل و منطق اور اساسیات حیات کے خلاف ہے۔ بلکہ عقائد الٰہیہ کے قوانین سے بھی واضح ترین تضاد رکھتا ہے۔

فصل چہارم

وفاتِ پیغمبرؐ کے بعد مسلمانوں کے مواقف مرجعیت

وفاتِ پیغمبرؐ کے بعد مسلمان مسئلہ مرجعیت میں دو حصّوں پر تقسیم ہو گئے اور ہر جماعت کا دعویٰ تھا کہ وہی حق مبین کی منزل پر فائز ہے۔

۱۔ اہل تاریخ

وہ افراد جنھوں نے تاریخی حوادث ہی کو اصل قرار دیا۔ اور اسی کو ہر اعتبار سے شرعی بنا دیا۔ خصوصیت کے ساتھ "خلفاء راشدین" کے عہد کو بالکل اسلام کا نمونہ قرار دے دیا۔ یہ حضرات اہلسنت کہے جاتے ہیں اور اس تسنن کی ایجاد بنی امیہ کے دور میں ہوئی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ معاویہ کے عہد حکومت میں جب طاقت قانون پر غالب آگئی اور حکومت غلبہ حاصل کرنے والوں کے ہاتھ میں پہونچ گئی اور اکثریت نے بھی غلبہ کا اتباع کر لیا تو اس سال کا نام 'عام الجماعہ' رکھ دیا گیا اور غلبہ پر ایمان لانے والوں کو 'اہل الجماعہ' کہہ دیا گیا جو درحقیقت سرکاری گروہ کے افراد تھے اور اگر کچھ اختلاف بھی رکھتے تھے تو حکومت کی محبّت پر سب متفق تھے اس لئے کہ سب کا رزق حکومت کے ہاتھ میں تھا اور وہی عطا و منع کی مالک تھی اور پھر اس حکومت کو وحدت اسلامیہ کا رمز بھی قرار دے دیا گیا۔

۲۔ اہل قانون

وہ افراد جنھوں نے تاریخی حادثات کا مقابلہ کیا اور انھیں غیر قانونی قرار دیکر مختلف ادوار میں مختلف سطحوں پر اپنے اختلاف کا اعلان کیا۔ "خلفاء راشدین" کا دور اس معارضہ کے لئے بنی امیہ کے مقابلہ میں گویا زرّیں دور تھا اور دونوں کا باہمی

قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بنی عباس کا دور بنی امیہ سے بھی بدتر تھا۔

ان افراد کا عقیدہ یہ ہے کہ عقیدۂ الٰہیہ نے رسول اکرمؐ کے بعد کے لئے مرجع کی تعیین کردی ہے اور مسئلہ کو مہمل نہیں چھوڑا ہے۔ مرجعیت کا اعلان بھی کیا ہے اور اسے حکم اور مرجعیت کی تمام صلاحیتیں سپرد بھی کردی ہیں۔

اس مرجع المسلمین کا نام گرامی علیؑ بن ابی طالب ہے اور ان کے بعد بھی شریعت نے تعیین مرجع کے اصول مقرر کردئے ہیں اور ہر مرجع نے اپنے بعد والے مرجع کے لئے تصریح کردی ہے۔

اس جماعت کو شیعہ کہا جاتا ہے اور یہ تشیع دور پیغمبر اسلامؐ ہی میں شروع ہو چکا تھا جو ہر دور میں حکومت جور سے مقابلہ کرتا رہا ہے اور اسی کے نتیجہ میں اموی اور عباسی ادوار میں شدید ترین مصائب کا شکار رہا ہے۔ اسے حقوق انسانیت سے محروم کیا گیا ہے۔ اس کی شہادت کو رد کیا گیا ہے۔ اس کے نام سرکاری دفتر عطیات سے کاٹ دئے گئے ہیں اور اس پر ہر دور کے حکام کی طرف سے لعنت پڑتی رہی ہے۔

ہم عنقریب دونوں فریق کے بیانات اور ان کے دلائل کی تفصیلات پیش کرکے ان کا مکمل تجزیہ کریں گے۔

مرجعیت اور اہلسنّت

لاوارث امت!

اہلسنت کا خیال ہے کہ رسول اکرمؐ نے امت کو بلا نائب و مرجع چھوڑ دیا ہے اور اپنے بعد کے لئے کسی ایسے آدمی کی نشاندہی نہیں کی ہے جو امت کا امام اور سرپرست ہو سکے اور دینی اور دنیوی وظائف کے ساتھ قیام کر سکے۔

اس کی دلیل حضرت عمر بن الخطاب کے اس قول کو قرار دیا جاتا ہے کہ جب ان سے خلیفہ نامزد کرنے کا مطالبہ کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ "اگر میں خلیفہ نامزد کردوں تو یہ بھی صحیح ہے کہ مجھ سے بہتر شخص (ابو بکر) نے یہ کام انجام دیا ہے۔ اور اگر نامزد نہ کروں

تو یہ بھی صحیح ہے کہ اُس سے بہتر شخص (پیغمبرؐ) نے کیا ہے۔" (الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ ص ۲۲، طبری ۲/۴۴۳، مروج الذہب مسعودی ۲/۳۵۳)

اس کے بعد ان حضرات کا خیال یہ بھی ہے کہ حضورؐ نے کسی کو دنیا و آخرت کے فرائض یا مرجعیت کے بارے میں وصیت بھی نہیں فرمائی ہے جس کی دلیل حضرت عائشہ کا یہ قول ہے کہ "پیغمبرؐ نے اس عالم میں انتقال فرمایا ہے کہ ان کا سر میری رانوں پر تھا۔ اگر انھوں نے کوئی وصیت فرمائی ہوتی تو میں نے اسے ضرور سُنا ہوتا۔" اور اسی قول کی بنیاد پر بخاری اور مسلم نے وصیّتِ پیغمبر کا انکار کیا ہے۔

اس کے بعد ان حضرات کے یہاں یہ امر بھی یقینی ہے کہ اگر پیغمبرؐ نے کسی شخص کا تقرر بھی کیا ہے تو وہ علیؑ بن ابی طالب نہیں تھے ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ سارے صحابہ اس حقیقت سے ناواقف رہ جاتے اور دوسرے شخص کو حاکم بنا دیتے جب کہ صحابہ عادل ہوتے ہیں اور ان کا جنتی ہونا طے شدہ ہے۔ خلافت میں ابوبکر، عمر، عثمان، علیؑ کی ترتیب کا مخالف گویا بارہ ہزار صحابہ کی توہین کرنے والا ہے۔ (الاصابہ ۱/۸)

مختصر یہ ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے ولایت و امامت مسلمین کا کام خود مسلمانوں کے حوالہ کر دیا ہے کہ یہ مسلمانوں کا اپنا کام ہے جو انھیں خود انجام دینا چاہیئے اور امامت و مرجعیت اصل میں حکومت و ریاست کے توابع میں ہیں جن کا فیصلہ حکومت کے زیر اثر اور زیر نگرانی ہونا چاہیئے۔

عملِ لاوارثیت کی ناکامی

بہت جلد اہلسنت پر یہ امر منکشف ہو گیا کہ امت کا بغیر ولی عہد چھوڑ دینا ایک ایسا خطرہ ہے جس سے بالاتر کوئی خطرہ نہیں ہے اور اسلام و مسلمین کی مصلحت اسی میں ہے کہ حاکم خود اپنے ولی عہد کا انتخاب کر کے اسے اپنا خلیفہ نامزد کر دے چنانچہ جناب عائشہ نے عبداللہ بن عمر سے خطاب کر کے فرمایا کہ اپنے باباجان سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ امت کو بغیر نگراں اور جانشین کے مہمل نہ چھوڑ دیں ورنہ مجھے اُن کے بارے میں فتنہ کا خوف ہے۔" اور عبداللہ نے اپنے بابا تک یہ پیغام پہونچا دیا۔ (الامامۃ والسیاسۃ ص ۲۳)

ام المومنین نے بالکل صحیح فرمایا تھا کہ امت کا لاوارث، بغیر والی و نگراں کے چھوڑ دینا فتنہ کا باعث ہے اور عظیم ترین خطرہ ہے۔

خود ابن عمر نے بھی اس خطرہ کا احساس کیا تھا چنانچہ اپنے باپ کے وقت آخر آ کر یہ تقاضا کیا کہ "امیر المومنین! آپ امت میں کوئی خلیفہ نامزد کر دیں۔ اس لئے کہ اگر آپ کے پاس کوئی چرواہا آ کر بیان کرے کہ اپنے جانوروں کو بغیر نگراں چھوڑ کر آیا ہے تو آپ اس کی ملامت کریں گے اور کہیں گے کہ اپنی امانت کو کس طرح ضائع کر دیا ہے تو خود آپ امت پیغمبرؐ کے بارے میں کیا جواب دیں گے؟

اس کے بعد انھوں نے وہ تاریخی جواب دیا کہ اگر میں خلیفہ بنا دوں تو یہ کام بھی مجھ سے بہتر شخص نے کیا ہے اور اگر قوم کو لاوارث چھوڑ دوں تو یہ کام بھی مجھ سے بہتر فرد نے کیا ہے"۔ (مروج الذہب ۲/ ۳۵۳، الامامۃ والسیاسۃ ص ۲۳، طبری ۳۴)

اس کے علاوہ عمل لاوارثی کی ناکامی کا اندازہ اس طرز عمل سے بھی ہو سکتا ہے کہ ہر حاکم ایک ولی عہد مقرر کرتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ وہ جب تک زندہ رہتا ہے امور امت کا نگراں اور امین ہوتا ہے اور ان کے حالات کا جائزہ لیتا رہتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اپنے بعد کے حالات پر بھی غور کرے اور کوئی ولی اور نگراں مقرر کر دے اور قوم بھی اس کی نظر پر اعتماد کرتی ہے جس طرح ساری زندگی اعتماد کیا ہے۔

اور اجماع امت بھی اسی بات پر قائم ہے کہ اس نامزدگی پر اعتماد کیا جائے جیسا کہ ابوبکر کی طرف سے عمر کی نامزدگی پر اور عمر کی طرف سے شوریٰ کی نامزدگی پر اعتماد کیا گیا اور یہ طرز عمل ایک قانون کی حیثیت اختیار کر گیا کہ اس طرح نامزدگی کی قبولیت پر امت کا اجماع ہو گیا اور اجماع ابن خلدون کے قول کی بنا پر ایک شرعی سند اور دلیل ہے کہ اس طرح وحدت مسلمین برقرار رہتی ہے اور امت فتنہ و فساد سے محفوظ رہتی ہے اور نہ قوم بقول عائشہ مہمل اور لاوارث ہوتی ہے اور نہ خلیفہ بقول ابن عمر مستحق ملامت ہوتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اہلسنّت کے نزدیک وہ قائد وحید جس نے خلیفہ نامزد نہیں کیا ہے اور امت کو لاوارث چھوڑ دیا ہے وہ رسول اکرمؐ تھے جو ابن خلدون کے بیان کے

مطابق ایسے رہنما تھے جو ساری زندگی قوم کے حالات پر نگاہ رکھے رہے اور مرنے کے بعد کے بارے میں کوئی غور و فکر نہیں کیا جب کہ تمام خلفاء اور رؤسا حیات و موت دونوں کے بارے میں نگاہ رکھتے ہیں۔ (مقدمہ ابن خلدون ص ۲۰۱ دار الفکر)

حقیقت امر یہ ہے کہ صحابہ کرام نے مختلف مشقتوں کا سامنا کرنے کے بعد یہ محسوس کر لیا کہ امت کا مرجع اور ولی عہد کے بغیر چھوڑ دینا لازمی تباہی اور بربادی کا سبب ہے اور وصیت و نامزدگی مصلحت مسلمین کے لئے بہترین عمل ہے۔ اس لئے یہ کام شروع ہو گیا اور آجتک جاری ہے۔

اس سے بالاتر یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ ایک آسمانی شریعت ہے جس نے قرآن و حدیث کے ذریعہ تمام مسائل حیات کی وضاحت کر دی ہے اور اس کا اس بنیادی مسئلہ سے خالی ہونا خود کمال دین اور اتمام نعمت کے منافی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جب رسول اکرمؐ کو موت کا اختیار دیا گیا اور آپ نے مرض الموت کے لمحات بھی گذارے ہیں اور آپ کو معلوم تھا کہ اس مرض میں دنیا سے جانے والے ہیں اور آپ کے دل میں امت کی محبت بھی تھی اور آپ کو رؤف و رحیم بھی بنایا گیا تھا۔ اور امت کے مستقبل سے باخبر بھی کر دیا گیا تھا۔

کیا ایسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ آپ مرجع اور ولی و قائد کے تقرر کے بغیر دنیا سے چلے جائیں اور آپ کو ایک ایسے امر کا احساس نہ ہو سکے جس کا احساس ابو بکر و عمر کو ہو گیا جو ہرگز پیغمبر نہیں تھے، بلکہ اس کے خطرہ کو عائشہ نے بھی محسوس کر لیا جو یقیناً پیغمبر نہیں تھیں۔

یہ تو ایک ایسی مہمل بات ہے جسے تمام نصوص شرعیہ باطل قرار دیتے ہیں چاہے ہم حکام تاریخ کا جس قدر بھی احترام کریں۔

اہلسنت نے اپنے اس کمزور موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ہر تنکے کا سہارا لیا ہے۔ کبھی نصوص کا دامن پکڑا ہے اور جب نصوص نے ساتھ نہ دیا تو فرضیات کا سہارا لیا ہے اور جب اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی تو شوریٰ کا راستہ اختیار کیا اور جب اس میں بھی ناکام ہو گئے تو وحدت اسلامی اور مصلحت مسلمین کے نعرے بلند کرنے لگے اور آخر میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے کہ امام وقت یا خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے بعد کا انتظام کرے

اور امت کے لئے اس شخص کی تعیین کر دے جس کا اتباع کرنا ہے۔

عظمت مرجع بعد النبیؐ اور اہلسنت

خلیفہ یا امام یا رئیس حکومت قائم مقام پیغمبرؐ ہوتا ہے اور دین و دنیا دونوں کے مسائل کا مرجع ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ خلیفۂ رسولؐ ہوتا ہے اور ان تمام امور کا ذمہ دار ہوتا ہے جس کے رسول اکرمؐ ذمہ دار تھے۔ وہ جملہ مصالح امت کا نگراں، ولی اور ذمہ دار ہوتا ہے جس میں حیات و موت دونوں کے حالات کے بارے میں غور کرتا رہتا ہے اور اپنے بعد کے لئے ولی عہد بھی نامزد کر دیتا ہے اور لوگ اس پر اسی طرح اعتماد کرتے ہیں جس طرح زندگی میں اعتماد کیا تھا۔ (مقدمہ ابن خلدون دار الفکر ص ۲۱۰)

وہ نبوت کے تمام خصوصیات و امتیازات و صلاحیات کا مالک ہوتا ہے جیسا کہ صاحب کتاب "نظام الحکم" ظافر قاسمی نے فرمایا ہے کہ "خلیفہ کے امتیازات تمام داخلی، خارجی اور عسکری امور کو شامل ہوتے ہیں اور سب کی ذمہ داری تنہا اسکی گردن پر ہوتی ہے وہ کسی مسئلہ کو دوسرے کے حوالے بھی کر دیتا ہے تو اس کا بنیادی حق ساقط نہیں ہوتا ہے۔ (نظام الحکم قاسمی ص ۳۵۳)

امام ماوردی نے "احکام سلطانیہ" کے ص ۱۵-۱۶ پر ان تمام امتیازات کا جائزہ لیا ہے اور ہم نے بھی اپنی کتاب "النظام السیاسی" کے ص ۱۹۴ پر اس کا خلاصہ درج کر دیا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ مرجعیت دینیہ بھی حاکم وقت کی تابع ہے اس لئے کہ حاکم وقت خلیفۂ رسولؐ ہے اور رسول اکرمؐ دین و دنیا دونوں کے مرجع تھے تو اب خلیفہ بھی دونوں کا ذمہ دار ہوگا بلکہ بعض امور نبوت کے دائرہ عمل سے بھی خارج تھے جو خلافت کے امتیازات میں شامل ہو گئے ہیں اور وہ ہے ولیعہد کی نامزدگی کہ رسول اکرمؐ نے امت کو بلا نگراں و سرپرست چھوڑ دیا تھا لیکن ابو بکر نے اپنی ذاتی فراست اور اکابر صحابہ کی حوصلہ افزائی سے عمر کو نامزد کر دیا اور پھر عمر نے بھی چھ افراد کو نامزد کر دیا بلکہ عملاً عثمان کو

نامزد کر دیا جیسا کہ شوریٰ کے مضمون پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور لوگ عثمان کو ردیف کہا بھی کرتے تھے کہ لغت عرب میں ردیف اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی سردار کے بعد امید کی جاتی ہے۔ (نظام الحکم استاذ ظافر القاسمی از تاریخ طبری ص ۱۹۷-۱۹۸)

دوسری طرف طلحہ موجود نہیں تھا تو علیؑ اور زبیر ایک طرف ہو جاتے اور باقی تین افراد عثمان کی طرف ہو جاتے تو بھی عثمان خود بخود خلیفہ ہو جاتے جو حضرت عمر کی وصیت کا حتمی نتیجہ تھا۔

خلافت بنی امیہ میں بھی رئیس مملکت ہی عام طور پر خلیفہ نامزد کرتا تھا بلکہ جو غالب آجاتا تھا وہی خلیفہ اور مرجع ہو جاتا تھا اور وہی اپنے جانشین کو نامزد کر دیا کرتا تھا۔ یہی حال بنی عباس میں رہا بلکہ خلافت عثمانیہ بھی اسی راستہ پر چلتی رہی۔

یہ بنیادی قانون کہ خلیفہ مرجع مسلمین ہوتا ہے اور اس کو بعد کا خلیفہ نامزد کرنے کا حق ہے۔ حضرت ابوبکر و عمر نے ایجاد کیا اور پھر سارے خلفاء اسی راستہ پر چل پڑے فرق صرف یہ رہا کہ ان دونوں کی فکر یہ تھی کہ یہ کام اپنے خاندان کے اندر نہ ہو اور بعد والوں نے اس نظام کو بالکل الٹ دیا۔

پھر یہ سیرت اسی طرح قائم رہی اور ہر رئیس مملکت اپنے بعد کے لئے ولیعہد نامزد کرتا رہا اور گویا کہ یہ اس کا بنیادی حق تھا جیسا کہ بہت سے علماء اہلسنت نے خیال کیا ہے اور ابن خلدون نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ خلیفہ ہی امت کے معاملات میں زندگی میں بھی غور کرتا ہے اور مرنے کے بعد کا بھی انتظام کرتا ہے۔

حاکم وقت ہی اہلسنّت کا مرجع ہے

اہلسنت کا عقیدہ یہ ہے کہ جو خلیفہ ریاست و حکومت کے امور انجام دے رہا ہے وہی مسلمانوں کے تمام دینی اور دنیاوی امور کا مرجع ہے۔

ابوبکر اپنے زمانہ کے مرجع اعلیٰ تھے اور عمر اپنے دور کے۔

عثمان و معاویہ و یزید اپنے اپنے زمانہ کے مرجع اعلیٰ تھے۔

ہر حاکم اپنے دور میں مرجعیت کے فرائض انجام دیتا تھا یہاں تک کہ یہی سلسلہ خلفاء بنی عباس اور بنی عثمان میں بھی جاری رہا۔

گویا کہ مرجعیت کا مدرک غلبہ ہے اور جو حکومت پر غالب آجائے ـــ اور زمام مملکت سنبھال لے وہی مرجع ہو جاتا ہے۔

ابو یعلیٰ المعز کا بیان ہے کہ امام احمد سے روایت کی گئی ہے کہ "خلافت قہر و غلبہ سے بھی ثابت ہو جاتی ہے اس کے لئے کسی عقد و عہد کی ضرورت نہیں ہے" چنانچہ عبدوس بن مالک العطار کی روایت ہے کہ " اگر کوئی شخص تلوار کے ذریعہ غلبہ حاصل کرنے اور خلیفہ ہو جائے تو کسی خدا اور آخرت پر ایمان رکھنے والے کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اسے امام تسلیم کئے بغیر رات گذارے چاہے وہ انسان نیک کردار ہو یا فاجر"۔

اور ابو الحارث کی روایت میں یہ قول وارد ہوا ہے کہ" اگر ملک کے طلبگاروں میں ہر ایک کے ساتھ ایک جماعت ہو تو حق اس کے ساتھ ہوگا جو غالب آجائے"۔

اس لئے کہ واقعہ حرہ کے موقع پر عبد اللہ بن عمر نے یہ قانون وضع کر دیا تھا کہ ہم غلبہ پانے والے کے ساتھ ہیں اور لوگوں کو بھی اسی کی بیعت کرنی چاہیئے۔

(نظام الحکم للقاسمی)

آپ نے دیکھا کہ اسلام کا سیاسی نظام کس منزل تک پہونچ گیا کہ اب امت کا فرض صرف یہ ہے کہ غلبہ پانے والے کا اتباع کرے اور اس کے دین و دیانت پر ہرگز نظر نہ کرے اور نہ یہ دیکھے کہ شریعت اسلامی کا موقف اس کے بارے میں کیا ہے۔ حد ہو گئی کہ یہ نظریہ اسلامی شریعت کا ایک جزء بن گیا اور حاکم غالب ہی تمام امور دین و دنیا کا مرجع ہو گیا۔!

مرجعیت میں حاکم کا قائمقام کون؟

جب تک حاکم وقت زندہ رہتا ہے وہ امت کے تمام دینی اور دنیوی امور کا ذمہ دار

ہوتا ہے اور جب دنیا سے رخصت ہونے لگتا ہے تو آخری لمحات میں بھی اپنا جانشین ضرور نامزد کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ولی امر مسلمین ہے اور اس کا کام مسلمانوں کے مسائل کی نگرانی کرنا ہے چاہے وہ زندگی میں ہو یا بعد موت سے متعلق ہو۔

یہ بات اجماع صحابہ سے بھی ثابت ہے کہ ابو بکر نے عمر کو صحابہ کے سامنے نامزد کیا اور کسی نے اختلاف نہیں کیا بلکہ اطاعت عمر کو اپنے واسطے لازم قرار دے لیا۔

(مقدمہ ابن خلدون ص ۲۱۰)

یہ ہے اہلسنت کا انداز فکر، لیکن اس پر اس امر کا بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ معاویہ نے یزید کو باقیماندہ صحابۂ کرام کی موجودگی میں نامزد کیا اور کسی نے اختلاف نہیں کیا تو یزید بھی حاکم ہے اور معاویہ بھی صاحب حق ہے اور مخالفت کرنے والا گویا مفسد فی الارض ہے۔ انا للہ

اہلسنت نے خلیفہ کو قائمقام کی نامزدگی میں بالکل آزاد چھوڑ دیا ہے جہاں کسی کو روکنے ٹوکنے کا حق نہیں ہے اور اس کی دلیل بقول ابن خلدون یہ ہے کہ خلیفہ محلِ اعتمادِ قوم ہے اور ابو بکر نے اپنے "کاتب وصیت" عثمان سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر میں تمھارے بارے میں لکھ دیتا تو تم بھی اس کے اہل تھے۔

(طبری ۳/ ۲۹ ۴، سیرۃ عمر ابن الجوزی ص ۳۷)

حضرت عمر کا بھی یہی حال تھا کہ وہ وقت مرگ امور مسلمین کے بارے میں فکرمند تھے اور مختلف اشکال کے بارے میں سوچ رہے تھے جنھیں قائم مقام بنایا جاسکتا تھا۔

"کاش ابو عبیدہ زندہ ہوتے تو انھیں خلیفہ بنا دیتا"

"کاش خالد بن ولید ہوتے تو انھیں حاکم قرار دے دیتا"

"کاش سالم زندہ ہوتے تو انھیں کو جانشین نامزد کر دیتا"

جس کے معنی یہ ہیں کہ سالم زندہ ہوتے تو خلیفہ بن جاتے اگرچہ وہ قریش میں نہیں تھے۔ نہ عرب میں ان کا کوئی معروف نسب تھا۔ صرف بقول بخاری مسجد قبا میں انصار و مہاجرین کی موجودگی میں نماز جماعت پڑھاتے تھے۔

اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگر سالم جیسا غیر معروف انسان خلیفہ ہو سکتا ہے تو انصار کیوں نہیں ہو سکتے تھے جب کہ ان کا نسب عرب میں معروف تھا اور اصحاب ثلاثہ نے بھی ان سے یہی کہا تھا کہ ہم رسول اکرمؐ سے قریب تر ہیں۔

پھر اگر سالم خلیفہ ہو جاتے تو "الائمۃ من قریش" میں کیا باقی رہ جاتا۔

مزید حیرت انگیز بات یہ ہے کہ معاذ بن جبل کل خلافت کے قابل نہیں تھے اور انصار کی خلافت نا قابل قبول تھی اور وہ بھی اہل خلافت ہو گئے۔

اس سے بالاتر یہ بات ہے کہ خالد بن ولید جس نے ہر رُخ سے اسلام سے جنگ کی ہے۔ اس فرزند ابو طالب پر مقدم ہو گیا جس نے ہر محاذ پر اسلام کی طرف سے جہاد کیا ہے۔

حضرت عمر سے کہا گیا کہ عبد اللہ کو نامزد کر دیجئے تو فرمایا کہ وہ ایک عورت کو طلاق دینے کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔ امور مسلمین کا ذمہ دار کس طرح ہو گا، گویا طلاق نہ دینا بھی خلافت سے محرومی کا سبب ہو گیا۔ (شرح النہج للمعتزلی ۱/۶۴)

کہا جاتا ہے کہ آخر میں حضرت عمر کو حضرت علیؑ کا خیال آگیا تھا لیکن کچھ کہنے سے پہلے ہی بیہوش ہو گئے۔ (شرح النہج ۱/۶۴)

بہر حال جانشین نامزد کرنے کی صلاحیت علماء اسلام کی نظر میں ایک آزاد صلاحیت ہے جس پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہے اور ولیعہدی کا کام حضرت ابو بکر کے حضرت عمر کو نامزد کرنے اور حضرت عمر کے بظاہر چھ اور واقعاً عثمان کو نامزد کرنے سے ایک شرعی عمل قرار پا گیا۔

پھر بنی امیہ بھی اسی راستہ پر چلتے رہے ہیں اور بنی عباس اور بنی عثمان نے بھی یہی راستہ اختیار کیا ہے کہ اپنے فرزند یا خاندان کے کسی فرد کو ولیعہد نامزد کر دیا جائے۔

(نظام الحکم للقاسمی ص ۱۹۷-۱۹۸)

اس طرح نامزدگی۔ ولیعہدی اور مستقبل کی مرجعیت کا تقرر ایک شرعی امر ہو گیا جو مصلحت مسلمین کی بنا پر جائز قرار پا گیا اور حضرت عائشہ نے عمر سے کہہ دیا کہ خبردار امت کو لاوارث نہ چھوڑ دینا اور کسی نہ کسی شخص کو معین ضرور کر دینا اور انھوں نے بھی فرما دیا کہ

آپ جسے فرمائیں اسے معین کردیا جائے گویا کہ یہ اختیار ام المومنین کو بھی حاصل ہے۔ (اگر نہیں ہے تو صرف رسول اللہ کو۔ ؟ ۔۔۔ جوادی)

اہلسنّت کے نزدیک اجتماعی مرجعیت

ابن خلدون کا بیان ہے کہ تمام صحابہ اہل فتویٰ نہیں تھے اور نہ سب سے دین اخذ کیا جاسکتا تھا۔ یہ کام صرف ان افراد کا تھا جو حاملان قرآن اور اس کے ناسخ و منسوخ محکم و متشابہ اور دیگر دلائل سے باخبر تھے اور انھوں نے یہ علوم رسول اکرمؐ سے یا ان سے سننے والوں سے حاصل کئے تھے اور انھیں اس دور میں قرّاء کہا جاتا تھا کہ یہ لوگ کتاب پڑھ سکتے تھے ورنہ عرب امّی محض تھے اور ان کے درمیان پڑھے لکھے افراد نادر الوجود تھے اور اسی لئے انھیں قرّاء کہا جاتا تھا۔ (طبقات ابن سعد ۴/ ۱۶۸، آراء علماء المسلمین ص ۵۰)

لیکن اموی دور حکومت آتے ہی عدالت صحابہ کا نظریہ ایجاد ہوگیا اور تمام صحابہ بلا استثناء عادل اور مدرک دین ہو گئے۔ اب سب اہل جنت ہیں اور ان میں کسی ایک کا بھی داخلہ جہنم میں نہیں ہوسکتا ہے۔ ان میں ہر ایک دین میں ماٰخذ ہے اور جس سے بھی دین لے لیا جائے کوئی حرج نہیں ہے۔

اس قانون میں حضرت ابوبکر جو "درجہ اوّل" کے صحابی شمار ہوتے ہیں۔ ان میں اور دیگر صحابہ کی رائے میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ یہی حال عمر اور دیگر اصحاب کا بھی ہے۔

ابوحنیفہ کا ارشاد ہے کہ جب میں کتاب و سنت میں کوئی حکم نہیں پاتا ہوں تو اصحاب کے اقوال کو اخذ کرلیتا ہوں اور اگر ان کے درمیان اختلاف ہوتا ہے تو اپنی پسند سے جسے چاہتا ہوں لے لیتا ہوں اور جسے چاہتا ہوں ترک کردیتا ہوں۔

(المستصفیٰ للغزالی ص ۱۳۵-۱۳۶)

اعلام الموقعین ابن قیم میں ہے کہ امام احمد کے نزدیک اصول احکام پانچ ہیں ایک نص

۲۔ فتویٰ صحابہ . . . . . یہانتک کہ عمومات قرآن کے خلاف صحابی کا عمل خود دلیل تخصیص ہے اور اس کا عمل بھی قول ہی کی طرح حجت اور سند ہے۔ (المدخل الی اصول الفقہ دوالیبی۔ آراء علماء المسلمین ص)

اس مقام پر یہ یاد دلانا مناسب ہے کہ سنت رسولؐ سے مراد قول و فعل و تقریر رسول اکرمؐ ہے اور اس نظریہ میں یہی حیثیت صحابہ کرام کی ہے کہ ان کا عمل بھی ان کے قول کی طرح حجت اور سند ہے اور عمومات قرآن کی تخصیص کا عمل بھی انجام دے سکتا ہے۔ گویا صحابی کا قول ایک آسمانی وحی ہے جس میں کسی طرف سے باطل کا گذر نہیں ہے۔

اور قیامت یہ ہے کہ صحابیت دونوں معانی (لغوی، اصطلاحی) کے اعتبار سے عام ہے اور حضرت ابوبکر و معاویہ و مروان و عبداللہ بن ابی سرح سب کو شامل ہے اور سب ہی مراجع اسلام اور نجوم ہدایت ہیں اور سب ہی کی اقتدار باعثِ نجات ہے۔

گویا اہلسنت کے نزدیک ایک جماعتی مرجعیت بھی ہے جہاں تمام جماعت بلا استثناء مرجع دین ہے اور کسی کے یہاں غلط بیانی کا امکان نہیں ہے۔ سب راست گو اور اہل جنت ہیں اور کسی ایک کی بھی مرجعیت میں شک کرنے والا زندیق ہے جس کا بائیکاٹ ضروری ہے اور اس کی نماز جنازہ حرام ہے۔

صحابہ کے بعد یہی درجہ تابعین کا ہے اور تابعین کے بعد ان کے قائم مقام علماء کرام اور مذاہبی گروہ ہیں جن میں سب کو ایک مستقل مرجعیت حاصل ہے اور کسی کی مرجعیت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مراجع اہلسنت کا طریقۂ کار

وفات مرسل اعظمؐ کے بعد "خلفاء راشدین" کے زمانہ میں خلیفہ ہی مرجع اعلیٰ ہوا کرتا تھا۔ وہ صحابی بھی تھا اور عادل بھی اور پھر حاکم بھی۔ لہذا اسے اختیار تھا کہ جس صحابی سے چاہے مسئلہ دریافت کرے اور اسی کے مطابق عمل کرے۔

چنانچہ عام طور سے ابوبکر و عمر۔ حضرت علیؑ۔ ابی بن کعب۔ معاذ بن جبل، زید بن ثابت وغیرہ سے مسائل دریافت کرتے تھے۔ اس لئے کہ اس وقت تک بنی امیہ کا نظریۂ عدالت صحابہ موجود نہیں تھا اور صحابہ کی اکثریت کو مرجعیت مذہب کا شرف حاصل نہیں تھا۔

بنی امیہ کے دور میں بھی طریقۂ کار تقریباً یہی تھا کہ معاویہ صحابی اور پھر "عادل" ہونے کی بنا پر مسلمانوں کا مرجع اعلیٰ ہوگیا تھا اور وہ سابق خلفاء کی طرح مرجعیت کو استعمال کر رہا تھا کہ

جس سے چاہے دریافت کرے اور جس کی رائے پر چاہے عمل کرے۔

نظریۂ عدالت صحابہ نے اسے جنتی بنادیا تھا اور اس کے ابوبکر و عمر و عثمان و علیؑ کی جگہ پر بیٹھنے کو جائز بنادیا تھا جب کہ وہ طلیق بن طلیق تھا لیکن تمام خلافتی صلاحیتوں کا مالک تھا اور صحابہ کے باہمی اختلاف کی صورت میں اسے بھی ترک و اختیار کا حق حاصل تھا۔

طلاب علوم بھی اسی طرح آزاد تھے۔ صحابہ کے بعد یہی حال تابعین کا تھا اور تابعین کے بعد علماء اسلام اور مذہبی احزاب کا۔ لیکن خلافت اسلامیہ کے زوال کے بعد اہلسنت کا ہر عالم خود ایک مستقل مرجع بن گیا اور ہر گروہ کو ایک مرجع کی حیثیت حاصل ہو گئی اور سب کا صرف ایک کام رہ گیا کہ اپنے کو برحق ثابت کریں اور کسی طرح کرسئ اقتدار تک پہونچ جائیں تاکہ انھیں اور ان کے افکار کو سند بقاء و دوام حاصل ہو سکے۔

فصل پنجم

متبادل مرجعیت

بعض حضرات نے نصوص شرعیہ کے مقابلہ میں اجتہاد فرمایا (جب کہ نص کے ہوتے ہوئے اجتہاد کا کوئی جواز نہیں ہے) اور اس اجتہاد سے یہ فیصلہ فرما دیا کہ جس شرعی مرجعیت کو عقیدۂ الٰہیہ نے معین فرمایا ہے وہ اسلام اور مسلمین کے مفاد میں نہیں ہے اس لئے کہ یہ تعیین نبی کریمؐ کا اپنا اجتہاد ہے اور اس کے پیچھے خدائی اوامر نہیں ہیں اور نبی کریمؐ نے بھی مرجعیت کی تعیین کے وقت رائے عامہ کا خیال نہیں کیا ہے اور یہ نہیں سوچا ہے کہ رائے عامہ خلافت اور نبوت کو ایک خاندان میں نہیں دیکھ سکتی ہے۔

یہ حضرات اپنے دل کی بات حضور اکرمؐ سے نہ کہہ سکے لیکن اس کے بعد حوادث کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور متبادل مرجعیت فوراً تیار کر لی گئی اور تیار کرنے والوں نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ کوئی بہترین کام انجام دے رہے ہیں اور اپنے اس عمل سے اسلام اور رسول اکرمؐ کی کوئی خدمت کر رہے ہیں۔

ان کا خیال تھا کہ عنایت الٰہیہ نے صرف انھیں یہ موقع عطا فرمایا ہے کہ اسلام کے مستقبل کا نقشہ تیار کر سکیں اور صفوف مسلمین میں ان سے زیادہ اس عمل کے انجام دینے کا اہل کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ فیصلہ ہو گیا اور پھر اپنے دل کی ترجمانی کا کاروبار بھی شروع ہو گیا۔

متبادل مرجعیت کی خطوط سازی

رسول اکرمؐ بستر مرگ پر ہیں اور جبرئیلؑ کی آمد کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا ہے اس لئے

کہ جبریلؑ کی آمد حالت مرض میں بھی جاری تھی۔

رسول اکرمؐ کو امت کے مستقبل کا مکمل علم ہے۔ آپ اپنا فرض ادا کر چکے ہیں اور پیغام الٰہی کو مکمل طریقہ سے پہونچا چکے ہیں۔ آپ کو خوب معلوم ہے کہ اپنے اطراف کیا ہو رہا ہے اور یہ سکوت ایک طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ اس کے بعد شرعی سیاست اور مرجعیت کو ہوا میں اڑا دیا جائے گا اور اس طرح اسلام اپنے زبردست اسلحہ سے محروم ہو جائے گا اور وہ کردار جس نے دعوت اور دولت کو جنم دیا ہے معطل ہو کر رہ جائے گا۔

پیغمبرؐ جیسا انسان آندھیوں کے خوف سے راستہ چھوڑ نہیں سکتا ہے اور امت کے بارے میں شدید رحم و کرم کے احساس سے دستبردار نہیں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ آپ نے کمال دین، تمام نعمت، بیان کل احکام (مع احکام بول و براز) کے باوجود یہ چاہا کہ امت کے لئے اس موقف کا خلاصہ پیش کر دیں جس کے بعد گمراہی کا امکان نہ ہو اور امت آنے والے ناگہانی خطرات سے سلامتی کے ساتھ باہر نکل آئے اس لئے کہ یہ خطرات شدت سے موت پیغمبرؐ کا انتظار کر رہے ہیں تاکہ ان کے بعد منھ کھولیں اور بہترین صاف فضا کو مکدر کر دیں اور اسلام کی حرکت کو روک کر اس کا راستہ تبدیل کر دیں۔

سنگین مقابلہ

رسول اکرمؐ بستر مرگ پر ہیں۔ گھر اصحاب سے بھرا ہوا ہے اور آپ اسلام کے مستقبل کے خطوط کو مختصر انداز سے واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ "میں تمھارے لئے ایک تحریر لکھنا چاہتا ہوں جس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہو گے"۔

اس بیان میں کیا غلطی تھی۔ کون گمراہی کے مقابلہ میں تحفظ نہیں چاہتا تھا۔ اور کیوں نہیں چاہتا تھا؟

ہر مسلمان کو وصیت کرنے کا حق ہے اور ہر مسلمان اپنے مرنے سے پہلے اپنے دل کی بات کہہ سکتا ہے۔

سننے والے اس کے بعد آزاد ہیں کہ عمل کریں گے یا نہ کریں گے لیکن کم سے کم مرنے والے کو بیان کرنے کا حق تو دیا جاتا ہے۔

اگر پیغمبرؐ اسلام ایک عام مسلمان ہوں اور ان کی حیثیت ایک قائد اور پیغمبرؐ کی نہ ہو تو بھی انھیں یہ حق حاصل ہے۔

لیکن اس کے باوجود فاروق نے مقابلہ کیا اور لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا کہ "پیغمبرؐ پر مرض کا غلبہ ہے اور تمھارے لئے قرآن کافی ہے"۔

جس کے بعد گھر والوں میں اختلاف اور جھگڑا شروع ہو گیا۔ کسی کا کہنا تھا کہ قلم دوات دے دو تا کہ نوشتہ ہدایت لکھ دیں اور کوئی وہی بات دہرا رہا تھا جو عمر نے کہی تھی۔

یہاں تک کہ جھگڑا حد سے آگے بڑھ گیا اور آپ نے فرما دیا کہ میرے پاس سے نکل جاؤ۔ (صحیح بخاری کتاب المرضیٰ باب قول المریض قوموا عنی ۷/۹، صحیح مسلم آخر کتاب الوصیۃ ۵/۷۵، شرح نووی ۱۱/۹۵، مسند احمد ۴/۳۵۶ حدیث ۲۹۹۲، شرح نہج البلاغہ ۶/۵۱)۔

دوسری روایت میں ہے کہ جب حضورؐ نے فرمایا کہ کوئی کاغذ لاؤ تا کہ میں وہ نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہو گے تو آپس میں جھگڑا شروع ہو گیا جب کہ نبی کی بارگاہ میں جھگڑا جائز نہیں ہے اور بعض افراد نے یہاں تک کہہ دیا کہ پیغمبرؐ ہذیان بک رہے ہیں۔ جس پر آپؐ نے فرمایا کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں تمھاری دعوت سے بہتر حالت میں ہوں۔ (صحیح بخاری ۴/۳۱، صحیح مسلم ۲/۱۶، مسند احمد ۱/۲۲۲ — ۳/۲۸۶)۔

تیسری روایت کی بنا پر آپ نے فرمایا کہ قلم دوات لے آؤ تا کہ میں وہ نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہو گے تو لوگوں نے صاف کہہ دیا کہ رسول اللہ ہذیان بک رہے ہیں۔ (صحیح مسلم ۲/۱۶، ۱۱/۹۴-۹۵ شرح نووی، مسند احمد ۱/۳۵۵، طبری ۲/۱۹۳، کامل ص ۳۲۰)۔

چوتھی روایت بخاری کے مطابق آپؐ نے فرمایا کہ کوئی کاغذ لے آؤ میں وہ

نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہو گے تو عمر بن الخطاب نے کہا کہ نبی پر مرض کا غلبہ ہے اور ہمارے پاس کتاب خدا ہے جو ہمارے لئے کافی ہے اور اس پر شدید اختلاف ہو گیا جس کے بعد حضورؐ نے فرما دیا کہ میرے پاس سے نکل جاؤ۔ میرے سامنے جھگڑا جائز نہیں ہے۔ (صحیح بخاری ۱/ ۳۷)

پانچویں روایت بخاری کے مطابق۔ آپ نے فرمایا کہ کاغذ لاؤ میں وہ نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہو گے جس کے بعد جھگڑا شروع ہو گیا حالانکہ نبی کے سامنے جھگڑا روا نہیں ہے اور لوگوں نے کہہ دیا کہ انھیں کیا ہو گیا ہے۔ کیا ہذیان بک رہے ہیں؟ کیا تم لوگ کچھ سمجھ رہے ہو اور اس طرح سب یہی بات دُہرانے لگے اور آپ نے فرمادیا کہ میں جس حال میں ہوں یہی میرے واسطے بہتر ہے۔

(صحیح بخاری ۵/ ۱۳۷، طبری ۳/ ۱۹۲-۱۹۳)

چھٹی روایت بخاری کے الفاظ میں۔ آپ نے فرمایا کہ کوئی چیز لے آؤ کہ میں ایک نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہو تو لوگوں نے جھگڑا شروع کر دیا جب کہ نبی کے سامنے جھگڑا روا نہیں ہے اور لوگوں نے کہا کہ ذرا دریافت کرو شاید یہ ہذیان بک رہے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو میں اس سے بہتر حال میں ہوں جدھر تم لوگ دعوت دے رہے ہو۔ (صحیح بخاری ۲/ ۱۳۲، ۴/ ۶۵-۶۶)

ساتویں روایت بخاری کے الفاظ میں۔ فرمایا آؤ میں ایک نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہو تو عمر نے کہا کہ پیغمبرؐ پر مرض کا غلبہ ہے اور تمھارے پاس قرآن موجود ہے اور وہ ہمارے لئے کافی ہے۔ جس پر اہل خانہ میں اختلاف ہو گیا اور بعض نے کہا کہ قلم دوات دے دو تاکہ نوشتہ لکھ دیں اور بعض نے عمر کی بات کو دُہرا دیا اور جب اختلاف حد سے آگے بڑھا تو آپ نے فرما دیا کہ میرے پاس سے نکل جاؤ۔ (صحیح بخاری ۸/ ۱۶۱)

ایک اور روایت میں ہے کہ عمر نے صاف کہہ دیا کہ رسول ہذیان بک رہے ہیں۔ (تذکرۃ الخواص للسبط ابن الجوزی الحنفی ص ۶۲، سر العالمین غزالی ص ۲۱)

اور اس بات کا خود عمر نے اعتراف کیا ہے کہ میں نے اس لئے روک دیا تھا کہ کہیں مسئلہ علیؑ

کے حوالے نہ کر دیں۔ (شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید معتزلی ۳/۱۱۴ سطر ۲۷ طبع اول مصر و آفسیٹ بیروت و جلد ۱۲/ ۹، سطر ۳ بتحقیق محمد ابو الفضل و ۲/ ۸۰۳ دار مکتبۃ الحیاۃ و ۳/ ۱۶۷ دار الفکر)

مقابلہ کا تجزیہ

فریق اول ۔ حضرت رسول اکرم خاتم النبیین محمد مصطفیٰؐ ۔ قائد حکومت اسلامیہ ۔

فریق دوم ۔ عمر بن الخطاب، مشہور صحابی، حکومت اسلامی کے نمایاں وزیر اور مستقبل کے خلیفہ دوم ۔

محل مقابلہ ۔ خانۂ رسالت ۔

گواہ ۔ صحابہ کبار ۔

مقابلہ کے ابتدائی نتائج

۱۔ تفرقہ :

حاضرین دو حصّوں پر تقسیم ہو گئے :

قسم اول ۔ فاروق کے موید ین جو ان کے رسول اکرمؐ اور تحریر کے درمیان حائل ہو جانے کے حق میں تھے اور ان کی دلیل یہ تھی کہ فاروق عظیم صحابی، مستقبل کے وزیر اور اسلام کے مہربان ہیں اور رسول اکرمؐ حالت مرض میں ہیں لہذا انھیں کتابت کی زحمت دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ قرآن کافی ہے اور اس کے بعد کسی ضمانت کی ضرورت نہیں ہے اور نہ امت گمراہی سے بچنے کے لئے کسی نوشتہ کی محتاج ہے ۔

قسم دوم ۔ تابع اور اصل کے درمیان مقابلہ کی مکمل طور سے مخالف تھی اور اس کا موقف یہ تھا کہ رسول اکرمؐ اور ان کے مصدِق کے درمیان یا خدائے کریم سے تعلیمات حاصل کرنے والے اور اپنی رائے سے اجتہاد کرنے والے کے درمیان کیا مقابلہ ہے ؟

مستقبل کا وزیر رئیس مملکت سے اختلاف کرنے کا حق نہیں رکھتا ہے ۔

رسول اکرمؐ کو بولنے اور لکھنے کا موقع ملنا چاہیئے تھا ۔

وہ نبی تھے اور نبی رہنے والے تھے۔ وہ رئیس مملکت تھے اور ان کی ریاست کے خاتمہ کا کوئی امکان نہیں تھا اور کم از کم وہ ایک مسلمان تو بہرحال تھے جسے اپنے معاملات وصیت کے بارے میں آزاد ہونا چاہیئے۔ پھر مسئلہ ان کے گھر کا ہے اور کسی شخص کو دوسرے کے گھر میں دخل اندازی کرنے کا حق نہیں ہے۔ صاحب خانہ اپنے گھر میں مکمل آزادی رکھتا ہے۔

۲۔ نئی طاقت کا ظہور:

حضرت فاروق ایک عظیم طاقت کی شکل میں نمودار ہوئے جنھیں رسول اکرمؐ کو بھی روک دینے کا حق حاصل تھا اور وہ ایک بڑی جماعت کو حضورؐ کے مقابلہ میں ان کے سلنے ہم خیال بنالینے کی طاقت رکھتے تھے۔

انھوں نے حالات کا رُخ موڑ دیا اور آجتک اس نئے رُخ کی ذہنی قیادت کر رہے ہیں۔

کسی کو یقینی طور پر یہ معلوم نہیں ہے کہ کس نے انصار کو سقیفۂ بنی ساعدہ میں جمع ہونے پر آمادہ کیا تھا اور کس طرح یہ اجتماع مکمل ہوگیا تھا؟ اور نہ کسی کو یہ خبر ہے کہ سارے مہاجرین میں اس کی اطلاع صرف عمر کو کس طرح ہوگئی اور سارے مہاجرین میں صرف ابوبکر، عمر، ابوعبیدہ ہی کیوں حاضر ہوئے؟ ۔ جب کہ تاریخ میں یہ بھی ہے کہ ابوبکر عترت پیغمبرؐ کی ہمدردی اور تجہیز و تکفین کی مساعدت میں شامل تھے اور عمر نے انھیں بلا کر سقیفہ کے حادثہ کی اطلاع دی تھی اور ابوبکر و عمر کو راستہ میں ابوعبیدہ مل گئے تھے۔ (الامامۃ والسیاسۃ ص ۵)

گویا حادثات کے ساتھ مکمل طور پر چلنے والے اور منٹ منٹ کی خبر رکھنے والے صرف حضرت عمر تھے اور سقیفہ میں بھی انھیں کا سارا زور تھا کہ خود بھی خلیفہ بننا چاہتے تو بن سکتے تھے۔

چنانچہ سقیفہ سے نکلنے کے بعد اور حاضرین کی اکثریت کے بیعت ابوبکر کرنے کے بعد بھی اتمام بیعت کے عمل کی قیادت انھیں کے ہاتھ میں تھی اور انھوں نے مہاجرین سے پکار کر کہا تھا کہ میں نے اور انصار نے ابوبکر کی بیعت کرلی ہے لہذا اب سب کا فرض ہے کہ ان کی بیعت کریں جس کے بعد عثمان اور ان کے ساتھی بنی امیہ نے اٹھ کر بیعت کرلی اور یہ لوگ سب سے پہلے بیعت کرنے والے قرار پائے۔

پھر عمر بن الخطاب ہی نے بیعت کرنے والوں کو منظم کیا اور ایک لشکر کی شکل میں

خانۂ زہراؑ کی طرف بھیج دیا تاکہ حضرت علیؑ اور ان کے ساتھیوں کو گھر سے باہر نکال کر ابوبکر کی بیعت کرائیں۔ (الامامۃ والسیاسۃ ص ۵)

پھر عمر ہی نے لکڑیاں جمع کی تھیں اور خانۂ زہراؑ کو جلانے کا پروگرام بنایا تھا اگر گھر میں پناہ لینے والے افراد باہر نہ آجاتے۔

اور انھوں نے ہی بیعت نہ کرنے کی صورت میں حضرت علیؑ کو قتل کی دھمکی دی تھی۔ (الامامۃ والسیاسۃ ص ۱۳)

انھوں نے ہی ابوبکر کو مشورہ دیا تھا کہ ابوسفیان کے پاس جو صدقات ہیں انھیں ابوسفیان ہی کو دے دیا جائے تاکہ اس کی محبت کو جذب کیا جاسکے۔ (شرح النہج ۱/۲۰۶-۲۰۷)

انھوں نے ہی ابوبکر سے کہا تھا کہ ابوسفیان کے فرزند یزید کو لشکر شام کا قائد بنا دیا جائے۔ (طبری ۳/۲۰۹-۲۱۰، تاریخ الحکم للقاسمی ص ۱۵۲)

وہی وہ عظیم طاقت تھے جس نے ابوبکر کی حکومت کو مستحکم بنایا اور تھوڑے عرصہ کے بعد جب ابوبکر کا انتقال ہوگیا تو ایک مستقل اور مستحکم حکومت کے وارث بن گئے اور بآسانی اقتدار ان کی طرف منتقل ہوگیا اور یہ نقل وانتقال گویا ایک فطری عمل تھا جس کا تسلسل جلد یا بہ دیر حتمی تھا۔

حالات پر نظر رکھنے والے اس حقیقت کا بآسانی اندازہ کرسکتے ہیں کہ منصوبہ بندی میں عمر کی طاقت کا کوئی جواب نہیں تھا۔ (کامل ۳/۲۴، شرح النہج ۳/۱۰۷)

انھوں نے عصر مابعد النبوۃ کے لئے ہیئت تاسیسیہ کا عمل انجام دیا اور مستقبل کی اسلامی حکومت کا سارا پروگرام مرتب کر دیا۔ اب قیامت تک بنی ہاشم میں خلافت اور نبوت کا اجتماع نہیں ہوسکتا ہے اور خلافت انھیں کے گرد پ کے درمیان گردش کرتی رہے گی اور ہر غلبہ حاصل کرلینے والے کا حق بن جائے گی۔ چاہے وہ غلبہ قانونی ہو یا غیر قانونی۔

۲۔ نظریہ تغلب کا ظہور:

اس مقابلہ کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اسلام میں تغلب اور "پیروکار کو اصل پر مقدم کرنے"

یا اس کے برابر قرار دینے کا تصور پیدا ہو گیا اور ایک تشکیکی ماحول پیدا ہو گیا کہ حق پیروکار کے ساتھ ہے یا اصل کے ساتھ۔ امت کے ساتھ ہے یا پیغمبرؐ کے ساتھ۔

فاروق کی دلیل یہ تھی کہ پیغمبرؐ پر بیماری کا غلبہ ہے اور ایسی حالت میں کتابت ایک بڑے خطرہ کا سبب بن سکتی ہے اور اس بات میں بہت سے افراد ان کے ہم خیال ہو گئے، جو خود ایک عظیم تشکیک ہے۔

فریق ثانی کی دلیل یہ تھی کہ حضرت محمدؐ بہر حال پیغمبر ہیں اور آخری سانس تک پیغمبر رہیں گے۔ وہ وحی الٰہی کے بغیر کلام نہیں کر سکتے ہیں اور یہ ایک یقینی امر ہے۔ لہٰذا یقین کو چھوڑ کر تشکیک کی طرف جانا ایک غیر معقول امر ہے اور مرض انسان کو بولنے سے نہیں روک سکتا ہے۔

دو متشابہ حالات

ا۔ "صدیق" پر مرض کا غلبہ تھا اور درد کی شدت۔ لیکن جب ان کا مشورہ مکمل ہو گیا تو انھوں نے تنہائی میں عثمان کو طلب کیا اور فرمایا کہ لکھو اما بعد..... ! اس کے بعد درد کی شدّت سے بیہوش ہو گئے۔ عثمان نے از خود لکھنا شروع کر دیا کہ "میں تم لوگوں پر عمر بن الخطاب کو خلیفہ بنا رہا ہوں اور میں نے تمھاری بھلائی میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہوش آیا تو فرمایا کہ کیا لکھا ؟

عثمان نے پڑھ کر سنا دیا۔

فرمایا کہ میں سمجھتا ہوں کہ تمھیں یہ خوف پیدا ہو گیا تھا کہ اگر میں بیہوشی میں مر گیا تو کہیں امت میں اختلاف نہ پیدا ہو جائے۔ اس لئے تم نے از خود لکھ دیا۔

عثمان نے کہا بے شک۔

فرمایا خدا تمھیں اسلام کی طرف سے جزائے خیر دے اور پھر تحریر کو منظور کر دیا۔ یہ ایک اجماعی حقیقت ہے۔ (طبری ۲۲۹/۳، نظام الحکم للقاسمی ص ۱۷۶،

سیرۃ عمر ابن الجوزی ص ۳۷، تاریخ ابن خلدون ۲/۸۵)۔

۲۔ عمر پر مرض الموت طاری ہوا اور طبیب نے کہا کہ آج کی شام مشکل ہے لہٰذا جو کرنا ہے کیجئے۔

انھوں نے اپنے فرزند عبداللہ سے کہا کہ کاغذ لاؤ اور پھر اسے مٹا دیا، اور درد کی شدّت میں فرمایا کہ خدا کی قسم اگر میرے قبضہ میں تمام کائنات ہوتی تو سب دہشتِ موت کے فدیہ کے طور پر دے دیتا۔

اس وقت آپ کا سر عبداللہ کی گود میں تھا۔ فرمایا کہ میرا رخسار خاک پر رکھ دو۔ انھوں نے ایسا نہ کیا تو پھر ڈانٹ کر کہا۔ اور فرمایا کہ عمر اور مادرِ عمر کے لئے جہنم ہی ہے اگر خدا معاف نہ کرے۔ (الامامۃ والسیاسۃ ص ۲۱-۲۲، طبقات ابن سعد)۔

تجزیہ۔!

حضرت ابوبکر نے درد و مرض کی شدّت کے باوجود وصیّت کی اور جو چاہا لکھوا دیا۔

اسی طرح عمر نے بھی درد کی شدّت کے باوجود وصیّت کی اور شوریٰ کا تقرر کر دیا اور یہ اطمینان پیدا کر لیا کہ عثمان خلیفہ ہو جائیں گے اور بنی ہاشم میں کوئی لوگوں کی گردن پر مسلّط نہ ہو سکے گا چاہے کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو۔

دونوں حضرات کی وصیت نافذ ہوئی۔

دونوں کو بولنے کا موقع دیا گیا۔

دونوں نے بعد کے حالات کا انتظام کیا۔

حالانکہ دونوں پر مرض کا غلبہ تھا۔

صرف اس لئے کہ وہ اپنے عہدہ پر باقی تھے اور عہدہ دار کو بعد کے حالات کا انتظام کرنے کا حق ہے اور یہ ایک اجماعی حقیقت ہے جس میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ہے۔

اب خدا جانے کہ ان دونوں حضرات کو کس طرح شدّتِ مرض میں یہ موقع دیدیا گیا اور رسول اکرمؐ کو کیوں اس عمل سے محروم رکھا گیا۔

کیا پیغمبر اسلام کو اتنا حق بھی نہیں تھا جتنا ابو بکر و عمر کو تھا اگر دونوں کو برابر تسلیم کرلیا جائے جب کہ یہ بات غیر معقول ہے۔ اس لئے کہ پیغمبر اسلامؐ نبی مرسل اور قائد امت تھے اور ابو بکر و عمران کے تابع تھے۔ پیغمبر پر وحی نازل ہوتی تھی اور اکثر اوقات حالت مرض میں نازل ہوتی تھی۔ (طبقات ابن سعد ۲ ص ۱۹۳)

اور پروردگار نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ "جو میرا رسول دیدے اسے لے لو اور جس چیز سے روک دے اس سے رک جاؤ"

"تمھارا ساتھی مجنون نہیں ہے"۔

"تمھارا ساتھی نہ گمراہ ہوا ہے اور نہ بہکا ہے"۔

"اس کا کلام وحی پروردگار ہے"۔

آخر یہ ایک لمحہ میں کیا انقلاب آیا کہ ان صفات کا حامل ہذیان گو ہوگیا۔ اور اس کی تحریر خطرہ کی نشانی بن گئی۔

یہ وہ حقائق ہیں جن کا دنیا کی کوئی طاقت انکار نہیں کرسکتی ہے اور نہ ان کا دفاع ممکن ہے اور اس واقعہ نے اسلام کے مستقبل کو تباہ و برباد کرڈالا ہے بلکہ یہیں سے ان تمام مصائب کا آغاز ہوا ہے جو عالم اسلام پر نازل ہوئے ہیں۔

اگرچہ اہلسنت دانستہ طور پر انکار کرتے ہیں اور اسے صرف ایک حادثہ قرار دیتے ہیں۔

غرضکہ عملی طور پر تابع کو اصل پر ترجیح دی گئی اور اس طرح پیروکار مرجع بن گیا اور مرجع حالات کا تماشائی۔ اور پیروکار نے جو چاہا وہ ہوگیا اور اس کا ارادہ غالب آگیا۔ لوگ اس کے گرد جمع ہوگئے اور اس طرح غلبہ کا نظریہ ایجاد ہوگیا اور بعد میں اسے ایک شرعی بنیاد کی حیثیت حاصل ہوگئی اور امت کو یہ حق مل گیا کہ وہ ٹکرانے والوں کا تماشہ دیکھے اور بعد میں غلبہ پالینے والے کے ساتھ ہو جائے چاہے اس کے صفات اور اس کی دیانت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔

اس کے بعد ہمیں کوئی حیرت نہیں ہے اگر ہم معاویہ کو طلیق بن طلیق۔ مولفۃ القلوب

ہونے کے باوجود تخت خلافت پر دیکھتے ہیں اور اول المسلمین، ولی خدا بالنص، مولی المومنین والمومنات کو محروم منصب دیکھتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ معاویہ اپنے کو علیؑ سے افضل اور انسب باور کرانا چاہتا ہے۔

ہمیں اس بات پر بھی تعجب نہیں ہے کہ مروان بن الحکم خلافت کا دعویدار ہے جبکہ وہ حکم بن العاص کا بیٹا ہے جس پر حیات پیغمبرؐ میں مدینہ میں داخلہ بھی ممنوع تھا بلکہ ابوبکر و عمر کے زمانہ میں بھی یہ ممانعت جاری رہی۔ صرف عثمان نے خلافت پانے کے بعد نہایت احترام سے اسے مدینہ میں داخل کیا اور اس کے فرزند کو رئیس الوزراء اور داماد بنا دیا۔

اصل اور پیروکار یا تابع و متبوع یا اللہ و اسلام کی نظر میں مقدم و موخر کا یہ تفرقہ یونہی چلتا رہا یہاں تک کہ ولید بن عقبہ امام حسینؑ کے مقابلہ میں حکومت کا اظہار کرتا ہے اور امام حسینؑ کو نصیحت کرتا ہے اور گویا امام حسینؑ کا فرض ہے کہ اس کی نصیحت کو قبول کرلیں جب کہ ولید وہی ہے جس نے صبح کی نماز چار رکعت پڑھانے کے بعد بھی یہ سوال کیا تھا کہ اگر ماموموین کی خواہش ہو تو مزید اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ امام حسینؑ کا بھی امام اور امیر ہو سکتا ہے اور اسے وہ مرجعیت حاصل ہو سکتی ہے کہ امام حسینؑ بھی دین و دنیا کے مسائل میں اس کی طرف رجوع کریں۔ (انا للہ)

۴۔ غلبہ کی کامیابی:

رسول اکرمؐ اور عمر بن الخطاب کے مقابلہ کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ غالب آجانے والے کو کامیاب کہا جائے اور وہی اس موقع کا سردار تسلیم کیا جائے۔

اسی کا نام امام المسلمین اور رئیس مملکت اسلامی ہو اور وہی دین و دنیا کے تمام مسائل کا مرجع ہو۔

اسی کے ہاتھ میں تمام وسائل طاقت ہوں اور وہی حکومت کے تمام امکانیات پر قدرت رکھتا ہو کہ جسے جو چاہے عطا کر دے یا روک دے اور سوائے خدا یا مقدار دینداری کے کوئی نگرانی کرنے والا نہ ہو۔

اسی کو لشکر اسلام کا قائد قرار دیا جائے کہ جہاں چاہے داخلی یا خارجی امن کے

نام پر اسے استعمال کرے اور رعایا کو بہر صورت قابو میں رکھے۔

تمام وسائل اعلام پر بھی اسی کا قبضہ ہو کہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بنا سکے اور ایک پست ترین انسان کو ہمالیہ بنا کر ہمالیہ کو ذرّہ کی جگہ دیدے۔

مویدین کو وہ مرتبہ حاصل ہو کہ تمام بست وکشاد انھیں کے ہاتھ میں ہو اور مرور زمانہ سے وہی مرجع بن جائیں۔

غلبہ کو بنیاد بنا دیا جائے اور غلبہ ہی کے ذریعہ مرجعیت کا فیصلہ کیا جائے۔

غالب آجانے والے ہی سماج کے سربراہ ہوں اور وہی چمکتے ہوئے ستارے دکھائی دیں اور جو شخص بھی ان کے ساتھ چلے اسے اکثریت کی نظروں میں معتبر بنا دیا جائے اور عوام اسی تار پر رقص کرتے رہیں۔

امت میں اسی طرح کا اتحاد پیدا ہو اور ہر سال گزرنے کے بعد مزید نظریہ کو استحکام حاصل ہو اور ہر چند سال کے بعد نظریہ مزید جڑ پکڑ لے اور یہی رائے عامہ اور سیاسی عقیدہ کی حیثیت حاصل کر لے۔

۵۔ عترت پیغمبرؐ کی برطرفی:

ایک ایسے ہی ماحول میں عترت پیغمبرؐ نے قانون کی برتری کا نعرہ بلند کیا اور یہ اعلان کیا کہ ان کا ایک حق ہے جو انھیں ملنا چاہیئے لیکن عوام الناس کی ذہنیت ان کے قانونی حق کی راہ میں حائل ہو گئی۔

حضرت علی بن ابی طالبؑ کا ابوبکر سے مکالمہ نہایت درجہ واضح، منطقی اور قانونی تھا جس کا شاہد ابوبکر کا سب سے پہلے بیعت کرنے والا بشیر بن سعد تھا جس نے گفتگو کو سن کر یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ "یا علیؑ اگر اس گفتگو کو انصار نے بیعت ابوبکر سے پہلے سن لیا ہوتا تو تمھارے بارے میں دو آدمیوں کو بھی اختلاف نہ ہوتا۔" لیکن حکومت بہرحال حکومت ہوتی ہے اور حزب اختلاف کو حزب اختلاف ہی کہا جاتا ہے اور فطری طور پر حکومت یا اہل حکومت کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ حزب اختلاف کو سیاسی اعتبار دے دیں یا اپنے مفادات اس کے حوالے کر دیں۔

یہ تو حضرت فاطمہؑ بنت پیغمبرؐ کے وجود کی برکت تھی کہ حضرت علیؑ کے ساتھ انکی حمایت نے حضرت علیؑ کو قتل سے بچا لیا جب کہ قتل کی دھمکی دی جا چکی تھی اور اس طرح انھیں حیاتِ فاطمہؑ تک بیعت پر مجبور نہیں کیا گیا اور اس وقت بھی کوئی واضح کارروائی نہیں کی گئی جب یہ دونوں حضرات انصار کے گھروں کا دورہ کر رہے تھے اور ان سے نصرت کا مطالبہ کر رہے تھے اور انصار کا ایک ہی جواب تھا کہ ہم اس شخص کی بیعت کر چکے ہیں۔ اگر آپ کے شوہر بیعت سے پہلے آجاتے تو ہم انھیں کے ساتھ ہوتے اور حضرت علیؑ برابر یہ کہہ کر احتجاج کر رہے تھے کہ کیا میں جنازۂ رسولؐ کو چھوڑ دیتا اور لوگوں کے ساتھ حکومتی جھگڑوں میں شامل ہو جاتا ــــ؟

اور جناب فاطمہؑ کا آخری فیصلہ یہ تھا کہ ابو الحسن نے وہی کیا جو انھیں کرنا چاہیئے تھا اور قوم نے وہ کیا ہے جس کا حساب اللہ کی بارگاہ میں دینا ہے۔ (الامامۃ والسیاسۃ ص ۱۲)

ان تمام باتوں کے باوجود نتیجہ یہی ہوا کہ حضرت علیؑ اور ان کے شیعوں کو برطرف کر دیا گیا اور انھیں بنی ہاشم سے بھی جُدا کرنے کی کوشش کی گئی جب عباس کے سامنے یہ پیشکش رکھی گئی کہ حکومت کے ساتھ شامل ہو جائیں اور انھیں اور ان کی اولاد کو بھی کوئی حصہ دے دیا جائے گا۔ لیکن عباس نے قطعی طور پر رد کر دیا اور اس پیشکش کو قبول نہیں کیا۔ (الامامۃ والسیاسۃ ص ۱۵-۱۶)

واضح سی بات ہے کہ اگر عام انسان کو حکومت اور حزب اختلاف کے درمیان پسند کا اختیار دے دیا جائے تو وہ حکومت ہی کا ساتھ پسند کرے گا کہ اس کے ساتھ حکومت کی قوت ہے۔

لیکن اس کے باوجود اہلبیتؑ کا اختلاف جاری رہا اور قریب تھا کہ حکومت اور ان کے درمیان ہر قسم کے تعلقات کا خاتمہ ہو جائے جب عمر نے خانۂ سیدہؑ کے جلانے کی دھمکی دے دی لیکن پروردگار نے بہر حال اہلبیتؑ کو اس مصیبت سے بچا لیا۔

حکومت کا یہ نظریہ کہ خلافت اور نبوت ایک گھرانے میں جمع نہیں ہو سکتی اسقدر شدّت اختیار کر گیا کہ اسی کو بنی ہاشم کے ہر اقدام کے خلاف حربہ کے طور پر استعمال کیا گیا اور

حکومت کا یہ ایمان راسخ ہوگیا کہ قریش نے اس قانون کو اختیار کر کے مکمل طور پر ہدایت حاصل کر لی ہے۔ (کامل ۳/۲۴ حوادث ۲۳ھ)

اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ بھی طے ہوگیا کہ بنی ہاشم کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط نہیں کیا جا سکتا چاہے صاحب طاقت اور امانت دار ہی کیوں نہ ہوں اور اس قانون پر ابوبکر و عمر کے دور میں پوری دقت نظر کے ساتھ عمل ہوتا رہا اور عمر کی خصوصی خواہش یہ تھی کہ بنی ہاشم کے کسی موید کو حکومت میں کوئی جگہ نہ دی جائے۔

(مروج الذہب ۲/۳۵۳)

چنانچہ حضرت علیؑ اور ان کے شیعوں کو سماج سے بالکل الگ کر دیا گیا اور اب صرف یہ برتاؤ باقی رہ گیا کہ ان کے عطیئے بند نہ کئے جائیں اور انھیں دیگر افراد پر مقدم کیا جائے جس کے نتیجہ میں سب کے جان و مال محفوظ ہوگئے اور اکثر مسائل میں حضرت علی کی طرف رجوع اور ان سے مشورہ کیا جانے لگا اور حالات کسی مقدار میں پُرسکون ہوگئے اور فتوحات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

لیکن عثمان کے خلافت پانے کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد لوگوں نے ان سے الگ ہونا شروع کر دیا اور بنی امیہ قصر حکومت پر قابض ہونے لگے یہاں تک کہ تمام صحابہ کنارہ کش ہوگئے اور تمام بنی امیہ نے گھیرا ڈال دیا اور قصر خلافت پر قبضہ کر لیا۔

آل محمدؐ کے لئے بنی امیہ کے دور میں بھی کوئی نئی صورت حال نہیں پیدا ہوئی اور جب انھیں ابوبکر و عمر کے دور میں کوئی جگہ نہیں دی گئی تو بنی امیہ کے دور میں کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ادھر حضرت علیؑ اور ان کے شیعہ بنی امیہ کی بداعمالیوں پر خاموش بھی نہیں رہ سکتے تھے لہٰذا اہلبیتؑ کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بنی امیہ کی مخالفت کا نام دیدیا گیا اور ان کا وجود حکومت کی نگاہ میں پریشانی کا باعث بن گیا۔

ادھر بنی ہاشم اور بنی امیہ کے خاندانی اختلافات کا سلسلہ بھی چل رہا تھا جس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ بنی امیہ اور قوم کے درمیان مصلحانہ جنگ شروع ہوگئی جس میں بنی امیہ کی قیادت معاویہ کے ہاتھ میں تھی اور امت کی ریاست و زعامت حضرت علیؑ کے ہاتھوں

میں۔ لیکن یہاں بھی طاقت قانون پر غالب آئی اور معاویہ کے سر پر تاج ملوکیت رکھ دیا گیا اور اس سال کا نام "عام الجماعہ" ہو گیا۔

اب آل محمدؐ سے مقابلہ کا ایک نیا محاذ کھل گیا جہاں آنسوؤں اور خون کے سوا کچھ نہ تھا۔

ان کے وجود کو ختم کر دینے کی مہم چلائی گئی۔

ان پر سب و شتم ہر شہر میں لازم قرار پا گیا۔

ان کی شہادت ناقابل قبول ہو گئی اور ان کے چاہنے والوں کے نام سرکاری دفتر سے کاٹ دیے گئے اور انھیں ہر طرح کے وظیفہ سے محروم کر دیا گیا۔ (تاریخ ابن عساکر ۴۷/۴، معاویہ فی المیزان استاد عقاد ص ۱۶، شیخ المضیرہ ص ۱۸۰)

جدید مرجعیت کا سربراہ

پہلے مرحلہ میں خلیفۃ المسلمین مرجع امور دین و دنیا ہوتا ہے بشرطیکہ وہ غلبہ حاصل کرلے چاہے اس کا کردار کچھ بھی ہو۔ اس کے مقابلہ میں ولی امت اور سربراہ اہلبیتؑ کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اس کے بعد جملہ صحابہ کرام مرجع مسلمین ہیں کہ سب عادل اور اہل جنت ہیں اور سب اُن اہلبیتؑ کا بدل ہیں جنھیں قرآن کریم نے طیب و طاہر قرار دیا ہے۔

صحابہ کی نسل کے خاتمہ کے بعد تابعین کو مرجعیت حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ وہ خلیفۃ المسلمینؑ کے مؤید ہوں۔

تابعین کے بعد تبع تابعین کا مرتبہ ہے۔

ان کے بعد علماء کرام ہیں جو انبیاء کے وارث ہیں اور انھیں حکام کے تعاون سے مرجعیت حاصل ہو جاتی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ اہلبیتؑ کی حیثیت بالکل ثانوی ہے اور اس سلسلۂ مرجعیت میں ان کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

مقابلہ کے اثرات

اکثریت کی توجیہات اور اس کا طرزِ عمل عمومی قناعت میں تبدیل ہو گیا اور سب کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ غلبہ ہی مرجعیت کی بنیاد ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حزبِ اختلاف ناقابلِ برداشت ہو گیا اور اس کا الگ کر دینا، اس پر سختی کرنا، اس کی توہین و تحقیر کرنا، اسے جماعت سے خارج قرار دینا اور اسے ایمانی راستہ سے منحرف سمجھنا مباح ہو گیا اور ہر طرف سے اسے بدنام کرنے کی مہم شروع ہو گئی یہاں تک کہ تشیع کا الزام کفر کے الزام سے بدتر ہو گیا اور خدا و رسول کا منکر اور مرتد تو قابلِ توبہ قرار پا گیا لیکن محبِ اہلبیتؑ کی توبہ بھی ناقابلِ قبول ہو گئی اور کافروں سے محبت آلِ محمدؐ سے محبت سے آسان ہو گئی۔ اور دھیرے دھیرے یہ نظریہ ایک میراث بن گیا جو اموال کی میراث کے ساتھ نسلوں میں منتقل ہوتا رہا۔

مجھے بھی یہ نظریہ اپنے بزرگوں سے میراث میں ملا ہے کہ شیعہ کافر ہیں۔

یہ علیؑ کو خدا مانتے ہیں۔

یہ صحابۂ کرام کو برا بھلا کہتے ہیں۔ . . .

اب مجھ سے یہ نظریہ میری اولاد کی طرف منتقل ہو گا اور کسی نے یہ زحمت نہ کی کہ خود شیعوں سے دریافت کرتا کہ ان مسائل میں ان کا نظریہ اور عقیدہ کیا ہے۔

یا اس اتہام کی حقیقت کہاں تک ہے۔

جب کہ کسی کے پاس تقلیدِ آباء کے علاوہ کوئی دلیل نہیں ہے اور تقلیدِ آباء کا تقاضا یہ ہے کہ شیعہ امتِ اسلامیہ کے دشمن قرار پائیں۔

حد ہو گئی کہ دورِ حاضر کے علماءِ اہلسنت جو کل یونیورسٹیوں میں مدرس ہوں گے۔ انھیں بھی یہ خبر نہیں ہے کہ تشیع کیا ہے۔

اور اس کا وجود کب اور کس طرح ہوا ہے۔

اور اگر کبھی شیعی نقطۂ نظر پیش بھی کرتے ہیں تو وہی جو اہلسنت نے شیعوں کے بارے میں کہا ہے۔

اور جس طرح اس کے دشمنوں نے ۱۴ صدیوں میں پروپیگنڈہ کیا ہے گویا کہ اس مسئلہ میں دشمن ہی راوی ہے اور وہی قاضی ہے۔

حالانکہ یہ اختلاف درحقیقت ایک سیاسی اختلاف ہے اور شیعوں نے اپنے تعلیمات اسلام کو اہلبیت رسولؐ سے حاصل کیا ہے اور اہلبیت رسول کا مسلک رسول اکرم کا مسلک ہے اور نجات پانے والا فرقہ وہی ہے جو ان حضرات سے ہدایت حاصل کرے۔

فصل ششم

وفاتِ پیغمبرؐ کے بعد مرجع کون؟

شیعہ نظریہ

۱۔ ضرورت مرجعیت:

یہ غلط ہے کہ رسول اکرمؐ نے امت کو بلا والی و وارث چھوڑ دیا ہے اور کسی مرجع کی تعیین نہیں کی ہے۔ ولایت و مرجعیت وہ بُنیادی امور ہیں جن سے امت بے نیاز نہیں ہوسکتی ہے اور امت کا بلا والی و وارث چھوڑ دینا کمال دین اور تمام نعمت کے خلاف ہے اور اس دعویٰ سے بھی متناقض ہے کہ قرآن مجید میں "ہر شے" کا بیان موجود ہے۔ گویا کہ بول و براز ایک شے ہے اور اس کا حکم سرکار نے بیان کر دیا ہے اور ولایت و مرجعیت کوئی شے ہی نہیں ہے کہ اس کے بارے میں کوئی بیان صادر کیا جائے۔

یہ بات رسول اسلامؐ کی اس مرحمت و مہربانی کے بھی خلاف ہے جس کا صریحی تذکرہ قرآن مجید میں موجود ہے۔

اللہ نے ان کے قلب اقدس میں امت کی محبت ودیعت فرمائی ہے لہٰذا ان کا فرض ہے کہ یہ واضح فرمائیں کہ ان کے بعد دینی اور دنیاوی وظائف کا ذمہ دار کون ہوگا۔

قرآن کا بیان کس کے ذمہ ہوگا۔

شریعت کے دائرہ کی تحدید کون کرے گا اور امت کا سفینۂ نجات کون ہوگا اور کون انھیں ہدایت کے راستہ پر لے کر چلے گا۔

کون امانِ امت ہوگا۔

یہ مسائل طب، ہندسہ اور علم ذرّہ کی طرح اختصاص کے طلبگار ہیں اور اختصاص

کا حتمی اور یقینی طور پر جاننے والا پروردگار کے علاوہ کوئی نہیں ہے لہذا عقلاً اور شرعاً محال ہے کہ پروردگار ان معاملات کو لوگوں کے خواہشات کے حوالے کر دے۔

پھر یہ مسائل دین کے ضروریات اور دعوت و دولت وامت کے بنیادی لوازم میں شامل ہیں جس کی بہترین دلیل یہ ہے کہ جن افراد نے رسول اکرمؐ کی طرف سے مرجعیت کی تعیین سے انکار کیا ہے انھوں نے بھی مرجع کی تعیین کی ہے اور اسکی ضرورت کا احساس کیا ہے اور یہ مرجعیت غلبہ کے ساتھ مستقر ہو گئی ہے جب کہ اس راہ میں لاکھوں افراد امت اسلامیہ تلواروں کے گھاٹ اتار دیئے گئے تاکہ غلبہ ثابت کیا جاسکے اور امت کو بزور طاقت اپنے پرچم کے نیچے جمع کیا جاسکے۔

ایسی صورت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ رسول اکرمؐ ایسے اہم امر کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں اور امت کو حالات و خواہشات کے حوالے کر دیں۔

ب۔ مرجعیت کا خدائی اعلان

پروردگار عالم نے قرآن مجید کو افراد بشر کے لئے ایک الٰہی پیغام بنا کر نازل کیا ہے اور اسے ایک ایسا خدائی نظام قرار دیا ہے جو ہر شے کی حرکت کے لئے یقینی تصور پیش کرے اور دین و دنیا کے امور کی تنظیم کرے اور دنیا و آخرت کی زندگی میں بنیادی رابطہ قائم کر سکے۔

اس کتاب کی ایک بنیادی ضرورت کے تحت اسے رسول اکرمؐ پر نازل کیا گیا تاکہ آپ اس کے مطالب کی علمی اور عملی توضیح کریں اور دولت و دعوت دونوں محاذوں پر اس کی تطبیق کرسکیں۔

چنانچہ حضرت رسول اکرمؐ بیان عقیدہ کے مرجع اول تھے۔ آپ اس کے احکام کے اعلم و افہم اور قیادت امت کے لئے انسب تھے۔ دنیا میں کوئی شخص آپ کی زندگی میں اس جگہ پر نہیں آسکتا تھا اور نہ کوئی آپ کی کمی کو پورا کر سکتا تھا۔ آپ کا تقرر پروردگار نے کیا تھا اور اس کے علاوہ حتمی طور پر اس اعلمیت و افضلیت و انسبیت کا جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ اس نے اختیار مرجع کا کام اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور رسول اکرمؐ کے

حق میں شہادت دی ہے کہ یہ اعلم و افضل وانسب ہیں۔ ان میں بیان عقیدہ کی صلاحیت بھی پائی جاتی ہے اور یہ مرجعیت دین اور ولایت امت کو جمع بھی کر سکتے ہیں۔

امت نے اس مرجعیت اور خدائی ولایت کو قبول کر لیا اور رضا و رغبت سے آپ کی بیعت کر لی تو آپ کی حیثیت ایک مرجع اور ولی امر کی تسلیم ہو گئی۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس دعوت کو قیامت تک باقی رہنا ہے اور اس کی حمایت کے لئے ایمانی حکومت بھی ضروری ہے۔ مقصد ہدایت بشر ہے اور مرسل اعظمؐ بھی بشر ہونے کی بنیاد پر دنیا سے جانے والے ہیں اور حتمی اور یقینی طور پر آپ کے جانشین کی صلاحیت کو پروردگار کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے لہٰذا اس نے آپ کے بعد کے لئے مرجع اور ولی کی تعیین کر دی۔

اب اگر امت تسلیم کر لے گی تو ہدایت یافتہ کہی جائے گی ورنہ ولایت اور مرجعیت میں فاصلہ ہو جائے گا اور حاکم کوئی دوسرا ہو گا اور مرجع کوئی دوسرا۔۔۔ اور اس طرح دھیرے دھیرے حاکم مرجع پر غالب آجائے گا جیسا کہ تاریخ میں ہوا کہ امام حسینؑ بن علیؑ نص رسولؐ سے امام، ولی اور مرجع مسلمین اور قائد امت تھے۔ لیکن امت نے رغبت یا خوف سے یزید کی بیعت کر لی اور یزید حاکم بن گیا اور امام حسینؑ صرف مرجع احکام رہ گئے جب کہ آپ ہی کو مرجع بھی ہونا چاہیئے تھا اور حاکم بھی۔ لیکن امت نے دونوں مراتب میں فاصلہ پیدا کر کے یزید کو حاکم مطلق بنا دیا۔

اب چونکہ مرجعیت حکومت کی تابع بن چکی ہے لہٰذا حاکم کو اس وقت تک سکون نہیں مل سکتا ہے جب تک مرجع کو امتیازات مرجعیت سے الگ نہ کر دے تاکہ اسکے لئے میدان صاف ہو جائے اور "مرجعیت و ولایت دونوں کا مالک ہو جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یزید نے اپنے لئے راستہ ہموار کرنے کے واسطے امام حسینؑ کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

مذہب شیعہ کا عقیدہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا مستقبل اور ان کی وحدت اس بات پر موقوف ہے کہ مرجعیت اور ولایت ایک ہی شخص کے پاس ہو اور وہ شخص مرجع مسلمین ہو اور اس کا تقرر پروردگار کی طرف سے ہوا ہو۔

مرجع یا امام یا ولی کے تعین کا حق صرف پروردگار کو ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اعلم

دانفل دانسب کا یقینی طور پر جاننے والا نہیں ہے۔ اسی نے اس امت کے لئے مرسل اعظمؐ کے انتقال سے پہلے مرجع کا انتخاب کیا ہے اور پیغمبرؐ کو حکم دیا ہے کہ حجۃ الوداع سے واپسی پر ایک لاکھ سے زیادہ انسانوں کے درمیان اس کا اعلان کردیں اور رسول اکرمؐ کی طرف سے یہ اعلان برابر ہوتا رہا ہے لیکن اس کے باوجود امت نے اس ولی و مرجع کو چھوڑ کر دوسرے شخص کی بیعت کرلی اور اس طرح مرجعیت اور حکومت کے درمیان فاصلہ پیدا ہوگیا اور ہر دور کا حاکم مرجع اسلام کو حکومت سے الگ کرتا رہا اور نتیجہ میں خود ہی دونوں مناصب کا حامل ہوگیا۔

خدا کا مقرر کردہ ولی و مرجع؟

شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ ولی و مرجع حضرت علیؑ بن ابی طالب ہیں جنھیں خدا نے رسول اکرمؐ کی نیابت اور امت کی قیادت کے منتخب کیا ہے اور رسول اکرمؐ کو اس کے اعلان کا حکم بھی دیا ہے۔ جس کا اظہار ایک لاکھ کے مجمع میں ہوا اور پھر حکم خدا سے امام حسنؑ کی امامت کا اعلان ہوا۔ پھر امام حسینؑ کی امامت کا اعلان ہوا اور اسی طریقہ سے منظم طور پر ہر مرجع اپنے بعد والے مرجع کا تعارف کراتا رہا یہانتک کہ بارہ امام مکمل ہوگئے اور بارہویں امام حضرت مہدی منتظر ہیں جو ایران کی اسلامی جمہوریہ کے دستور کی دفعہ ۵ کے مطابق حاکم شرعی ہیں اور قائد امت انکی نیابت میں کام انجام دے رہا ہے یہانتک کہ پروردگار انھیں منظر عام پر لے آئے تو وہ خود امامت و قیادت کے فرائض انجام دیں گے۔

یہ ایک طرح کا اصول بن گیا ہے کہ ہر دور میں اہلبیتؑ کا سربراہ ہی امت کا مرجع اور حاکم الٰہی رہا ہے اور چونکہ اہلبیتؑ کا سلسلہ قیامت تک باقی رہنے والا ہے لہٰذا یہ قیادت بھی اسی خاندان میں رہے گی اور دنیا کے سارے حکام ظلم و جور جس نسل کا خاتمہ نہیں کرسکے ہیں اس کا خاتمہ نہیں کرسکیں گے۔

اہلسنّت کا شیعوں سے اختلاف؟

اگر شیعہ اپنے عقیدہ میں حق بجانب ہیں تو اہلسنت ان کے دشمن کیوں ہیں؟

بات یہ ہے کہ اہلسنت اپنے قدموں کے نیچے سے زمین سرکتے دیکھ رہے ہیں اور
ان کا خیال ہے کہ اس طرح تمام حکام کا وجود اور ان کا اقتدار ختم ہو جائے گا اور حکام وقت
کے مخالفین ان کی جگہ پر قبضہ کر لیں گے۔

اب چونکہ عملی طور سے ہر دور میں حکومتی املاک پر حکام کا قبضہ رہا ہے اور وسائل ابلاغ
بھی انھیں کے ہاتھ میں رہے ہیں اور لشکر بھی انھیں کے احکام کی اطاعت کرتے رہے ہیں تو
اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ شیعہ تمام سرکاری انتقام کا مرکز بن گئے اور سب نے ان سے شدید بدلہ
لیا اور انھیں نافرمان۔ باغی۔ کافر اور شیاطین کی شکل میں امت کے سامنے پیش کیا گیا اور عوام
کی اکثریت کے سامنے حکام کے ساتھ چلنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا اور شیعوں کو اپنا
نقطۂ نظر پیش کرنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ لہٰذا حکام ہی نے ان کے عقائد و نظریات کو تحریف
و ترمیم کے ساتھ پیش کیا اور اس کے بعد نسلوں میں وہی افکار نقل ہونے لگے تاکہ ان کے خلاف
انتقامی جذبات بھی نسلوں میں منتقل ہوتے رہیں۔ اب حکام کے تصورات و خیالات ہی حقائق
ہیں اور شیعوں کے بارے میں ان کے بیانات ہی ساری امت اسلامیہ کا مدرک و ماخذ ہیں اس لئے
کہ ہر دور میں اور ہر طرف سے یہی نظریات و خیالات نقل کئے گئے ہیں۔

اہلسنت کا پروپیگنڈہ

اہلسنت مسلسل یہ پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ شیعوں کی بات نہ سنو۔ یہ امت کے
دشمن اور جماعت میں تفرقہ ڈالنے والے ہیں۔

لیکن شیعوں کا کہنا یہ ہے کہ تشیع ہی اسلام کی اصل ہے اور تسنن تو اُس سال پیدا ہوا ہے
جس سال طاقت نے قانون پر فتح حاصل کی اور معاویہ نے اس کا نام 'عام الجماعہ' رکھ دیا جس سے
اہلسنت نے اپنا نام اخذ کر لیا۔

اہلسنت درحقیقت اہل سنت رسولؐ نہیں ہیں ورنہ شیعوں سے زیادہ قول و فعل
و تقریر رسول اکرمؐ کا دلدادہ کون ہے۔

یہ اہلِ سنتِ معاویہ ہیں جس کا اندازہ ہر اس شخص کو ہو سکتا ہے جو اندھی تقلید ترک کر دے اور تحقیق کا کام شروع کرے۔

میرا خیال یہ ہے کہ یہ کام ہر شخص کو کرنا چاہیئے کہ اگر یہ دعویٰ صحیح ثابت ہو جائے تو شیعوں کی ملامت نہ کرے اور غلط ثابت ہو جائے تو سب باطل کو نظر انداز کر دیں کہ باطل تو بہر حال فنا ہونے والا ہے۔

ہم اس مقام پر طالبانِ حقیقت کی تسکین خاطر کے لئے اپنے بیان کی قطعی اور یقینی دلیل کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

دو مرجعیتیں

شیعوں کے نزدیک وفات پیغمبرؐ کے بعد اسلام میں دو طرح کی مرجعیتوں کا وجود تھا:

۱۔ انفرادی مرجعیت۔ جو اہلبیتؑ کے سربراہ حضرت علی علیہ السلام کو حاصل تھی اور یہ مرجعیت اہلسنت کی فردِ حاکم کے بالمقابل تھی۔

۲۔ اجتماعی مرجعیت۔ جو تمام عترت و اہلبیت پیغمبرِ اسلامؐ کو حاصل تھی اور یہ سب اس سربراہ کے مددگار اور دین کو اس کے مستحکم اصولوں کے ساتھ باقی رکھنے میں معاون تھے۔

تعیین بدست پروردگار

ان دونوں مراجع کا تقرر پروردگار کی طرف سے ہوا تھا اور اسی نے مختلف اوقات میں پیغمبرؐ کو حکم دیا تھا کہ اس مرجعیت کا اعلان کر دیں اور ان مراجع کا تعارف کرا دیں۔

مرجعیتِ انفرادی کی دلیل

اس امر کے مختلف دلائل ہیں کہ پروردگار عالم نے سربراہ خانوادۂ عترت حضرت علیؑ کو امت اسلامیہ کا مرجع مقرر فرما دیا تھا۔

اوّل۔ آیت ولایت (سورۂ مائدہ)

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی ہے جب حضرت علیؑ نے حالت رکوع میں اپنی انگوٹھی سائل کو دی تھی اور اس کی تفصیل تفسیر ثعلبی کے مطابق یہ ہے کہ اس منظر کو دیکھ کر رسول اکرمؐ نے وہی دعا کی تھی جو جناب موسیٰؑ نے ہارونؑ کے حق میں کی تھی کہ "خدایا میرے اہل میں سے علیؑ کو میرا وزیر بنادے اور اس کے ذریعہ میری پشت کو مضبوط بنادے"۔ اور ابوذر کے بیان کے مطابق ابھی دعا تمام نہ ہوئی تھی کہ جبریل آیت ولایت لے کر نازل ہو گئے کہ "تمہارے ولی اللہ، اس کا رسولؐ اور وہ صاحبان ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں۔ اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں"۔

علامہ قوشجی نے شرح تجرید میں اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ اس آیت کے حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہونے پر مفسرین کا اجماع ہے۔ (دیگر حوالہ جات کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر امام ابو اسحاق احمد بن محمد بن ابراہیم نیشاپوری ثعلبی، شواہد التنزیل حسکانی ص ۱۶۱، مناقب ابن مغازلی ص ۳۱۱، کفایۃ الطالب گنجی شافعی ص ۲۲۸۔ ۲۵۰، ذخائر العقبیٰ محب الدین طبری ص ۸۸۔ ۱۰۲، مناقب خوارزمی حنفی ص ۱۸۷، تاریخ ابن عساکر دمشقی شافعی ۲/۴۰۹، الفصول المہمہ لابن صباغ المالکی ص ۱۰۸۔ ۱۲۳، درمنثور سیوطی ۲/۲۹۳، فتح القدیر شوکانی ۲/۵۳، التسہیل لعلوم التنزیل کلبی ص ۱۸۱، کشاف زمخشری ۱/۶۴۹، تفسیر طبری ۶/۲۸۸، ۲۸۹، زاد المسیر فی علم التفسیر ابن جوزی حنبلی ۲/۳۸۳، تفسیر قرطبی ۶/۲۱۶، التفسیر المنیر لمعالم التنزیل للجاوی ۱/۲۱۰، فتح البیان فی مقاصد القرآن ۳/۵۱، اسباب النزول واحدی ص ۱۴۸، اللباب المنقول سیوطی برحاشیہ جلالین ص ۲۱۳، تذکرۃ الخواص سبط جوزی حنفی ص ۱۸۔ ۲۰۸، تفسیر رازی ۱۲/۲۶: ۲۰، تفسیر ابن کثیر ۲/۷۱، وغیرہ جیسے دیگر ۳۶ مصادر جن کا ذکر نہیں کیا جاسکا ہے۔)

۲۔ آیت بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (مائدہ)

مرسل اعظمؐ نے عملی طور پر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو اس وقت مرجع اور خلیفہ مقرر کیا جب آپ کے سامنے ایک لاکھ مسلمانوں کا مجمع تھا جمعرات کے دن میدان غدیر میں دن کے پانچ گھنٹے گذر چکے تھے جب جبریل امینؑ

آیت بَلِّغ مَآ اُنزِلَ اِلَیکَ مِن رَّبِّکَ[1] لے کر نازل ہوئے اور آپ نے مولائیت علیؑ کا اعلان کر دیا اور پروردگار نے آیت اکملت لکم دینکم[2] نازل فرمائی۔

پیغمبر اسلامؐ کے علیؑ کو خلیفہ و مرجع امت نامزد کرنے کے بعد عمر بن الخطاب آگے بڑھے اور انھوں نے اس طرح مبارکباد پیش کی" یا ابن ابی طالب مبارک ہو، آپ ہمارے اور تمام مسلمانوں کے مولا ہو گئے"۔ (تاریخ ابن عساکر ۲/ ۷۵، مناقب ابن مغازلی ص ۱۸، مناقب خوارزمی ص ۹۴، تاریخ بغداد ۸/ ۲۹۰، شواہد التنزیل ۱/ ۱۵۸-۲۱۳، سر العالمین ابو حامد الغزالی ص ۲۱، احقاق الحق ۶/ ۲۵۶، الغدیر ۱/ ۱۳۲، فرائد السمطین ۱/ ۷۷)۔

دور قدیم میں روز غدیر مسلمانوں کے درمیان ایک عید کا دن شمار ہوتا تھا جیسا کہ علامہ امینی طاب ثراہ نے الغدیر ۱/ ۲۶۷ پر الآثار الباقیہ فی القرون الخالیہ بیرونی ص ۳۳۴ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور اس کا تذکرہ مطالب السئول ابن طلحہ شافعی ۱/ ۴۴، وفیات الاعیان ابن خلکان ۱/ ۶۰ در حالات مستعلی بن مستنصر میں بھی پایا جاتا ہے۔

علماء اہلسنت کے نقل کے مطابق حدیث غدیر تواتر کا درجہ رکھتی ہے اور اس موضوع پر مختلف کتابیں تالیف کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر کتاب الولایۃ ابن جریر طبری،

---

[1] آیت بلّغ ما انزل کے بارے میں ملاحظہ ہو تاریخ ابن عساکر حالات حضرت علی ۲/ ۸۶، فتح البیان علامہ صدیق حسن خاں ۳/ ۶۳، شواہد التنزیل لقواعد التفضیل ۱/ ۱۸۷، اسباب النزول واحدی ص ۱۱۵، در منثور ۲/ ۲۹۸، فتح القدیر شوکانی ۲/ ۶۰، تفسیر فخر رازی ۱۲/ ۵۰، مطالب السئول ابن طلحہ شافعی ۱/ ۴۴، فصول مہمہ ابن صباغ مالکی ص ۲۵، ینابیع المودۃ ص ۱۲۰، ۲۴۹، الملل والنحل شہرستانی شافعی ۱/ ۱۶۳، فرائد السمطین حموینی ۱/ ۱۵۸، عمدۃ القاری شرح البخاری بدر الدین حنفی ۸/ ۵۸، مودۃ القربیٰ ہمدانی، روح المعانی آلوسی ۲/ ۳۴۸، تفسیر المنار محمد عبدہ ۶/ ۴۶۳۔

[2] ملاحظہ ہو تاریخ ابن عساکر ۲/ ۷۵، مناقب ابن مغازلی ص ۱۹، شواہد التنزیل ۱/ ۱۵۷، تاریخ بغداد ۸/ ۲۹۰، در منثور ۲/ ۲۹، اتقان ۱/ ۳۱، مناقب خوارزمی حنفی ۱/ ۴۷، ینابیع المودۃ ص ۱۱۵، فرائد السمطین ۱/ ۲/ ۷۴، تاریخ الیعقوبی ۲/ ۵۳، کتاب الولایۃ ابن جریر طبری، روح المعانی آلوسی ۶/ ۵۵، البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر ۵/ ۲۱۳۔

کتاب الولایۃ ابو العباس بن احمد بن عقدہ المتوفی ۳۳۳ھ، کتاب ابو بکر جعابی متوفی ۳۵۵ھ دار قطنی متوفی ۳۸۵ھ، کتاب الدرایۃ فی حدیث الولایۃ ابو سعد سجستانی متوفی ۴۷۷ھ، کتاب دعاۃ الہداۃ الیٰ اداء حق الموالاۃ ابو القاسم عبید اللہ حنفی متوفی ۴۹۰ھ۔

اس حدیث غدیر کو صحابہ کرام میں ۱۱۶۔ افراد نے اور تابعین میں سے ۸۴ افراد نے روایت کیا ہے اور اس کے علاوہ تمام علماء اہلسنت نے اختلاف مذاہب وطبقات کے باوجود دوسری صدی ہجری سے ۱۴ ویں صدی ہجری تک نقل کیا ہے جن کی تعداد علامہ امینی کے بیان کے مطابق ۳۶۰ ہوتی ہے پھر ان تمام بیانات کے مقابلہ میں صرف ایک عمر بن الخطاب کی مبارکباد ہی کافی ہے کہ انھوں نے مولائیت کا اقرار کیا ہے اور اس کی مبارکباد پیش کی ہے۔

اعلان غدیر کا ایک نمونہ

طبرانی معجم کبیر۔ حذیفہ نے اسید الغفاری کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ جب رسول اکرمؐ حجۃ الوداع سے واپس چلے تو فرمایا کہ بطحاء کی جھاڑیوں کے قریب نزول نہ کرنا اور اس کے بعد کانٹوں کی صفائی کا حکم دیا اور نماز ادا فرمائی۔ نماز کے بعد خطبہ ارشاد فرمایا " ایہا الناس! مجھے لطیف وخبیر نے خبر دی ہے کہ ہر نبی کی زندگی سابق نبی سے نصف ہوتی ہے اور قریب ہے کہ میرے پاس داعیٔ الٰہی آجائے اور مجھے اس کی بارگاہ میں حاضر ہونا پڑے۔ میرے اوپر بھی ذمہ داری ہے اور تم بھی مسئول ہو تو اب تمھارا کہنا کیا ہے؟"

لوگوں نے کہا کہ "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے تبلیغ فرمائی۔ زحمت برداشت کی اور نصیحت فرمائی اللہ آپ کو جزائے خیر دے"۔

آپؐ نے فرمایا کہ "کیا تم لوگ خدا کی وحدانیت، محمدؐ کی عبدیت ورسالت، جنت، جہنم، موت، حشر اور قیامت کی گواہی نہیں دیتے ہو۔؟"

سب نے کہا "بے شک ہم گواہی دیتے ہیں"۔

فرمایا۔ خدایا گواہ رہنا۔

اس کے بعد فرمایا " ایہا الناس! اللہ میرا مولا ہے اور میں مومنین کا مولا ہوں اور

ان کے نفوس سے اولیٰ ہوں اور جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علی بھی مولا ہے۔ خدایا! جو اسے دوست رکھے اسے دوست رکھنا اور جو اس سے دشمنی کرے اسے دشمن قرار دینا۔" (تاریخ دمشق ۲/۵۰۰، ۵۰، مناقب خوارزمی ص ۹۴، مسند امام احمد بن حنبل ۴/۲۸۱، فصول مہمہ ص ۲۴، الحاوی ۱/۱۲۲، ذخائر العقبیٰ ص ۶۷، فضائل الخمسہ ۱/۳۵۰، تاریخ الاسلام ذہبی ۲/۱۹۷، علم الکتاب خواجہ حنفی ص ۱۶۱، نظم درر السمطین زرندی ص ۱۰۹، ینابیع المودۃ ص ۳۰، تفسیر رازی ۲/۶۳، تذکرۃ الخواص ص ۲۹، مشکوٰۃ المصابیح ۳/۲۴۶، عبقات الانوار ۱/۲۰۵، فرائد السمطین حموینی ۱/۷۷، المراجعات تحقیق السید حسین راضی ۲/۱۷۷)۔

اس کے بعد فرمایا:

"ایہا الناس! میں آگے آگے جا رہا ہوں۔ تم عنقریب میرے پاس حوض کوثر پر وارد ہو گے جس کی وسعت تا حدِ نظر ہے اور اس میں بے شمار چاندی کے پیالے پائے جاتے ہیں۔ میں وہاں تم سے سوال کروں گا کہ ثقلین کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ لہٰذا تم اس امر کا خیال رکھنا کہ ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے۔ ان میں ایک ثقل اکبر کتاب خدا ہے جس کا ایک سرا خدا کے ہاتھ میں ہے اور ایک تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اس سے وابستہ رہنا اور نہ گمراہ ہونا اور نہ اس میں تبدیلی پیدا کرنا۔ دوسرے میری عترت اور میرے اہلبیتؑ ہیں۔ خدائے لطیف و خبیر نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دونوں ہرگز جدا نہ ہوں گے جب تک حوض کوثر پر وارد نہ ہو جائیں۔ (صواعق محرقہ ص ۲۵، مجمع الزوائد ہیثمی ۶/۱۶۴، تاریخ دمشق ۲/۵۴ حدیث ۵۴۵، کنز العمال ۱/۱۶۸ حدیث ۹۵۹، الغدیر ۱/۲۶۔۲۷، طبقات الانوار حدیث ثقلین، نوادر الاحوال حکیم ترمذی ص ۲۸۹، ینابیع المودۃ قندوزی ص ۳۷)۔

تاکید ولایت علیؑ

رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ سے خطاب کر کے فرمایا کہ "تم دنیا و آخرت میں میرے ولی ہو۔"[1]

---

[1] ذہبی نے تلخیص المستدرک ص ۲۶ پر اس حدیث کے صحیح ہونے کا اقرار کیا ہے۔ ابن حجر نے صواعق

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"تم میرے بعد ہر مومن کے ولی ہو"۔ "جس کا میں ولی ہوں اس کا یہ علیؑ ولی ہے"۔ "علیؑ میرے بعد تمہارا ولی ہے"۔ "جس کا میں ولی ہوں اُس کا علیؑ بھی ولی ہے"۔ "جس کا میں مولا ہوں اُس کا یہ علیؑ مولا ہے"۔ "تم میرے بعد تمام مومنین کے ولی ہو"[1]۔

حدیث منزلت نے بھی اس ولایت کی مزید تاکید کر دی ہے جس میں یہ اعلان ہوا ہے کہ "یا علیؑ! تمہاری منزلت[2] میرے لئے وہی ہے جو موسیٰؑ کے لئے ہارونؑ کی منزل تھی۔ صرف میرے بعد نبی نہ ہوگا"۔ اور یہ حدیث صحیح ترین آثار میں شامل ہے جسے اصحاب سنن نے نقل کیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

میں باب ۱۲ ص ۱۶۱ پر نقل کیا ہے۔ مسلم نے فضائل علیؑ ۲/ ۲۴ پر نقل کیا ہے، حاکم نے مستدرک ۳/ ۱۰۹ پر نقل کیا ہے۔ ابن حجر نے باب ۱۱ ص ۱۰۷ پر نقل کیا ہے کہ امام احمد نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ صاحب الجمع بین الصحیحین نے فضائل علیؑ اور غزوۂ تبوک کے ذیل میں نقل کیا ہے۔ صحیح بخاری ۲/ ۵۸، صحیح مسلم ۲/ ۳۲۳، مسند احمد ۲/ ۱۰۹، کنز العمال ۶/ ۱۵۲، استیعاب ابن عبد البر احوال علیؑ، ترمذی حدیث ۲۵۰۴۔

[1] خصائص نسائی، مسند احمد بن حنبل ۴/ ۴۳۸، مستدرک حاکم ۳/ ۱۱۱، تلخیص مستدرک ذہبی، المراجعات ص ۱۶۳-۱۶۴۔

[2] بخاری ۵/ ۱۲۹، مسلم ۲/ ۳۶۰، مسند احمد بن حنبل ۳/ ۵۰ حدیث ۱۴۹۰، ۵/ ۵۶، ۵۷، ۶۶، سنن ابن ماجہ ۱/ ۴۲، مستدرک حاکم ۳/ ۱۰۹، تاریخ طبری ۳/ ۱۰۴، تاریخ ابن عساکر حدیث ۳۰-۲۵-۱۴۸-۱۴۹-۱۵۰، انساب الاشراف ۲/ ۱۰۶، اصابہ ۲/ ۵۰۷-۵۰۹، استیعاب بر حاشیہ اصابہ ۳/ ۳۴-۳۵، خصائص نسائی ص ۷۶-۷۷-۷۸، مناقب ابن مغازلی، حلیۃ الاولیاء ۷/ ۱۹۴، مناقب خوارزمی ص ۶۰، تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۱۶۸، ینابیع المودۃ ص ۳۵، اسد الغابہ ۲/ ۸، نظم درر السمطین ص ۹۵، کفایۃ الطالب ص ۲۸۱، شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ۲/ ۴۹۵، معجم صغیر طبرانی ۲/ ۲۲-۵۴، مجمع الزوائد ۹/ ۱۰۹، کنز العمال ۵/ ۱۳۹، العقد الفرید ابن عبد ربہ ۴/ ۳۱۱، جامع الاخوۃ ابن اثیر ۹/ ۴۶۸، مشکوٰۃ المصابیح ۳/ ۲۴۲، جامع صغیر سیوطی ۲/ ۵۶، ....

ہدایت بعد از پیغمبرؐ

رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ "میں ڈرانے والا ہوں اور علیؑ ہادی ہیں۔ یا علیؑ! تمہارے ہی ذریعہ لوگ ہدایت حاصل کریں گے"۔ (تاریخ دمشق ۲/ ۴۱۷، فصول مہمہ ص ۱۰۷، نظم درر السمطین ص ۹۰، ینابیع المودۃ ص ۹۹، نور الابصار ص ۷۱، شواہد التنزیل ۱/ ۲۹۳، کفایۃ الطالب ص ۲۳۳، احقاق الحق ۴/ ۳۰۱، فضائل الخمسہ ۱/ ۲۶۶، در منثور ۴/ ۴۵، زاد المسیر ابن الجوزی ۴/ ۳۰۷، روح المعانی آلوسی ۱۳/ ۹۷، تفسیر شوکانی ۳/ ۷۰، تفسیر طبری ۱۳/ ۱۰۸، تفسیر ابن کثیر ۲/ ۵۰۲)۔

حُجّت بعد از پیغمبرؐ

حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے:۔ "میں اور علیؑ روزِ قیامت امت پر حُجّتِ خدا ہوں گے" (مناقب ابن مغازلی ص ۴۵ حدیث نمبر ۶۷، تاریخ دمشق ۲/ ۲۷۳ حدیث نمبر ۷۹۳-۷۹۵، ینابیع المودۃ ص ۲۳۹، کنوز الحقائق مناوی ص ۴۳، میزان ذہبی ۴/ ۱۲۸، منتخب کنز العمال ۵/ ۳۴)۔

آپؐ نے فرمایا کہ "علیؑ میرے علم کا دروازہ اور میرے بعد میری رسالت کا بیان کرنے والا ہے۔ اس کی محبت ایمان ہے اور اس کی عداوت نفاق"۔

"میں شہر علم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے"۔

خود حضرت علیؑ سے خطاب کر کے فرمایا کہ "تم میرے بعد امت کے تمام اختلافات کی وضاحت کرنے والے ہو"۔ (تاریخ دمشق ۲/ ۴۸۸، حدیث نمبر ۱۰۰۸، مقتل الحسینؑ خوارزمی ۱/ ۸۶، مناقب خوارزمی ص ۲۳۶، کنوز الحقائق مناوی ص ۱۸۲، منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ص ۳۳)۔

یہ تمام روایات اس بات کی دلیل ہیں کہ رسول اکرمؐ نے اپنے بعد مرجع کی تعیین کر دی تھی اور مرجع علیؑ بن ابی طالب کی ذات گرامی تھی جس کے بارے میں ہم سیاسی قیادت

کے ذیل میں باب چہارم میں مزید دقّتِ نظر اور باریک بینی کے ساتھ بحث کریں گے۔

اہلِ تشیع میں اجتماعی مرجعیت

اہلِ تشیع پیغمبر اسلامؐ اور ان کے اہلبیتؑ طاہرین کو اپنا اجتماعی قائد تسلیم کرتے ہیں اس لئے کہ ان کے اسلام پر احسانات ہیں اور انھیں پروردگار عالم نے افضل بنایا ہے۔

انھیں کو مباہلہ کے میدان میں ابناء و نساء و انفس قرار دے کر اعلان فرمایا ہے کہ "تم اپنے بچوں کو لاؤ ہم اپنے بچوں کو لاتے ہیں۔ تم اپنی عورتوں کو لاؤ ہم اپنی عورتوں کو لاتے ہیں۔ تم اپنے نفسوں کو لاؤ ہم اپنے نفسوں کو لاتے ہیں۔ اس کے بعد مباہلہ کر کے جھوٹوں پر اللہ کی لعنت قرار دیں"۔

(صحیح مسلم کتاب الفضائل ۲/۳۶۰، ۷/۱۲۰ شرح النووی، صحیح ترمذی ۴/۲۹۳، شواہد التنزیل ۱/۱۲۰ - ۱۲۹، مستدرک ۳/۱۵۰، معرفۃ علوم الحدیث للحاکم ص ۱۷، تلخیص المستدرک ذہبی، مناقب ابن مغازلی، تاریخ دمشق ۱/۲۱، تفسیر طبری ۴/۱۰۴، اسباب النزول واحدی ص ۵۹، احکام القرآن ابن العربی ۱/۲۷۵، فتح القدیر شوکانی ۱/۳۴۷، تفسیر رازی ۲/۶۹۹، ملحق المراجعات السید حسین راضی ۹۰ حوالہ جات)۔

یہی وہ حبل اللہ ہیں جن سے تمسک ضروری ہے۔ (شواہد التنزیل ص ۱۳۰۔ حدیث ۱۷۷-۱۷۸-۱۷۹-۱۸۰، صواعق محرقہ ص ۱۸۹، ینابیع المودۃ ص ۱۳۹، ۲۳۸، اتحاف بحب الاشراف للشبراوی الشافعی ص ۷۶، روح المعانی آلوسی ۴/۱۶، نور الابصار ص ۱۰۲)۔

یہی وہ اہل ذکر ہیں جن کی طرف ہر مسئلہ میں رجوع ضروری ہے۔ (شواہد التنزیل ۱/۳۳۴، ینابیع المودۃ ص ۵۱، تفسیر قرطبی ۱۱/۲۷۲، تفسیر طبری ۱۴/۱۰۹، تفسیر ابن کثیر ۲/۵۷۰، روح المعانی ۱۴/۱۳۴، احقاق الحق ۳/۴۸۲)۔

یہی وہ محسود افراد ہیں جنھیں خدا نے اپنے فضل و کرم سے کتاب و حکمت اور ملک عظیم سب کچھ عنایت فرمایا ہے۔ (مناقب ابن مغازلی ص ۲۶۷ حدیث ۳۱۴، شواہد التنزیل ۱/۱۴۳، صواعق محرقہ ص ۱۵۰، نور الابصار ص ۱۰۲، اسعاف الراغبین للصبان الشافعی برحاشیہ نور الابصار ص ۱۰

اتحاف ص ۷۶، ورد الصادی ابو بکر الحضرمی ص ۳۷، الغدیر ۳/۶۱)۔

یہی وہ اقربا پیغمبرؐ ہیں جن کے لئے خمس واجب کیا گیا ہے۔ (در منثور ۴/۱۷۷، مجمع الزوائد ص ۹۴، تفسیر طبری ۵/۲/۷، ینابیع المودۃ ص ۴۹، شواہد التنزیل ۲/۲۳۸، تفسیر طبری ۱۰/۵، منتخب برحاشیہ مسند احمد ۱/۲۲۸، ینابیع المودۃ ص ۵۰)۔

یہی وہ طیب وطاہر افراد ہیں جنھیں ارادۂ الٰہی نے ہر رجس سے دور اور حق طہارت کی منزل پر رکھا ہے۔ (صحیح مسلم باب فضائل اہل البیتؑ ۲/۳۶۸، شرح نووی ۱۵/۱۹۴، شواہد التنزیل ۲/۳۳، مستدرک حاکم ۳/۱۴۷، تلخیص مستدرک ذہبی بذیل مستدرک، در منثور ۵/۱۹۸، فتح القدیر ۴/۲۷۹، النظام السیاسی فی الاسلام ص ۷۶)۔

یہی وہ حضرات ہیں جن کی مودت فریضہ اور اجر رسالت ہے۔ (شواہد التنزیل ۲/۱۳۰، مناقب ابن مغازلی ص ۳۰۷، ذخائر العقبیٰ ص ۲۵۔ ۱۳۸، صواعق محرقہ ص ۱۰۱۔ ۳۵، فصول مہمہ ص ۱۱، مقتل الحسینؑ خوارزمی ۱/۱۔ ۵۷، تفسیر طبری ۲۵/۲۵، مستدرک حاکم ۲/۱۷۲، اتحاف ص ۵۔ ۱۳، احیاء المیت سیوطی برحاشیہ اتحاف ص ۱۱۰، تلخیص مستدرک بذیل مستدرک ۲/۱۷۲، تفسیر کشاف ۳/۴۰۲، تفسیر قرطبی ۱۶/۲۲، فتح القدیر ۴/۵۳۷، حلیۃ الاولیاء ۳/۲۰۱)۔

یہی وہ قابل درود وسلام افراد ہیں جن پر نماز میں بھی صلوات واجب ہے۔ (الغدیر ۲/۳۰۲، صواعق محرقہ ص ۸۷، ۱۳۹، تفسیر رازی ۷/۳۹۱، ذخائر العقبیٰ ص ۱۹، مستدرک حاکم ۱/۲۶۹، فضائل الخمسہ من الصحاح الستہ ۱/۲۰۸، الانوار المحمدیۃ للنبہانی ص ۴۲۲، اتحاف ص ۲۹، نور الابصار ص ۱۰۵، السیرۃ النبویہ لزینی دحلانی برحاشیہ سیرت حلبیہ ۳/۳۳۲)۔

یہی وہ ثقل اصغر ہیں جو کتاب خدا کے ساتھ گمراہی سے بچانے کے لئے ضمانت ہیں۔ (صحیح ترمذی ۵/۳۲۸، کنز العمال ص ۱۵۳، تفسیر ابن کثیر ۴/۱۱۳، جامع الاصول ابن اثیر ۱/۱۸۷، معجم کبیر طبرانی ص ۱۳۷، مشکوۃ المصابیح ۳/۲۵۸، احیاء المیت برحاشیہ اتحاف ص ۱۱۴، الفتح الکبیر للنبہانی ۱/۵۰۳، صواعق محرقہ ص ۱۴۴۔ ۲۲۶، المعجم الصغیر للطبرانی ۱/۱۳۵، تفسیر خازن ۱/۱۵۴، التاج الجامع للاصول ۳/۳۰۸، خصائص نسائی ص ۲۱، صحیح مسلم ۲/۳۶۲)۔

یہی وہ متقدمین ہیں جو ساری امت کے پیشرو قرار دئے گئے ہیں۔ (صواعق محرقہ ص ۱۴۸۔۲۲۶، مجمع الزوائد ۹/۱۶۳، در منثور ۲/۶۰)

یہی وہ سفینۂ نجات ہیں جس سے وابستہ ہونے والے کے لئے نجات اور الگ رہ جانے والے کے لئے ہلاکت اور غرقابی ہے۔ (تلخیص المستدرک ذہبی، نظم درر السمطین ص ۲۳۵، ینابیع المودۃ ص ۳۰۔۳۷۰، صواعق محرقہ ص ۱۸۴۔۲۳۴، تاریخ الخلفاء سیوطی، اسعاف الراغبین ص ۱۰۵، فرائد السمطین ۲/۲۴۶، کفایۃ الطالب ص ۳۷۸، معجم صغیر طبرانی ۲/۲۲، احیاء المیت بر حاشیہ اتحاف ص ۱۱۳)

یہی وہ افراد ہیں جو امت کو ہر تفرقہ سے بچانے کے لئے وجہ امن وامان ہیں اور ان کا مخالف گروہ ابلیس میں ہے۔ (صواعق محرقہ ص ۹۱، احیاء المیت ص ۱۱۴، منتخب کنز العمال بر حاشیہ مسند احمد ۵/۹۳، ینابیع المودۃ ص ۲۹۸، جواہر البحار النبہانی ۱/۳۶۱)۔

یہی دراصل امان امت ہیں۔ (ذخائر العقبیٰ ص ۱۷، نظم درر السمطین ص ۲۳۴، احیاء المیت ص ۱۱۲، جامع صغیر سیوطی ۲/۱۶۱، الفتح الکبیر نبہانی ۳/۲۶۷، منتخب کنز العمال ۳/۲۶۷، صواعق محرقہ ص ۱۸۵، ۲۳۳، اسعاف الراغبین بر حاشیہ نور الابصار ص ۱۲۸)۔

انھیں کے بارے میں رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ ہر دور میں میری امت میں میرے اہلبیتؑ کے عادل افراد رہیں گے جو دین سے گمراہوں کی تحریف، اہل باطل کی رشتہ داری، اہل جہالت کی تاویلات کو دور کرتے رہیں گے۔ یاد رکھو کہ امام خدا کی بارگاہ میں لے جانے کا وسیلہ ہوتا ہے تو تم اس بات پر نظر رکھنا کہ تم نے کس کی امامت سے رشتہ قائم کیا ہے۔ (صواعق محرقہ ص ۱۴۸، ینابیع المودۃ ص ۲۲۶۔۲۳۶، ذخائر العقبیٰ ص ۱۷)۔

شرعی مرجعیت کے اتباع کا نتیجہ

شیعوں نے ہمیشہ پیغمبرؐ اور ان کے اہلبیتؑ سے محبت کی ہے اور برابر اسی راستہ پر قائم ہیں۔ ان کے عقیدہ میں ہر دور میں اہلبیتؑ کا سربراہ ہی امت کا امام اور قائد ہوتا ہے۔ پروردگار عالم نے اپنے دین کی حفاظت کے لئے انھیں حضرات کا انتخاب

کیا ہے اور انھیں کو خیر البریہ ہونے کی بشارت دی ہے اور جب آیت نازل ہوئی کہ ایمان اور عمل صالح والے افراد خیر البریہ ہیں تو حضورؐ نے علیؑ سے خطاب کر کے فرمایا کہ یہ تم اور تمھارے شیعہ ہیں۔ (شواہد التنزیل ۲/۳۰۶۔ ۳۰۷ حدیث نمبر ۱۱۲۵۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۸، کفایۃ الطالب ص ۲۴۴۔ ۲۴۵، مناقب خوارزمی ص ۶۲۔ ۱۸۷، فصول مہمہ ص ۱۰۷، نظم درر السمطین ص ۹۲، تاریخ دمشق ۲/۴۴۲، ینابیع المودۃ ص ۶۲، نور الابصار ص ۷۱۔ ۱۰۲، صواعق محرقہ ص ۹۶، در منثور ۶/۳۷۹، تفسیر طبری ۳/۱۴۶، تذکرۃ الخواص ص ۱۸، فتح القدیر ۵/۴۷۷، روح المعانی آلوسی ۳/۲۰۷، احقاق الحق ۳/۲۸۷، الغدیر ۲/۵۷، فضائل الخمسہ ۱/۲۷۸، غایۃ المرام باب ۲۸ ص ۳۲۸، فرائد السمطین ۱/۱۵۶)۔

قیادت وسیاست

فصل اوّل

سیاسی قیادت

۱۔ قوانین حرکت اجتماع

دنیا کا ہر معاشرہ دو بنیادی قوانین کے تحت حرکت کرتا ہے اور اسلامی معاشرہ بھی ایک معاشرہ ہونے کے اعتبار سے اس قانون فطرت سے الگ نہیں ہو سکتا ہے لہٰذا اس کے بھی دو محرکات ہوں گے :

۱۔ عقیدہ یا الٰہی حقوقی نظام جو اسلامی معاشرہ میں ایک نافذ العمل قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ عمومی اور تفصیلی منصوبہ کا مجموعہ ہے جو اسلامی معاشرہ کو تمام شعبہ ہائے حیات میں حال اور مستقبل دونوں کے اعتبار سے حرکت دیتا ہے۔ گویا کہ یہ ایک عظیم دوا خانہ ہے جس میں معاشرہ کے ہر مرض کی دوا موجود ہے اور یہ اپنے علاج کے اثرات اور نتائج کی ضمانت بھی دیتا ہے۔

یہ نظام اس انداز سے مرتب کیا گیا ہے کہ اس میں فرد، خاندان، سماج، حکومت اور پورے عالم اسلام کے مسائل کا حل موجود ہے اور یہ سماج کے باہمی تعلقات کو اس طرح منظم کرتا ہے کہ ان میں اتفاق و اتحاد، باہمی تعاون کی روح پیدا ہو جائے اور تمام مادی اور روحانی ضرورتوں کی تکمیل کی جا سکے۔

۲۔ سیاسی قیادت جو اسی عقیدہ سے پیدا ہوتی ہے اور اس کا کام حقوقی نظام کے زیر اثر معاشرہ کی حرکت کو زندہ رکھنا ہے گویا یہ ایک انجینیر ہے جس نے تمام تفصیلی اور عمومی خطوط کا مطالعہ کر لیا ہے یا ایک طبیب ہے جو مرض کی تشخیص بھی جانتا ہے اور اس کے مطابق دوائیں بھی تجویز کر سکتا ہے اور پھر منزل شفا تک مریض کے حالات کی نگرانی

بھی کرتا رہتا ہے۔

یہ قیادت احکام الٰہیہ کی تطبیق کی نگرانی کرتی رہتی ہے اور اس کے مقاصد سے مکمل طور پر باخبر ہوتی ہے۔ سارے معاشرہ میں فہم احکام کے اعتبار سے سب سے اعلم وافضل اور تطبیق احکام کے اعتبار سے سب سے اولیٰ اور انسب ہوتی ہے۔

الٰہی نظام کو بعینہٖ اسی طرح لوگوں کے حوالہ کرتی ہے جس طرح پروردگار سے حاصل کیا ہے اور نقل وتبلیغ کے بعد عالم تطبیق میں بھی نصوص کو حرکت کا درجہ دیتی ہے اور پھر علمی اور عملی ہر مرحلہ پر بیان احکام کی نگرانی کرتی رہتی ہے۔ مخلصین کے لئے مبشر کا درجہ رکھتی ہے اور معاندین کے لئے منذر ہوتی ہے۔ یہی اللہ کی طرف دعوت دینے والی اور یہی ظلمات زندگی میں سراج منیر ہے جس کا کام حرکت کے دوران سماج کے راستہ کو مسلسل روشن رکھنا ہے۔

۲۔ عقیدہ وقیادت کا مکمل ارتباط

اسلام کا عقیدہ الٰہیہ بنیادی طور پر دو ارکان پر قائم ہے:

۱۔ کتاب خدا جس کا نام قرآن کریم ہے۔

۲۔ اور نبی مرسل جس کا نام حضرت محمد مصطفیٰؐ ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰؐ اسلام کی وہ سیاسی قیادت ہے جسے مالک کائنات کی طرف سے دعوت کو دولت تک لے جانے کا فریضہ سپرد کیا گیا ہے اور حکومت کے قیام کے بعد اس کی قیادت کا حکم دیا گیا ہے۔

یہ عقیدہ کی دعوت اور دولت کی قیادت ایک دوسرے سے قابل انفکاک نہیں ہیں اور عقیدہ کے اصول میں سے ایک اصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ گویا کہ عقیدہ پر ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا ہے جب تک کہ قیادت پر ایمان نہ لایا جائے۔

حضرت طالوت کی سیادت وقیادت پر ایمان اس دور کے الٰہی عقیدہ ونظام پر ایمان کا ایک جزء لازمی تھا اور دونوں میں جدائی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ یہی حال

حضرت داؤد اور سلیمان کی حکومت و قیادت کا تھا۔

اس بنیادی ارتباط کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مالک کائنات نے عالم انسانیت کے کسی دور تاریخ میں کوئی پیغام بغیر رسول یا کوئی کتاب بغیر صاحب کتاب کے نازل نہیں کی ہے۔ ہمیشہ کتاب کو کسی بندہ پر نازل کیا ہے تاکہ وہ کتاب کے احکام کو واضح کرے اور پھر صاحبان ایمان کی اجتماعی قیادت کا فرض انجام دے۔

اگر عقیدہ و قیادت یا رسالت و رسول یا کتاب و حامل کتاب میں جدائی ممکن ہوتی تو مالک کائنات کے لئے بہت آسان تھا کہ ہر انسان بالغ کے گھر میں اپنی کتاب کا ایک نسخہ نازل کر دیتا اور اسے احکام کو سمجھنے کے بعد عمل کرنے کا حکم دے دیتا۔ نہ ہزاروں مرسلین کی ضرورت ہوتی اور نہ لاکھوں ہادیوں اور مصلحوں کی حاجت ہوتی۔

عقیدہ اور قیادت کی جدائی عقلی، منطقی، دینی اور فطری کسی اعتبار سے بھی ممکن نہیں ہے اور یہ بات حدود عقل سے بعید ہے کہ انسان قرآن مجید سے تمسک کرے اور قیادت سے غافل ہو جائے ۔ کہ اگر کوئی شخص کتاب خدا پر ایمان لانے کے بعد حضرت محمد مصطفےٰ کی قیادت سے انکار کر دے تو بحکم اجماع مسلمین صاحب ایمان نہیں ہے۔ ایمان کا لازمہ یہ ہے کہ عقیدہ کو بحیثیت قانون تسلیم کیا جائے اور پھر اسی میں ایمانی معاشرہ کو حرکت دی جائے۔

سیاسی قیادت ایک تاسیسی ڈھانچہ ہے جس کا کام عقیدہ کی وضاحت بھی ہے اور سماج کی قیادت بھی اور یہ دونوں فنی کام ہیں جن کے لئے الٰہی مہارت کی ضرورت ہے اور اس الہامی مہارت کے بغیر انسان نہ بیان احکام واقعی کا کام انجام دے سکتا ہے اور نہ معاشرہ کی قیادت و ریاست کا کام کر سکتا ہے۔

خواہشات اور اجتہادات کے لئے یہ کام مستحیلات میں سے ہے۔

اسلامی سیاسی قیادت کے امتیازات

امت اسلامیہ کے لئے پہلے ولی اور سیاسی قائد کا نام حضرت محمد مصطفےٰ ہے جو ایک نمونہ اور قیادت کا مثالیہ تھے اور ان کے بعد ہر قیادت سنبھالنے والے نے انھیں کی خلافت

اور جانشینی کا راستہ اختیار کیا ہے لہٰذا آپ کے ان امتیازات کا جائزہ لینا ضروری ہے جن کی بنا پر آپ ولی اور قائد امت تھے۔

آپ کا پہلا امتیاز یہ تھا کہ آپ تمام دنیا میں سب سے زیادہ عقیدہ الٰہیہ اور احکام اسلام کے جاننے والے تھے، تمام موجودین سے افضل اور ولایت و قیادت کے لئے سب سے زیادہ موزوں تر تھے اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ کو مالک کائنات نے معین کیا تھا اور قیادت و مرجعیت دونوں کا اہل قرار دیا تھا لہٰذا کوئی شخص بھی آپ کی اہلیت کو چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔

اب ہر آنے والی قیادت و مرجعیت کا فرض ہے کہ وہ ایسی ہی صلاحیت پیدا کرے ورنہ میدان سے الگ ہو جائے۔

ا۔ عقیدہ کے لئے سب سے زیادہ اعلم ہو۔

ب۔ احکام کے لئے سب سے زیادہ با فہم ہو۔

ج۔ اتباع کرنے والوں میں سب سے افضل ہو۔

د۔ قیادت امت کے لئے سب سے زیادہ انسب ہو۔

یہ بنیادی موازین اور خالص آرزوئیں ہیں جو حق کے طلبگار اور خواہشات سے دور رہنے والے انسان کے دل میں پائی جاتی ہیں۔

عالم ایمان کی مصلحت اسی میں ہے کہ اس کی ولایت و قیادت کا کام ایک اعلم، افہم، افضل اور انسب شخص انجام دے اور کسی شخص کی بھی شرعی مصلحت اس بات میں نہیں ہے کہ ان صفات سے عاری انسان اس اہم فریضہ کی ذمہ داری سنبھال لے۔

فیصلہ کا حقدار کون؟

دنیا میں کوئی فرد یا جماعت ایسی نہیں ہے جو کسی کے بارے میں یقینی طور پر یہ فیصلہ کر سکے کہ وہ ان تمام مذکورہ بالا خصوصیات کا حامل ہے۔

اس لئے کہ حتمی اور یقینی طور پر اس کا علم نہ افراد کو ہے نہ جماعات کو۔ اور نہ کسی کے پاس ایسی

عقلی۔ فطری یا علمی طاقت پائی جاتی ہے۔

سب کا علم ظاہر سے متعلق ہے اور یہ مسئلہ باطن سے تعلق رکھتا ہے۔

انسان کسی قدر بھی کوشش کیوں نہ کرے کہ اعلم وافضل وانسب کا فیصلہ کرلے لیکن اس کا فیصلہ ظنی اور تخمینی ہی ہوگا۔ قطعی اور یقینی نہیں ہوسکتا ہے بلکہ اس کے انسانی جذبات وعواطف سے آزاد ہونے کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے اور انسانی دنیا کا مدعا ظن وتخمین نہیں ہے بلکہ علم ویقین ہے۔

لہٰذا اس حقیقت کا تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ یہ کام صرف پروردگار کے انجام دینے کا ہے۔ اسی نے حضرت محمدؐ کو آگے بڑھایا ہے اور ان کے اعلم وافضل وانسب ہونے کا اعلان کیا ہے۔

وہی صاحب عقیدہ ہے اور اس کی مصلحتوں کا سب سے بڑا محافظ ہے اور اس کا حق ہے کہ ہر دور میں ایسے شخص کی نشاندہی کرے جو حتمی اور یقینی طور پر ان صلاحیتوں کا مالک ہو۔

چنانچہ اس نے روز اول دعوت سے پیغمبرؐ کو حکم دے دیا کہ اس شخص کو تیار کریں جو ان کے بعد قیادت امت کا کام سنبھال سکے اور وہ طریقہ کار بھی واضح کردیں جس سے ان صلاحیتوں کا انکشاف ہوگا اور اس شخص کو پہچانا جاسکے گا۔

الٰہی طریقۂ کار کی قبولیت

اب اگر امت نے الٰہی طریقۂ کار کو تسلیم کرلیا اور اس شخص کو اعلم وافضل وانسب تسلیم کرلیا جسے خدا نے اہل قرار دیا ہے تو گویا خدا کی بیعت کرلی اور بندوں کا ارادہ خدائی ارادہ کے مطابق ہوگیا اور سب کا مقصد ومدعا ایک ہوگیا۔ یعنی یہ انسان خدا کی طرف سے معین ہوا ہے اور بندوں کی طرف سے مقبول بنا ہے۔ اس کے وجود کی قانونی حیثیت کو دونوں طرف سے طاقت حاصل ہوگئی ہے۔

خدائے پاک کی طرف سے بھی جس نے یہ کمالات دے کر قیادت کا اہل بنایا ہے۔

اور امت کی طرف سے بھی جس نے خدائی رنگ کو قبول کرلیا ہے اور اس کے مقرر کردہ انسان کو اعلم وافضل وانسب تسلیم کرکے اس کی بیعت کرلی ہے اور اسے اپنا قائد، مرجع اور ولی مان لیا ہے۔

اس طرح امت کے تمام امور عقیدہ وقیادت کی منزل میں مرتب ومنظم ہوجائیں گے اور

اس کے بہترین ثمرات حاصل ہو سکیں گے۔ دعوت و دولت کے راستے خدا کی طرف آسانی سے کھل جائیں گے اور معاشرہ نعمات الٰہیہ کے زیر سایہ زندگی گذارے گا۔

انکار کے نتائج

لیکن اگر امت نے اس خدائی طریقۂ کار کو رد کر دیا اور اس کی طرف سے معین کئے ہوئے حتمی اور یقینی اعلم و افضل و انسب کے ماننے سے انکار کر دیا اور اپنی خواہش یا اپنے ذاتی اجتہاد سے کسی شخص کو موزون و مناسب قرار دے لیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے خدا کے حتمی اور یقینی بیان کو ٹھکرا دیا اور اس کی جگہ پر ظنی اور تخمینی فیصلوں پر اعتماد کر لیا۔

یہ وہ حادثہ ہوگا جو حقائق کو تبدیل تو نہ کر سکے گا اور نہ کسی نا اہل کو اہل اور افضل بنا سکے گا لیکن ایک تفرقہ ضرور پیدا کر دے گا جہاں قیادت و ریاست کا کام اس شخص کے علاوہ دوسرے کے ہاتھ میں ہوگا جسے خدا نے معین کیا ہے اور چونکہ یہ کام مہارت و اختصاص کا کام ہے اور یہ دوسرا شخص اس اہلیت کا مالک نہیں ہے لہٰذا نتیجہ میں انحرافات پیدا ہوں گے اور دھیرے دھیرے امت وحدت کے بعد تفرقہ اور عزت کے بعد ذلت کا شکار ہو جائے گی اور نظام الٰہی کے دائرہ سے نکل کر ایک فرضی اور عقلی یا خواہشاتی دائرہ میں داخل ہو جائے گی۔ عقیدہ اپنے اثرات و عطایا سے محروم ہو جائے گا اور امت پر غضب الٰہی نازل ہوتا رہیگا جب تک دوبارہ امور کو اپنی اصلی منزل پر نہ لے آئے اور خدائی نمائندہ کی ولایت و قیادت کا اعتراف نہ کر لے۔

پروردگار کسی مریض کو دوا کے استعمال پر مجبور نہیں کرتا ہے اور نہ کسی گمراہ کو جبراً راہ راست پر لے آتا ہے۔ اس کا کام علاج اور طبیب کی نشاندہی کرنا تھا وہ اس نے کر دیا۔ ہدایت کا راستہ روشن کر دیا اور راہ پیمائی کا حوصلہ بھی پیدا کر دیا لیکن اگر مریض علاج نہیں چاہتا یا راہرو راستہ پر نہیں چلنا چاہتا تو یہ اس کی اپنی کوتاہی ہے اور اس کے نتائج اسے ہی برداشت کرنا ہوں گے۔

یہی حال ان سابقہ امتوں کا ہوا ہے جنھوں نے عقائد الٰہیہ کا انکار کیا ہے یا مرسلین کی قیادت سے انحراف کیا ہے یا دونوں کے درمیان جدائی پیدا کی ہے اور عقیدہ کا اعتراف کر کے

قیادت سے انکار کر دیا ہے۔

الٰہی طریقۂ کار کے انکار کی صورتیں

۱۔ عقیدہ کا اقرار کر کے اصلاً ولایت و قیادت سے انکار کرنا۔ جس طرح کہ قوم نے بنی اسرائیل کے پیغمبر پر ایمان اختیار کیا لیکن طالوت کی قیادت سے انکار کر دیا کہ وہ ان کی نظر میں قیادت کے اہل نہیں تھے اگرچہ پروردگار نے انھیں اہل قرار دیا تھا اور علم و جسم کی طاقتوں میں وسعت عنایت کی تھی جس کے بعد مجبوراً قوم کو قبول کرنا پڑا۔

۲۔ عقیدۂ الٰہیہ پر ایمان اور نبی کے بعد قیادت و ولایت کا انکار۔ اس تاویل کے ساتھ کہ خدا نے کسی کو قائد نہیں بنایا ہے اور یہ کام پیغمبرؐ نے اپنے اجتہاد سے انجام دیا ہے اور بشری اجتہاد کی مخالفت میں کوئی حرج نہیں ہے۔ پیغمبرؐ نے یہ انتخاب بنی ہاشم میں کیا ہے اور بنی ہاشم کے لئے نبوت کافی ہے اب ان کا فرض ہے کہ خلافت کو دوسرے قبائل کے لئے چھوڑ دیں۔

پھر نبی کا انتخاب کردہ انسان خوش مزاج ہے۔ اس میں خود پسندی پائی جاتی ہے۔ وہ ابھی کمسن ہے اور امت میں اس سے زیادہ عمر دراز موجود ہیں لہٰذا اس انتخاب کا تسلیم کرنا ضروری نہیں ہے۔

جو حادثہ حضرت علیؑ کے سلسلہ میں پیش آیا اور امت نے عقیدہ کو تسلیم کر کے قیادت سے انکار کر دیا۔

۳۔ عقیدہ کا قانون کی حیثیت سے بھی تسلیم نہ کرنا اور پھر قیادت کا بھی انکار کر دینا۔ ظاہر ہے کہ یہ انداز انسان کو کفر کی منزل تک پہونچا دیتا ہے اور پھر اسلام کا کوئی امکان نہیں رہ جاتا ہے۔ (العیاذ باللہ)۔

فصل دوم

سیاسی قیادت

۳۔ خلافت پیغمبرؐ کے لئے خدائی انتظام

حضرت آدم کی ولادت سے پہلے:

مشیّت پروردگار یہ تھی کہ پیغمبر عربی خاتم الانبیاء ہوں اور ان کا دین اسلام آسمانی ادیان میں سب سے آخری دین ہو اور وہ خود اپنے دین کی مکمل وضاحت کریں۔ اس وقت بھی جب دین دعوت کے مرحلہ میں ہو اور اس کے بعد بھی جب دعوت دولت میں تبدیل ہو جائے یعنی خود ہی اس حکومت کی قیادت کریں تاکہ نظریاتی دنیا میں توضیح اور عملی دنیا میں تطبیق دونوں انھیں کے زیر نظر اور زیر نگرانی ہو۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور آپ کے عمل کے ذریعہ دین کے دقیق ترین مسائل کی توضیح ہوئی اور آپ کا بیان ایک ایسا فنی بیان ثابت ہوا جس میں آواز، تصویر اور حرکت سب کچھ شامل ہو۔

اس کے بعد مشیّت پروردگار کا تقاضا یہ بھی تھا کہ رسول اکرمؐ اور ان کے بعد ہونے والے ولی اور جانشین دونوں ایک ساتھ کام شروع کریں تاکہ رسول اکرمؐ دین کی مکمل وضاحت کر کے اور اس کی بنیادوں کو مستحکم کر کے اور ایک صاحب اقتدار حکومت بنا کر دنیا سے تشریف لے جائیں تو امت کی قیادت کو اس شخص کے سپرد کر دیں جو روز اوّل سے ان کے ساتھ کام کر رہا ہے اور وہ اسی پیغمبرانہ بصیرت کے ساتھ انھیں کے نقش قدم پر چلتا رہے۔

یہ اسلام کی حسین ترین شکل تھی جو قلم قدرت نے بنائی تھی اور اسے صاحبان ایمان کی ذہنی اسکرین پر نقش بھی کر دیا تھا۔

اسلام کی آرزو یہی تھی کہ یہ نقشہ کامیاب ہو اور مسلمان بلا جبر و اکراہ اسے منزل عمل میں لے آئیں۔

اس لئے کہ رسول اور ولی کا یہ گہرا رابطہ ایمانی برادری کے لئے بہترین نمونہ اور اسلامی خطوط پر چلنے کا بہترین طریقۂ کار ثابت ہو سکتا ہے اور اس سے سلف و خلف اور تابع و حاکم کے ارتباط کی بھی مکمل تفسیر ہو سکتی ہے۔

رسول اکرمؐ نے واضح لفظوں میں فرما دیا تھا کہ "ہم اور علیؑ بارگاہ احدیت میں عالم انوار میں خلقت آدم سے ۱۴ ہزار پہلے حاضر رہے۔ اس کے بعد جب آدمؑ کی خلقت ہوئی اور یہ نور ان کی طرف منتقل ہوا تو اس کے دو حصے کر دئے گئے۔ ایک میں تھا اور ایک علیؑ۔ (مسند احمد، الفردوس، شرح نہج البلاغہ معتزلی ۳/ ۲۵۲)

دونوں انوار کا خالق پروردگار تھا اور اسی نے دونوں کو ساتھ ساتھ چلایا اور اسی نے تمام اہل زمین پر نگاہ کرنے کے بعد دو افراد کا انتخاب کیا ایک رسول اکرمؐ اور ایک ان کے خلیفہ و داماد علیؑ۔ جو بات متعدد روایات سے ثابت ہے۔ (مستدرک حاکم ۳/ ۱۲۹، تاریخ دمشق ۱/ ۲۴۹، تاریخ بغداد ۴/ ۱۹۵، کنز العمال ۶/ ۳۹۱، ۱/ ۹۵، کفایۃ الطالب ص ۲۹۷)۔

قبل دعوت

سرکار دو عالمؐ کے والد محترم کا اس وقت انتقال ہوا جب آپ شکم مادر میں تھے۔ آپ کی ابتدائی کفالت آپ کے جد بزرگوار جناب عبد المطلب نے کی۔

ان کے انتقال کے بعد یہ کام جناب ابو طالب کے ذمہ آیا۔ ابو طالب آپ کے مہربان چچا بھی تھے اور آپ کے وصی و وزیر علیؑ کے والد بزرگوار بھی تھے۔ انھیں کے زیر سایہ آپ پروان چڑھے یہانتک کہ جوان ہونے کے بعد ایک دولت مند خاتون جناب خدیجہ سے عقد کیا اور اب یہ چاہا کہ اپنا مستقل گھر آباد کرنے کے بعد اپنے مہربان چچا کی مالی امداد بھی کریں۔

اس لئے کہ وہ قلیل المال ہیں اور کثیر العیال۔ چنانچہ آپ نے ان کے ایک فرزند کو لے لیا اور مشیّت الٰہی یہ ہوئی کہ وہ فرزند علیؑ ہو جسے آپ کے بعد آپ کا جانشین ہونا ہے۔

یہ فرزند اپنے چچازاد بھائی کی کفالت و رعایت میں رہا یہاں تک کہ پروردگار نے پیغمبرؐ کی رسالت کا اعلان کر دیا تو بھی اس کے ساتھ ہی رہا اس آخری سانس تک جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

اعلان رسالت کے بعد

دوشنبہ کا دن تھا جب رسول اکرمؐ کو رسالت کی ذمہ داری سپرد کی گئی اور منگل کے دن علیؑ نے اپنے اسلام کا اعلان کیا اور پھر یہ نوجوان مسلسل پیغمبرؐ کے ساتھ رہا اور ایک لمحہ کے لئے جدا نہ ہوا۔ مکہ میں دونوں ساتھ رہے۔ مدینہ میں دونوں ایک ساتھ رہے۔ زندگی بھر ایک مکان میں رہے۔

گویا پیغمبرؐ نظام صداقت کے لانے والے اور علیؑ ان کی تصدیق کرنے والے تھے اور ایسے ہی لوگ متقی ہوتے ہیں۔ (شواہد التنزیل ۲/۱۲۰ حدیث نمبر ۸۱۰ - ۸۱۵، مناقب ابن مغازلی ص ۲۶۹ حدیث ۳۱۷، کفایۃ الطالب ص ۲۳۳، در منثور ۵/۳۲۸، تفسیر قرطبی ۱۵/۲۵۶، تاریخ ابن عساکر ۲/۴۱۸، احقاق الحق ۳/۱۷۷)

علیؑ نے ایک لمحہ کے لئے نہ پیغمبرؐ سے اختلاف کیا اور نہ جدال و قتال کیا۔ پوری زندگی آپ کے اقوال و افعال کی تصدیق کرتے رہے اور ہر میدان میں آپ کے اوّلین شہسوار رہے۔ اسی لیے اسلامی دنیا میں آپ کو صدیق اکبر اور فاروق اعظم کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ (تاریخ ابن عساکر ۱/۷۶، مجمع الزوائد ۹/۱۰۲، کفایۃ الطالب ص ۱۸۷، اصابہ ۴/۱۷۱، استیعاب برحاشیہ اصابہ ۴/۱۷۰، غایۃ المرام ۵/۲۸۷، میزان الاعتدال ۲/۱۴، فرائد السمطین ۱/۱۳۹ - ۱۴۰، ذخائر العقبیٰ ص ۵۶، الغدیر ۲/۳۱۳، منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ۵/۳۳، سیرۃ حلبیہ ۱/۳۸۰، شرح نہج البلاغہ معتزلی ۳/۳۶۱)۔

خود حضرت علیؑ نے پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ اپنے تعلقات کی اس طرح وضاحت فرمائی ہے

کہ "ابتدا میں مجھے اپنے سینہ سے لگا کر رکھا اور اپنی گود میں جگہ دی اپنے بستر پر لٹایا اور اپنے دندان مبارک سے لقمہ کو نرم بنا کر مجھے کھلایا۔ نہ میرے کسی قول میں کوئی غلط بیانی دیکھی نہ میرے کسی عمل میں غلطی۔ میں ان کے ساتھ اس طرح رہتا تھا جس طرح بچۂ ناقہ اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ روزانہ مجھے اپنے اخلاقیات کا مشاہدہ کراتے تھے اور اس کے اتباع کا حکم دیتے تھے۔ میں حرا میں ان کے ساتھ تھا جہاں صرف میں انھیں دیکھتا تھا اور کوئی دوسرا نہ دیکھتا تھا۔ اسلام میں صرف ایک گھر تھا جس میں رسول اکرمؐ اور خدیجہ تھے اور تیسرا میں تھا۔ میں رسالت اور وحی کے نور کا مشاہدہ کرتا تھا اور نبوّت کی خوشبو کو محسوس کرتا تھا۔

(التصوف و التشیع ہاشم معروف الحسنی۔ النظام السیاسی فی الاسلام)

قثم بن العباس سے پوچھا گیا کہ آپ حضرات کے ہوتے ہوئے علیؑ کس طرح وارث پیغمبرؐ ہو گئے۔؟

تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ سب سے پہلے ان سے ملحق ہوئے اور سب سے زیادہ ان سے قریب تر رہے۔ (المختارہ للضیاء المقدسی۔ تہذیب الآثار ابن جریر، کنز العمال ۶/۴۰۸ حدیث نمبر ۶۱۵۵، خصائص نسائی ص ۱۸، شرح النہج ص ۲۵۵، مسند احمد ۱/۱۵۹)۔

اعلانِ رسالت کے بعد اعلانِ خلافت

جب آیت "انذر عشیرتک الاقربین" نازل ہوئی تو رسول اکرمؐ نے اولادِ عبد المطلب کے اجتماع میں فرمایا۔ "اے اولاد عبد المطلب! خدا کی قسم میرے علم میں عرب میں کوئی ایسا جوان نہیں ہے جو اپنی قوم کے لئے مجھ سے بہتر پیغام لے کر آیا ہو۔ میں وہ پیغام لے کر آیا ہوں جس میں خیر دنیا بھی ہے اور خیر آخرت بھی۔ مجھے میرے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ میں تمھیں اس کی طرف دعوت دوں تو کون میرا یہ بوجھ بٹائے گا جو میرا بھائی، وصی اور میرے بعد میرا جانشین ہو۔

حضرت علیؑ کا بیان ہے کہ ساری قوم خاموش رہی۔ میں سن میں سب سے کمسن تھا لیکن میں نے اس سکوت کو توڑا اور عرض کی یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں۔ آپ کا بوجھ بٹاؤں گا۔

آپ نے میری گردن پر ہاتھ رکھا اور فرمایا کہ یہ میرا بھائی، وصی اور میرے بعد تمھارے

درمیان میرا خلیفہ ہے لہذا اس کی بات سنو اور اطاعت کرو۔ (تاریخ الامم والملوک طبری ۲/۲۱۷ دار احیاء التراث بیروت، جامع البیان فی تفسیر القرآن ابو جعفر طبری ۱۹/۷۵، لباب التاویل فی معانی التنزیل خازن بغدادی ۱۲۷/۵، معالم التنزیل بغوی ۱۲۷/۵، تفسیر ابن کثیر ۳/۳۵۱، سیرت نبویہ ابو الفداء اسماعیل بن کثیر دمشقی ۴۵۸/۱، تاریخ کامل ۲/۶۲-۶۳، شرح نہج البلاغہ ۲۱۰/۱۳-۲۲۴، سیرت حلبیہ ۳۱۱/۱، منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ۴۱/۵، کنز العمال ۱۵/۱۵ حدیث ۳۳۴، تاریخ ابن عساکر ۱۲۵/۱، مستدرک حاکم، خصائص نسائی ص ۶، تلخیص ذہبی۔)

یہ ایک واضح شرعی نص ہے کہ رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ کو اپنا وصی اور جانشین نامزد کر دیا تھا اور کھلی ہوئی بات ہے کہ قول و فعل و تقریر پیغمبرؐ عقیدۂ الٰہیہ کا ایک رکن اعظم ہے اور اس کے خلاف کوئی دوسرا بیان وارد نہیں ہوا ہے۔

حدیث بھی قواعد کے اعتبار سے صحیح ہے۔ ابن جریر نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ابو جعفر اسکافی کی طرح مسلمات کے انداز سے نقل کیا ہے۔

اس حدیث کی تاویل بھی ممکن نہیں ہے اس لئے کہ واضحات کی تاویل نہیں ہوا کرتی ہے۔ رسول اکرمؐ کا بیان اپنی خواہش نفس سے بھی نہیں ہوا کرتا ہے بلکہ امر الٰہی سے ہوتا ہے اور آپ ہمیشہ وحی خداوندی کا اتباع کرتے ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ آپ اپنے وصی و وزیر و جانشین کا اعلان کر دیں اور پروردگار کی طرف رجوع نہ کریں۔

اعلان ولیعہدی کی مسلسل تاکید

۱۔ منزلت

"یا علی! تم میرے لئے وہی درجہ رکھتے ہو جو موسیٰ کے لئے ہارون کا درجہ تھا"۔ (صحیح بخاری ۱۲۹/۵، صحیح مسلم ۲/۲۶۰، صحیح ترمذی ۳۰۴/۵، مسند احمد ۳/۵۰، مستدرک حاکم ۱۰۹/۳، تاریخ طبری ۱۰۴/۳، تاریخ ابن عساکر ۳۰/۱)۔

اس حدیث مبارک میں رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ کے لئے وہ تمام مراتب ثابت کر دئے ہیں جو حضرت ہارون کے لئے تھے۔ صرف نبوت کا استثناء کیا ہے اور یہ استثناء خود ہی دلیل ہے

کہ باقی مراتب ثابت ہیں اور ان مراتب میں سب سے زیادہ نمایاں یہ ہے کہ ہارون حضرت موسیٰ کے وزیر، شریک امر اور خلیفہ تھے جیسا کہ جناب موسیٰ کی دعا سے ظاہر ہوتا ہے " واجعل لی وزیراً من اھلی"۔

اور پھر پروردگار کا واضح ارشاد بھی ہے کہ "قد اوتیت سؤلک یاموسیٰ"۔

اس حدیث کی بنا پر حضرت علیؑ رسول اکرم کے وصی اور ولیعہد ہیں اور یہ حدیث صحیح ترین احادیث میں ہے اور اس کا تواتر اور اس کی شہرت اس حد تک تھی کہ اس کی روایت خود معاویہ نے بھی کی ہے۔ اور مرسل اعظمؐ نے خود بھی بار بار اس حدیث کی تکرار فرمائی تھی۔

۲۔ اخوت

شریعت کے استحکام کے لئے مالک کائنات نے حضرت علیؑ کو رسول اکرمؐ کا بھائی بھی قرار دیا تھا جو شرف کائنات میں کسی کو حاصل نہیں ہو سکا اور اس مواخاۃ کا اعلان ہجرت سے پہلے بھی ہوا تھا اور ہجرت کے بعد بھی اور پھر رسول اکرمؐ نے مختلف مواقع پر بار بار اس کی تکرار بھی فرمائی تھی تاکہ مسلمان فراموش نہ کرنے پائیں۔ (تذکرۃ الخواص ص ۲۳، تاریخ ابن عساکر ۱/ ۱۰۷۔۱۵۰، کنز العمال ۶/ ۲۹۰ حدیث ۵۹۷، مناقب خوارزمی ص ۷، فصول مہمہ ص ۲۱، مستدرک حاکم ۳/ ۱۰۹، صحیح ترمذی ۵/ ۳۰۰، اسد الغابہ ۲/ ۲۲۱، ۳/ ۱۲۷، استیعاب برحاشیہ اصابہ ۳/ ۳۵، طبقات ابن سعد ۲/ ۲۲۰، تفسیر رازی ۲/ ۱۸۹)۔

حضرت فاطمہؑ کے عقد کے وقت فرمایا کہ "پروردگار کی طرف سے میرے بھائی اور ابن عم کے بارے میں یہ خوشخبری آئی ہے کہ اللہ نے ان کا عقد میری دختر فاطمہؑ سے کر دیا ہے"۔ مناقب خوارزمی ص ۲۴۶، مقتل الحسینؑ خوارزمی ۱/ ۶۰، اسد الغابہ ۱/ ۲۰۶، صواعق محرقہ ص ۱۷۱)۔

حضرت فاطمہؑ کی رخصتی کے موقع پر ام ایمن سے فرمایا کہ میرے بھائی کو بلاؤ۔ ام ایمن نے کہا کہ آپ انھیں بھائی بھی کہتے ہیں اور ان سے بیٹی کا عقد بھی کرتے ہیں؟ ۔ فرمایا بیشک وہ بھائی ہے۔ (مادی رشتے روحانی تعلقات کو فنا نہیں کر سکتے ہیں) خصائص نسائی ص ۱۱۵

ایک اور مقام پر فرمایا کہ "یا علیؑ! تم میرے بھائی اور جنت میں میرے رفیق اور ساتھی ہو"۔ (ابن عساکر ۱/ ۱۲۲، منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ۵/ ۴۶)

"یا علیؑ! تم میرے بھائی اور میری اولاد کے باپ ہو۔ تم مجھ سے ہو اور تمھاری ابتدا وانتہا دونوں میرے ساتھ ہے"۔ (خوارزمی ص ۲۷)

وقت آخر بھی آپ نے یہی فرمایا کہ میرے بھائی کو بلاؤ۔ طبقات ابن سعد ۲/۲۶۳، مناقب خوارزمی ص ۲۹)

پھر جب علیؑ آگئے تو اپنے قریب بٹھا کر رازدارانہ گفتگو فرماتے رہے یہانتک کہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

اسی بنیاد پر امیر المومنینؑ فرمایا کرتے تھے کہ میں اللہ کا بندہ اور پیغمبرؐ کا بھائی ہوں۔ میں صدیق اکبر ہوں اور میرے بعد یہ دعویٰ صرف جھوٹا انسان ہی کر سکتا ہے۔ (سنن ابن ماجہ ۱/۴۴، تاریخ طبری ۲/۳۱۰، استیعاب برحاشیہ اصابہ ۳/۳۹، کامل ابن اثیر ۲/۵۷، تاریخ ابن عساکر ۱/۱۲۰)۔

عالم اسلام کے خواص و عوام سب جانتے ہیں کہ حضرت علیؑ پیغمبرؐ کے بھائی تھے جنھیں ہجرت سے قبل وبعد دو مرتبہ برادری کا شرف دیا گیا ہے اور عمر ابوبکر کے بھائی قرار پائے تھے جس کی بناپر انھوں نے خلافت اپنے بھائی کے حوالے کر دی۔ (صرف پیغمبرؐ کو یہ اختیار نہیں دیا گیا۔ جوادی)

۳۔ ولایت

رسول اکرمؐ نے مسلمانوں کے درمیان بار بار اعلان فرمایا کہ "یا علی! تم دنیا اور آخرت میں میرے ولی ہو"۔

"تم میرے بعد ہر مومن کے ولی ہو"۔

یہانتک کہ ایک مرتبہ ایک لشکر روانہ کیا اور اس کا سردار حضرت علیؑ کو بنایا اور حضرت علیؑ نے مال غنیمت میں سے ایک کنیز کا انتخاب کر لیا تو لوگوں نے رسول اکرمؐ سے اس امر کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا کہ علیؑ کو اس سے زیادہ اختیار حاصل ہے وہ میرے بعد تم سب کا ولی ہے۔

(صحیح ترمذی ۵/۲۹۶ حدیث نمبر ۳۷۹۶، خصائص نسائی ص ۹۷، مناقب خوارزمی ص ۹۲، اصابہ ۲/۵۰۹، نور الابصار ص ۱۵۸، حلیۃ الاولیاء ۶/۲۹۴، اسد الغابہ ۴/۲۷، تاریخ ابن عساکر ۱/۳۸۱، مصابیح السنہ لبغوی ۲/۲۷۵، جامع الاصول ۹/۴۷۰، کنز العمال ۱۵/۱۲۴، ینابیع المودۃ ص ۵۳، تذکرۃ الخواص ص ۳۶، الغدیر ۳/۲۱۶، مطالب السئول ۱/۴۸، ملحق المراجعات ص ۱۴۴)۔

آپ نے اکثر اس اعلان کی بھی تکرار فرمائی کہ "جس کا میں ولی ہوں اس کا یہ علیؑ بھی ولی ہے"۔ اور "جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ بھی مولا ہے"۔ اور یہ باتیں کسی مسلمان پر مخفی نہیں تھیں۔ اس لئے کہ "من کنت مولاہ" کا اعلان ایک لاکھ سے زیادہ اصحاب کے سامنے ہوا تھا اور اس کی تاکید اس طرح بھی ہوئی تھی کہ آپ نے بار بار علیؑ کی ولایت تسلیم کرنے کا حکم دیا تھا اور یہاں تک فرما دیا تھا کہ جو علیؑ کا دوست ہے وہ میرا دوست ہے اور جو علیؑ کا دشمن ہے وہ میرا دشمن ہے۔ اور رسولؐ کی دوستی اور دشمنی خدا کی دوستی اور دشمنی کے مرتبہ میں ہے۔

اس سلسلہ میں سرکار کے ارشادات میں یہ ارشاد گرامی بھی شامل ہے کہ "جو میری جیسی زندگی اور موت چاہتا ہے اور میرے ساتھ اس جنت میں رہنا چاہتا ہے جس کا پروردگار نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اس کا فرض ہے کہ علیؑ کی ولایت کو تسلیم کرے۔ کہ وہ تمہیں نہ ہدایت سے باہر نکال سکتے ہیں اور نہ گمراہی میں داخل کر سکتے ہیں۔" (حلیۃ الاولیاء ۴/۳۴۹-۳۵۰، مجمع الزوائد ۹/۱۰۸، تاریخ ابن عساکر ۲/۹۳ حدیث نمبر ۶۰۹، فضائل الخمسہ ۲/۲۱۳، احقاق الحق ۵/۱۰۸)۔

وہب بن حمزہ کا بیان ہے کہ میں نے ایک سفر میں علیؑ سے کچھ زیادتی کا احساس کیا اور رسول اکرمؐ سے شکایت کی تو آپ نے فرمایا کہ خبردار علی کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔ وہ میرے بعد تمہارا ولی ہے۔ (اصابہ ۳/۶۴۱، تاریخ ابن عساکر ۱/۳۸۵، ینابیع المودۃ ص ۵۵، الغدیر ۳/۲۱۶، اسد الغابہ ۵/۹۴، مجمع الزوائد ۹/۱۰۹)۔

علیؑ کی محبّت خدا کی محبّت ہے

حضورؐ نے اصحاب سے خطاب کر کے فرمایا کہ میں ہر ایمان لانے والے اور تصدیق کرنے والے کو وصیّت کرتا ہوں کہ علیؑ سے محبت کرے کہ علیؑ کی محبّت میری محبت ہے اور میری محبّت خدا کی محبّت ہے۔ اور علیؑ سے دشمنی مجھ سے دشمنی ہے اور میری دشمنی خدا سے دشمنی ہے۔ (تاریخ ابن عساکر ۲/۹۳ حدیث نمبر ۵۹۴-۵۹۵، مناقب ابن مغازلی ص ۲۳۰

حدیث نمبر ۲۷۷۔ ۲۷۹، مجمع الزوائد ۹/ ۱۰۸، ینابیع المودۃ ص ۲۸۲، منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ۵/ ۳۲، احقاق الحق ۶/ ۳۲۴۔ ۳۷۴، فضائل الخمسہ ۱/ ۲۰۲، فرائد السمطین ۱/ ۲۹۱، ملحق المراجعات ص ۲۹)۔

دوسرے موقع پر فرمایا کہ "آگاہ ہو جاؤ جو مجھ پر ایمان لایا ہے اور جس نے میری تصدیق کی ہے اس کا فرض ہے کہ علیؑ بن ابی طالب سے محبت کرے کہ علیؑ کی ولایت میری ولایت ہے اور میری ولایت خدا کی ولایت ہے۔"

(تاریخ ابن عساکر ۲/ ۹۱ حدیث نمبر ۵۹۱)

امر الٰہی سے تاکید ولایت

اسی ولایت علیؑ کی تاکید کے لئے قرآن مجید کی آیت ولایت "انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین آمنوا . . . " بھی نازل ہوئی اور اس وقت نازل ہوئی جب علیؑ نے حالت رکوع میں زکوٰۃ دی اور اللہ نے پیغمبرؐ کی دعا کو قبول فرمایا "واجعل لی وزیرا من اھلی علیا اخی"۔ (تفسیر طبری ۶/ ۲۸۸، کشاف ۱/ ۶۴۹، زاد المسیر ۲/ ۳۸۳، تفسیر قرطبی ۶/ ۲۱۹، تفسیر منیر ۱/ ۲۱۰، فتح البیان ۳/ ۵۱، اسباب النزول ص ۱۴۸، معالم التنزیل ۲/ ۵۵، شواہد التنزیل ۱/ ۱۶۱، مناقب ابن مغازلی ص ۳۱۱ حدیث نمبر ۳۵۴، کفایۃ الطالب ص ۲۲۸۔ ۲۵۰، ذخائر العقبیٰ ص ۵۸، مناقب خوارزمی ص ۱۸۷، تاریخ ابن عساکر ۲/ ۴۰۹، فصول مہمہ ص ۱۰۸، درمنثور ۲/ ۲۹۳، فتح القدیر ۲/ ۵۳، لباب المنقول برحاشیہ جلالین ص ۲۱۳، تذکرۃ الخواص ص ۱۸، ۲۰۸۔ نور الابصار ص ۷۱، ینابیع المودۃ ص ۱۱۵، تفسیر رازی ۱۲/ ۲۶، تفسیر ابن کثیر ۲/ ۷۱، احکام القرآن جصاص ۴/ ۱۰۲، شرح نہج البلاغۃ ۱۳/ ۲۷۷، صواعق محرقہ ص ۲۴، انساب الاشراف ۲/ ۱۵۰، تفسیر نسفی ۱/ ۲۸۹، الحاوی للسیوطی ۱/ ۱۳۹، کنز العمال ۱۵/ ۱۴۶، منتخب الکنز برحاشیہ مسند احمد ۵/ ۳۸، جامع الاصول ۹/ ۴۷۸، الریاض النضرہ ۲/ ۱۷۳، الملحق المراجعات ص ۱۳۷)۔

فصل سیوم

ولی یعنی سردار، امام، قائد

رسول اکرمؐ نے اصحاب سے خطاب کر کے فرمایا "اللہ نے علیؑ کے بارے میں تین باتوں کی وحی کی ہے۔ علیؑ سردار مسلمین، امام المتقین اور قائد الغرالمحجلین ہیں۔ (معجم صغیر طبرانی ۲/۸۸، مناقب ابن مغازلی ص ۶۵، مناقب خوارزمی ص ۲۳۵، درر السمطین ص ۱۴۴، فصول المہمہ ص ۱۰۷، مجمع الزوائد ۹/۱۲۱، اسد الغابہ ۱/۶۹۔ ۳/۱۱۶، تاریخ ابن عساکر ۲/۲۵۷، فضائل الخمسہ ۲/۱۰۰، ینابیع المودۃ ص ۸۱، احقاق الحق ۴/۱۱، فرائد السمطین ۱/۱۴۲، الملحق المراجعات ص ۱۴۱۔ ۱۴۲۔

دوسرے موقع پر فرمایا کہ اللہ نے علیؑ کے بارے میں یہ وحی نازل فرمائی ہے کہ وہ سید المسلمین ولی المتقین اور قائد الغرالمحجلین ہیں۔ (تاریخ ابن عساکر ۲/۲۵۷، الریاض النضرہ ۲/۲۳۴، ذخائر العقبیٰ ص ۷۰، منتخب کنز العمال بر حاشیہ مسند احمد ۵/۳۴)

ایک دن اصحاب کے سامنے علیؑ کا اس انداز سے استقبال کیا "مرحبا بسید المسلمین و امام المتقین"۔ (حلیۃ الاولیاء ۱/۶۶، تاریخ ابن عساکر ۲/۴۴۰، کنز العمال ۶/۱۵۷ حدیث نمبر ۲۴۴۳، شرح النہج ۹/۱۷۰، نظم درر السمطین ص ۱۱۵، مطالب السئول ۱/۴۶، ینابیع المودۃ ص ۱۸۱۔ ۳۱۳، کنز العمال بر حاشیہ مسند احمد ۵/۵۵، فرائد السمطین ۱/۱۴۱)۔

ایک دن اصحاب کے اجتماع میں فرمایا کہ "جو سب سے پہلے اس دروازہ سے داخل ہوگا وہ امام المتقین، سید المسلمین، یعسوب الدین، خاتم الوصیین اور قائد الغرالمحجلین ہوگا۔ جس کے بعد علیؑ داخل ہوئے تو آپ نے کھڑے ہو کر معانقہ فرمایا"۔ (شرح النہج ۹/۶۹، تحقیق ابو الفضل حلیۃ الاولیاء ۱/۶۳، مناقب خوارزمی ص ۴۲، تاریخ ابن عساکر ۲/۴۸۷ حدیث نمبر ۱۰۰۵، مطالب السئول ۱/۶۰، میزان ذہبی ۱/۶۴، کفایۃ الطالب ص ۲۱۲، ینابیع المودۃ ص ۳۱۳، فضائل الخمسہ

۲/۲۵۳، فرائد السمطین ۱/۱۴۵)۔

ایک دن اصحاب سے فرمایا "اللہ نے علیؑ کے بارے میں مجھ سے ایک عہد لیا تو میں نے عرض کی خدایا وہ کیا ہے ؟ ارشاد ہوا۔ یاد رکھو علیؑ پرچم ہدایت۔ امام الاولیاء اور میرے اطاعت گذاروں کے لئے ایک نور ہے"۔ (حلیۃ الاولیاء ۱/ ۶۷، شرح النہج ۹/۶۷، مناقب خوارزمی ص ۲۱۵، نظم درر السمطین ص ۱۱۴، تاریخ ابن عساکر ۲/ ۱۸۹ حدیث نمبر ۶۷۲، مناقب ابن مغازلی ص ۴۶، کفایۃ الطالب ص ۷۳، ینابیع المودۃ ص ۳۱۲، مطالب السئول ۱/ ۴۴، احقاق الحق ۴/ ۱۶۸، فرائد السمطین ۱/ ۱۴۴۔ ۱۵۱)۔

ایک دن گروہ انصار سے خطاب کر کے فرمایا "اے گروہ انصار! کیا میں تمھیں ایسی بات سے باخبر نہ کر دوں جس سے تمسک کے بعد کبھی گمراہ نہ ہو گے۔

سب نے عرض کی ضرور۔

فرمایا یہ علیؑ ہے اس سے میری بنیاد پر محبت کرو اور اس کا احترام کرو۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا حکم جبریل امینؑ پروردگار کی طرف سے لے کر آئے ہیں"۔

(شرح النہج ۹/ ۱۷۰، حلیۃ الاولیاء ۱/ ۶۳، مجمع الزوائد ۹/ ۱۳۲، کفایۃ الطالب ص ۲۱۰، ینابیع المودۃ ص ۳۱۳، کنز العمال ۱۵/ ۱۲۶، الریاض النضرہ ۲/ ۲۲۳، فضائل الخمسہ ۲/ ۹۸، مطالب السئول ۱/ ۶۰، فرائد السمطین ۱/ ۱۹۷ حدیث ص ۱۵۴)۔

ایک دن اپنے گرد و پیش کے افراد سے خطاب کر کے فرمایا "ذرا سید العرب علیؑ کو بلاؤ تو عائشہ نے کہا کہ کیا آپ سید العرب نہیں ہیں؟

فرمایا کہ میں سید اولاد آدم ہوں اور علیؑ سید العرب ہے"۔

اس کے بعد جب علیؑ آگئے تو انصار کو طلب فرمایا اور وہ فقرات ارشاد فرمائے جو اس سے پہلے والی روایت میں نقل کئے گئے ہیں۔ (حلیۃ الاولیاء بہ نقل شرح النہج ۲/ ۲۵۱)

ایک مرتبہ اصحاب کے سامنے علیؑ کے بارے میں فرمایا کہ "یا علیؑ تمھارے چہرہ پر نظر کرنا عبادت ہے۔ تم دنیا و آخرت میں سردار ہو۔ تمھارا دوست میرا دوست ہے اور میرا دوست خدا کا دوست ہے، تمھارا دشمن میرا دشمن ہے اور میرا دشمن خدا کا دشمن ہے۔ ویل ہے اس کے واسطے جو تم سے

دشمنی کرے"۔ (مسند احمد، شرح النہج ۳/۲۵۳)

(ابن عباس نے اس حدیثِ نظر میں عبادت کی توجیہ یہ کی ہے کہ جو علیؑ کو دیکھے گا وہ کہے گا سبحان اللہ کیا صاحب علم، صاحب شجاعت اور صاحب فصاحت و بلاغت یہ نوجوان ہے۔ اور یہ تسبیح پروردگار بہر حال عبادت ہے۔)

ولی خدا کے نمایاں ترین کمالات

سرکارِ دو عالمؐ نے علیؑ کے علم کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "میں شہر علم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے"۔ جو علم چاہتا ہے اسے دروازہ پر آنا ہوگا۔ (تاریخ ابن عساکر ۲/۶۴ حدیث نمبر ۹۸۴-۹۹۷، تاریخ الخلفاء ص ۱۷۰، مقتل الحسین خوارزمی ۱/۴۳، الاستیعاب برحاشیہ اصابہ ۳/۳۸، میزان ذہبی ۱/۴۱۵، الفتح الکبیر ۱/۲۷۶، الجامع الصغیر ۱/۹۳، منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ۵/۳۰، شرح النہج ۷/۲۱۹)۔

دوسرے موقع پر فرمایا "میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے"۔ (صحیح ترمذی ۳۰۱/۱ حدیث نمبر ۳۸۰۷، حلیۃ الاولیاء ۱/۶۳، مناقب ابن مغازلی ص ۸۷ حدیث نمبر ۱۲۹، اسعاف الراغبین برحاشیہ نور الابصار ص ۱۴۰، ذخائر العقبیٰ ص ۷۷، صواعق محرقہ ص ۱۲۰، تاریخ ابن عساکر ۲/۴۵۹، فضائل الخمسہ ۲/۲۴۸، مصابیح السنۃ بغوی ۲/۲۷۵، الجامع الصغیر ۱/۹۳، منتخب کنز العمال ۵/۳۰)۔

تیسرے موقع پر فرمایا "میں حکمت کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے"۔ (مناقب ابن مغازلی ص ۸۶، فتح الملک العلی ص ۲۶)

چوتھے موقع پر فرمایا "علی میرے علم کا دروازہ اور میرے بعد میرے پیغام کی وضاحت کرنے والا ہے۔ اس کی محبت ایمان ہے اور اس کی عداوت نفاق"۔
(الغدیر ۳/۹۶)

ایک دن اصحاب کے سامنے خود علیؑ سے خطاب کر کے فرمایا کہ "تم میرے بعد تمام اختلافات کی وضاحت کرنے والے ہو"۔ (تاریخ ابن عساکر ۲/۴۸۸ حدیث نمبر ۱۰۰۸-۱۰۰۹، مقتل الحسینؑ

خوارزمی ۱/۸۶، مناقب خوارزمی ص ۲۳۶، ینابیع المودۃ ص ۱۸۲، منتخب کنز العمال ۵/۳۲،
ملحق المراجعات ص ۱۴۶)

ایک دن اصحاب سے فرمایا کہ "علی مجھ سے وہی منزلت رکھتا ہے جو میری منزلت پروردگار کے نزدیک ہے۔" (ذخائر العقبیٰ ص ۶۴، الریاض النضرہ ۲/۲۱۵، صواعق محرقہ ص ۱۰۶، احقاق الحق ۷/۲۱۷)۔

اس کے علاوہ آپ برابر فرمایا کرتے تھے کہ "عدالت میں میرا اور علیؑ کا ہاتھ بالکل برابر ہے۔" (کنز العمال ۶/۱۵۲ حدیث نمبر ۲۵۳۹)

خود حضرت علیؑ فرماتے تھے کہ "خدا کی قسم کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں میں نہ جانتا ہوں کہ کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کب نازل ہوئی ہے اور کہاں نازل ہوئی ہے۔ اللہ نے مجھے دلِ دانا اور زبانِ صادق و ناطق عنایت فرمائی ہے۔"
(تاریخ الخلفاء ص ۱۸۵)

"مجھ سے کتاب خدا کے بارے میں دریافت کرو۔ میں ہر آیت کے بارے میں جانتا ہوں کہ دن میں نازل ہوئی ہے یا رات میں۔ میدان میں نازل ہوئی ہے یا پہاڑ پر۔"
(تاریخ الخلفاء ص ۱۸۵)

امام احمد بن حنبل کا ارشاد ہے کہ "اصحاب پیغمبرؐ میں کسی کے بارے میں اتنی آیتیں نازل نہیں ہوئی ہیں جتنی علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔" (مستدرک حاکم ص ۱۰۷)

ابن عباس نے بھی یہی بات ارشاد فرمائی ہے بلکہ یہاں تک فرمایا ہے کہ علیؑ کے بارے میں تین سو آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ اور کسی مقام پر یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا ذکر نہیں ہے مگر یہ کہ علیؑ صاحبان ایمان کے امیر اور رئیس ہیں۔ ابوبکر بھی شعر کہتے تھے اور عمر بھی۔ لیکن علیؑ سے بہتر کوئی نہ تھا۔ (ابن عساکر بہ نقل صواعق محرقہ ص ۷۶، تاریخ الخلفاء سیوطی)

خاتمہ کلام میں رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد گرامی ہی کافی ہے کہ "علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے۔ یہ دونوں اس وقت تک جدا نہ ہوں گے جب تک میرے پاس حوض کوثر پر وارد نہ ہو جائیں۔" (معجم صغیر و اوسط طبرانی بہ نقل تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۱۷۳)۔

ولایت علیؑ خالص دینی اور ایمانی مسئلہ ہے

وہ دیکھو رسول اکرمؐ اصحاب سے فرما رہے ہیں کہ" علیؑ باب حطہ ہے جو اس دروازہ سے داخل ہوگا وہ صاحب ایمان ہوگا اور جو نکل جائے گا وہ کافر ہوگا۔" (ینابیع المودۃ ص ۱۸۵۔ ۲۴۷۔ ۲۸۴، الجامع الصغیر ۲/ ۵۶، منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ۵/ ۳۰، صواعق محرقہ ص ۷۵)۔

دوسرا ارشاد ملاحظہ ہو۔" علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں۔ میرا پیغام یا میں پہونچاؤں گا یا علیؑ۔" (سنن ابن ماجہ ۱/ ۴۴ حدیث نمبر ۱۱۹، صحیح ترمذی ۵/ ۳۰۰، حدیث نمبر ۳۸۰۳، خصائص نسائی ص ۲۰، تاریخ ابن عساکر ۲/ ۳۷۸ حدیث نمبر ۸۷۵۔ ۸۸۰، مناقب خوارزمی، صواعق محرقہ ص ۱۲۰، الجامع الصغیر ۲/ ۵۶، مصابیح السنہ ۲/ ۲۷۵، اصول ابن اثیر ۹/ ۴۷۱، مشکوٰۃ ۳/ ۲۴۳)۔

ایک موقع پر اصحاب کے سامنے خود علیؑ سے خطاب کرکے فرمایا" یا علیؑ! جو مجھ سے جُدا ہو گیا وہ اللہ سے جُدا ہو گیا اور جو تم سے جُدا ہو گیا وہ مجھ سے جُدا ہو گیا۔" (مستدرک حاکم ۳/ ۱۴۶، ذخائر العقبیٰ ص ۶۶، مجمع الزوائد ۹/ ۱۳۵، تاریخ ابن عساکر ۲/ ۲۷۴، میزان ذہبی ۲/ ۱۸)۔

" میں ڈرانے والا ہوں اور علیؑ ہادی ہیں۔ یا علیؑ! تمھارے ہی ذریعہ میرے بعد ہدایت پانے والے ہدایت پائیں گے۔" تاریخ ابن عساکر ۲/ ۴۱۷، فصول مہمہ ص ۱۰۷، منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ۵/ ۴۴، تفسیر طبری ۱۳/ ۱۰۸، تفسیر ابن کثیر ۲/ ۵۰۲، تفسیر شوکانی ۳/ ۷۰، تفسیر رازی ۵/ ۲۷۱، مستدرک ۳/ ۱۲۹، در منثور ۴/ ۴۵، زاد المسیر ابن الجوزی ۴/ ۳۰۷، روح المعانی ۱۳/ ۹۷)۔

" میں اور علیؑ روز قیامت اس امت کے لئے حجت پروردگار ہوں گے۔" (تاریخ ابن عساکر ۲/ ۲۷۳ حدیث نمبر ۷۹۳۔ ۷۹۵، منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ۵/ ۹۴، مناقب ابن مغازلی، میزان ذہبی ۴/ ۱۲۸)۔

"دروازۂ جنت پر لکھا ہوا ہے" لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی اخو رسولہ"۔

(حلیۃ الاولیاء ۷/ ۲۵۶، مناقب ابن مغازلی ص ۹۱ حدیث ص ۱۳۴، مناقب خوارزمی ص ۸۸، مقتل الحسین خوارزمی ۱/ ۳۸، تذکرۃ خواص الامۃ ص ۲۲، ذخائر العقبیٰ ص ۶۶، المیزان ذہبی ۲/ ۷۶۔ ۳/ ۳۹۹، تاریخ ابن عساکر ۱/ ۱۱۹، منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ۵/ ۳۵، کنز العمال ۱۵/ ۱۲۱)۔

"ساق عرش پر لکھا ہوا ہے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ میں نے رسولؐ کی تائید اور نصرت علیؑ کے ذریعہ کی ہے"۔ (تاریخ ابن عساکر ۲/ ۲۵۳، مجمع الزوائد ۹/ ۱۲۱، حلیۃ الاولیاء ۳/ ۳۶، حاشیہ مسند احمد ۵/ ۳۵، الریاض النضرہ ۲/ ۲۲۷، فرائد السمطین ۱/ ۲۳۶)۔

ولی خدا اور خلیفۂ رسولؐ ہی بطل اسلام ہے

اسلام و کفر کی جنگوں کے درمیان ایک ستارہ نمودار ہوا اور وہی اسلام کا تنہا شہسوار قرار پایا جس کی مثال اولین و آخرین میں کہیں نہیں ہے۔

حضرت علیؑ نے آغاز جنگ جمل سے پہلے طلحہ اور زبیر سے کہا کہ ذرا عائشہ کو قسم دے کر دریافت کرو کہ کیا قریش میں کوئی رسول اکرمؐ سے مجھ سے زیادہ قریب تر تھا ہے۔ کیا میرا اسلام سب سے پہلے نہیں ہے؟۔ کیا میں نے اپنی تلوار اور اپنے نیزہ کے ذریعہ رسول اکرمؐ کو کفار عرب سے نہیں بچایا ہے"۔ (حلیۃ الاولیاء ۱/ ۶۳، شرح النہج ۹/ ۱۷۰، کفایۃ الطالب ص ۲۱۰، کنز العمال ۱۵/ ۲۶)۔

اسلام کا پہلا پرچم حمزہ کے ہاتھ میں دیا گیا۔ اس کے بعد ہر معرکہ میں پرچم اسلام یا حمزہ کے ہاتھ میں رہا یا علیؑ کے ہاتھ میں۔ (طبقات ابن سعد ۲/ ۸ - ۹ - ۲۹ - ۳۱ - ۴۹ - ۵۸ - ۵۹ - ۷۴ - ۱۰۶ - ۱۱۵)۔

بدر کے معرکہ میں سب سے پہلے میدان میں آنے والے علیؑ، حمزہ اور عبیداللہ

تھے۔ اس کے بعد ہر معرکہ میں علی فارسِ اول تھے۔ یہانتک کہ خیبر کے موقع پر رسول اکرمؐ نے خود اعلان فرمایا تھا کہ :

"کل اسے عَلَم دوں گا جو خدا و رسول کا محب اور محبوب ہوگا اور اللہ اسے دونوں ہاتھوں پر فتح عنایت کرے گا"۔

جس کے بعد صبح سویرے سب خدمت پیغمبرؐ اسلام میں آگئے اور سب کو یہ امید تھی کہ پرچم اسلام ہمیں ملے گا۔ لیکن حضورؐ نے فرمایا کہ علی بن ابی طالب کہاں ہیں؟

لوگوں نے کہا کہ ان کی آنکھوں میں تکلیف ہے۔

فرمایا، انھیں بلاؤ۔

اس کے بعد آپ نے دعا فرمائی اور ان کی آنکھیں اس طرح صحیح و سالم ہوگئیں جیسے کبھی کوئی تکلیف نہ رہی ہو۔ اور آپ نے انھیں پرچمِ اسلام دے دیا اور رب العالمین نے ان کے دونوں ہاتھوں پر فتح عنایت فرما دی۔

(مسلم و بخاری وطبرانی و دیگر مورخین واصحاب سنن)

اس جنگ میں حضرت علیؑ نے قلعہ کے دروازہ کو اکھاڑ کر سپر بنا لیا تھا اور جب تک معرکہ فتح نہیں ہوگیا اپنے ہاتھ میں رکھا۔ فتح کے بعد اسے دور پھینک دیا تو آٹھ آدمی مل کر بھی حرکت نہ دے سکے۔ (مسلم، بخاری۔ تاریخ الخلفاء ص ۱۶۷)

غزوۂ خندق میں علیؑ کے علاوہ کون تھا جس نے عمرو کے رجز کا جواب دیا ہو اور اس کا خاتمہ کر دیا ہو۔ (طبقات ابن سعد ۶۸/۲)

غرض بدر، احد، خیبر، حنین کسی بھی معرکہ سے دریافت کرو کہ علیؑ نے کب فرار اختیار کیا ہے یا آل محمدؐ نے کب نصرت اسلام میں کوتاہی کی ہے۔ کوئی شخص بھی علیؑ جیسے یا علیؑ سے بہتر جہاد کا دعویٰ کرے تو اس سے بڑا جھوٹا کوئی نہیں ہے۔

علیؑ کے مجاہدات نے انھیں شجاعت کا ایک نجم درخشاں بنا دیا تھا اور وہ اسلام کے واحد شہسوار تھے جن کا نام ہر معرکہ میں لیا جاتا ہے۔

کوئی بتلائے کہ عاص بن سعد بن العاص، حنظلہ بن ابی سفیان، عاص بن ہشام بن مغیرہ

اور عمر بن الخطاب کے ماموں کا قاتل علیؑ کے علاوہ کون تھا۔؟ (طبقات ۲/۱۷)

عتبہ، شیبہ، ولید بن عتبہ جیسے سرداران بنی امیہ کو تلوار کے گھاٹ کس نے اتارا تھا، کیا حمزہ، علیؑ، عبید اللہ کے علاوہ کوئی اور تھا اور یہ سب خاندان رسالت کے افراد ہیں جس کے نتیجہ میں اس خاندان کو مستقل عداوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

لیکن پیغمبر اسلامؐ نے علیؑ کے جہاد کی عظمت کا بہر حال اعلان کر دیا کہ خندق کے دن علیؑ کی ضربت قیامت تک امت کے اعمال سے افضل و بہتر ہے۔ (فرائد السمطین ۱/۲۵۹، مناقب خوارزمی ص ۵۸، شواہد التنزیل ۲/۸، مستدرک حاکم ۳/۲۷)

فصل چہارم

ولیؑ خدا اور خلیفۂ رسولِ خداؐ کا عقدِ آسمانی

حضرت فاطمہؑ بنت محمدؐ سیدۃ نساء العالمین اور محبوب ترین اولاد پیغمبرؐ تھیں۔
(استیعاب ابن عبدالبر برحاشیہ اصابہ ۴/۳۷۷، اصابہ ۴/۳۷۸، اسد الغابہ ۵/۵۳۷، ذخائر العقبیٰ ص ۴۴، ینابیع المودۃ)۔

ان کی رضا رضائے پیغمبرؐ اور ان کی ناراضگی پیغمبر اسلامؐ کی ناراضگی تھی۔
(الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ ص ۵)

ان کے رشتہ کی آرزو ہر صاحب وجاہت کے دل میں تھی اس لئے کہ ان میں وہ تمام خصوصیات وکمالات موجود تھے جو ایک عورت میں ہونے چاہئیں۔

چنانچہ ان کا پیغام ابوبکر نے بھی دیا اور عمر بن الخطاب نے بھی اور رسول اکرمؐ نے سب کو رد کر دیا اور فرمادیا کہ میں حکم خدا کا منتظر ہوں۔ (کفایۃ الطالب ص ۳۰۲-۳۰۴، مجمع الزوائد ۹/۲۰۵-۲۰۶، خصائص نسائی ص ۱۱۴، صواعق محرقہ ص ۱۳۹، نظم درر السمطین ص ۱۸۴، ذخائر العقبیٰ ص ۲۷، مناقب ابن مغازلی ص ۳۴۶، تذکرۃ الخواص ص ۳۰۶، اسد الغابہ ۱/۳۸، اصابہ ۱/۳۴۷، جامع الاصول ۹/۴۷۴، شرح النہج ۲/۲۶۱، سیرۃ النبی زینی دحلان برحاشیہ سیرت حلبیہ ۲/۷، تاریخ بغداد ۱/۳۶۳، طبقات ابن سعد ۲/۲۴۰)۔

بشارت

ایک دن بشارت الٰہی نازل ہوگئی اور پیغمبر اکرمؐ نے اصحاب کو خبر سنادی کہ "میرے پاس پروردگار کی طرف سے میرے بھائی اور ابن عم اور میری دختر کے بارے میں یہ بشارت آئی ہے کہ

میں فاطمہؑ کا عقد علیؑ سے کردوں"۔ (مناقب خوارزمی ص ۲۴۶، مقتل الحسین خوارزمی ۱/۶۰، ینابیع المودۃ ص ۲۰۴، اسد الغابہ ۱/۲۰۶، صواعق محرقہ ص ۱۷۱)۔

یہ وہ بشارت تھی جس کا ذکر حضور اکرمؐ برابر فاطمہؑ اور اصحاب سے کرتے رہے۔

کبھی فاطمہؑ سے فرمایا "کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ پروردگار نے تمام اہل زمین میں سے دو افراد کا انتخاب کیا ہے۔ ایک تمہارا باپ ہے اور ایک کو تمہارا شوہر بنادیا ہے"۔ (تاریخ ابن عساکر ۱/۲۴۹، تذکرۃ الخواص ص ۳۰۸، کنز العمال ۱۵/۹۵، الریاض النضرۃ ۲/۲۴۰)

کبھی فاطمہؑ نے لوگوں کے طنز کا ذکر کیا کہ تمہارے باپ نے تمہارا عقد ایک مرد فقیر سے کردیا ہے تو فرمایا کہ "فاطمہؑ! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ اللہ نے تمام اہل زمین میں سے دو افراد کا انتخاب کیا ہے۔ ایک تمہارا باپ ہے اور ایک تمہارا شوہر"۔ (مستدرک ۲/۱۲۹، تاریخ ابن عساکر ۱/۲۴۹، تذکرۃ الخواص ص ۳۰۹، ینابیع المودۃ ص ۲۱۴، کفایۃ الطالب ص ۲۹۷، کنز العمال ۶/۳۹۱ - ۵/۹۵، احقاق الحق ۵/۲۶۶، تاریخ بغداد ۴/۱۹۵ - ۱۹۶)

ایک مرتبہ سرکار دو عالمؐ فاطمہؑ کی بیماری میں عیادت کے لئے تشریف لائے اور فرمایا کہ تم اپنے کو کیسا پارہی ہو؟ عرض کی کہ میرا رنج۔ میرا فاقہ۔ میری بیماری تینوں شدید ہیں۔

فرمایا کہ کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ میں نے تمہارا عقد ایسے شخص سے کیا ہے جو سب سے پہلے اسلام لانے والا۔ سب سے زیادہ صاحب علم اور سب سے زیادہ حلیم اور بردبار ہے"۔ (نظم درر السمطین ص ۱۸۵، شرح النہج ۳/۲۶۱، منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ۵/۳۱، الریاض النضرۃ ۲/۵۵)

ذرّیت مبارکہ

پیغمبر اکرمؐ نے مسلمانوں کے درمیان اعلان فرمادیا کہ "اللہ نے ہر نبی کی ذریت کو اس کے صلب سے قرار دیا ہے اور میری ذرّیت کو صلب علیؑ سے قرار دیا ہے"۔ (کنز العمال ۶/۱۵۲ حدیث نمبر ۵۲۱۰)

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا کہ "ہر لڑکی کی اولاد اس کے شوہر والوں کی طرف منسوب

ہوتی ہے مگر فاطمہؑ کی اولاد میری اولاد ہے اور میں ہی ان کا باپ ہوں"۔ (صواعق محرقہ ص ۱۱۲، مستدرک حاکم ۳/۱۶۴ مع اعلان صحت حدیث)

ایک موقع پر حضرت علیؑ سے فرمایا کہ "یا علیؑ! تم میرے بھائی اور میری اولاد کے باپ ہو"
(مناقب خوارزمی ص ۲۷)

ایک موقع پر علیؑ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ "یہ میرا بھائی۔ ابن عم اور داماد ہے اور میری اولاد کا باپ ہے"۔ (الغدیر ۳/۱۱۹)

یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کی ذرّیت فاطمہؑ میں منحصر ہو بلکہ اس حقیقت سے ساری امت باخبر ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی اولاد فاطمہ زہراؑ کی اولاد کے علاوہ کہیں نہیں ہے۔ اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ آپ نے مجمع اصحاب میں حسنینؑ کو دیکھ کر فخر سے فرمایا کہ یہ حسنؑ میرا فرزند ہے۔ یہ حسینؑ میرا فرزند ہے۔ اللہ نے ان کا نام اپنے پاس سے رکھا ہے اور یہ دونوں جوانان جنت کے سردار اور میرے پھول ہیں۔

اہل دنیا نے بیحد کوشش کی کہ نسلِ پیغمبرؐ ختم ہو جائے، امام حسنؑ کو زہر دیا۔ امام حسینؑ کو شہید کیا۔ لیکن اس کے باوجود اس مبارک نسل سے بارہ۱۲ امام منظر عام پر آئے اور ان کا آخری آجتک زندہ و سلامت ہے۔

ہم منزل اور خلیفہ

یہ بھی ایک عنایت الٰہیہ تھی کہ مالک کائنات نے نبی اور علیؑ دونوں کو ایک منزل پر جمع کر دیا اور تمام امت کی سماعت و بصارت کو اس نکتہ کی طرف متوجہ کر دیا تاکہ ان کا امتیاز واضح رہے اور کوئی مقابلہ کا تصوّر نہ کرے۔

"پیغمبر اسلامؐ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ میں نے مسجد میں علیؑ کو ساکن کر دیا اور باقی افراد کو باہر نکال دیا تو بعض لوگوں کو یہ شبہ ہے کہ یہ کام میں نے اپنے دل سے کیا ہے۔ خدا کی قسم نہ میں نے کسی کو نکالا ہے اور نہ ساکن بنایا ہے۔ یہ سب کام پروردگار کا ہے۔ اس نے جناب موسیٰؑ کی طرف وحی کی تھی کہ اپنی قوم کے لئے شہر میں مکانات بناؤ اور انھیں قبلہ رُخ قرار دو اور نماز قائم

کرد اور علیؑ کی نسبت میرے لئے ایسی ہی ہے جیسے موسیٰ کے لئے ہارون کی تھی۔ وہ میرا بھائی ہے اور کسی کو مسجد میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہنے کا حق نہیں ہے سوائے علیؑ کے۔" (المراجعات ص ۱۶۱-۱۷۵، ینابیع المودہ باب ۸ افضائل اہلبیتؑ)

رسول اکرمؐ نے اپنے چچا عباس کو مسجد سے نکلنے کا حکم دیا تو انھوں نے کہا کہ آپ مجھے نکال رہے ہیں اور علیؑ کو ساکن بنا رہے ہیں؟

فرمایا خدا کی قسم نہ میں نے آپ کو نکالا ہے اور نہ انھیں ساکن بنایا ہے۔ یہ سب کارِ خدا ہے جسے میں نے اس کے حکم سے انجام دیا ہے"۔ (سنن ابن ماجہ ۱/۹۲، صحیح ترمذی، سنن نسائی، کنز العمال ۶/۱۵۲ حدیث نمبر ۲۵۲۱، مسند احمد ۴/۱۶۴-۱۵۱/)

بعض اصحاب کے دروازے مسجد کے اندر کھلتے تھے۔ آپ نے ان سے بھی فرمایا کہ علیؑ کے دروازے کے علاوہ سارے دروازے بند کر دو۔

لوگوں نے اس پر چہ میگوئیاں کیں تو آپ نے منبر پر جا کر حمد و ثنائے الٰہی کے بعد فرمایا کہ میں نے علیؑ کے دروازہ کے علاوہ سب کے دروازوں کو بند کرنے کا حکم دیا تو تم لوگوں نے اعتراضات کئے ہیں تو سنو میں نے نہ کسی کا دروازہ کھولا ہے اور نہ بند کیا ہے۔ میں نے صرف حکم خدا کا اتباع کیا ہے"۔ (مسند احمد ۴/۳۶۹، منتخب کنز العمال ۵/۳۹ برحاشیہ مسند احمد)

"یاد رکھو کہ نہ میں نے تمھیں اپنی مرضی سے نکالا ہے اور نہ انھیں باقی رکھا ہے۔ میں ایک بندۂ مامور ہوں۔ مجھے جو حکم دیا جاتا ہے اس پر عمل کرتا ہوں میں صرف وحیِ خدا کا پابند ہوں"۔ (منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ۵/۲۹)

مزید ارشاد فرمایا کہ اللہ نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ میرے لئے ایک پاکیزہ مسجد بناؤ جس میں صرف تم اور ہارون رہو اور بس! اور پھر میری طرف وحی فرمائی کہ میں ایک مسجد تعمیر کروں جس میں میں رہوں اور علیؑ۔ اور بس!" (صواعق محرقہ ص ۱۰۶)

علیؑ وصی پیغمبرؐ

پیغمبر اسلامؐ نے بار بار اس امر کی تاکید فرمائی ہے کہ علیؑ میرے وصی ہیں۔

کبھی فرمایا :

"یہ میرا بھائی ۔ وصی اور خلیفہ ہے"۔

اور اس سلسلہ میں حدیث دار مشہور ترین آثار میں ہے ۔ (طبری ۲/ ۳۱۹۔ ۳۲۱، تاریخ کامل ۲/ ۶۲۔ ۶۳، سیرت حلبیہ ۱/ ۳۱۱، مسند احمد ۱/ ۱۱۱۔ ۱۵۹، تاریخ ابن عساکر ۱/ ۸۵)

کبھی فرمایا "ہر نبی کا ایک وصی و وارث ہوتا ہے اور علیؑ میرا وصی و وارث ہے"۔ (تاریخ ابن عساکر ۳/ ۵، مناقب ابن مغازلی ص ۲۰۰، مناقب خوارزمی ص ۴۲، ذخائر العقبیٰ۔ المیزان ذہبی ۲/ ۲۷۳، ینابیع المودۃ ص ۲۳۲، ۲۴۸)۔

"ہر نبی کا ایک وصی و وارث ہوتا ہے اور میرا وصی و وارث ہے علی"۔ (ابن عساکر ۳/ ۵، مناقب خوارزمی ص ۴۲، مناقب ابن مغازلی ص ۲۰۰، میزان ذہبی ۲/ ۲۷۳)

"میرا وصی، میرا محرم اسرار، میرے بعد تمام افراد سے بہتر، میرے وعدوں کو پورا کرنے والا، میرے قرض کا ادا کرنے والا علیؑ بن ابی طالب ہے"۔ (مجمع الزوائد ۹/ ۱۱۳، کنز العمال ۶/ ۱۵۴، مسند احمد ۵/ ۳۲)۔

انس بن مالک سے فرمایا "انس! جو سب سے پہلے اس دروازہ سے داخل ہوگا ــ وہ امیرالمومنین، سید المسلمین، قائد الغر المحجلین اور خاتم الوصیین ہوگا۔ جس کے بعد علیؑ داخل ہوئے۔ (حلیۃ الاولیاء ۱/ ۶۳، شرح النہج ۹/ ۱۶۹، مناقب خوارزمی ص ۴۲، کفایۃ الطالب ص ۲۱۲، میزان الاعتدال ذہبی ۱/ ۶۴، فضائل الخمسہ ۲/ ۲۵۴، مطالب السئول ابن طلحہ ص ۲۱)۔

جناب فاطمہؑ سے خطاب کر کے فرمایا "کیا تمھیں نہیں معلوم ہے کہ مالک کائنات نے ساری زمین پر نگاہ کر کے تمھارے باپ کا انتخاب کیا ہے اور اسے نبی بنا دیا ہے اور پھر تمھارے شوہر کا انتخاب کیا ہے اور میری طرف وحی فرمائی ہے تو میں نے ان سے تمھارا عقد کر دیا ہے اور انھیں وصی بنا لیا ہے"۔ (کفایۃ الطالب ص ۲۹۶، مجمع الزوائد ۸/ ۲۵۳، فصول مہمہ ص ۲۸۱، مناقب ابن مغازلی ص ۱۰۱، ینابیع المودۃ ص ۹۲، الغدیر ۳/ ۲۳، ملحق المراجعات ص ۲۴۴)۔

مرسل اعظمؐ کے انتقال کے بعد امام حسنؑ نے بھی اسی وصایت سے استدلال کیا تھا اور فرمایا تھا کہ "میں پیغمبرؐ کا بھی فرزند ہوں اور وصی پیغمبرؐ کا بھی فرزند ہوں"۔ (ذخائر العقبیٰ ص ۱۳۸)

وصایت کا یہ مسئلہ اس قدر مشہور ہوا کہ عربی ادب میں نثر و نظم دونوں میں شامل ہو گیا۔
(وقعۃ صفین نصر بن مزاحم ص ۲۲۷-۳۸۲-۴۳۶۔ مناقب خوارزمی ص ۳۸، ۶۵-۱۳۴-۲۸۸، مروج الذہب مسعودی ۲/۲۳۸، العقد الفرید ۴/۱۱۴، فصول مہمہ ص ۸)۔

جابر بن عبداللہ انصاری تو یوں کہا کرتے تھے کہ "مجھ سے وصی الاوصیاء علیؑ نے بیان کیا ہے"۔ (میزان الاعتدال ۱/۸۳، ملحق المراجعات ص ۲۸۴)

انکار وصیّت

صرف بخاری اور مسلم نے اس وصیت کا انکار کیا ہے اور اپنی دلیل عائشہ کی اس روایت کو قرار دیا ہے کہ پیغمبرؐ کا انتقال میرے زانو پر ہوا ہے اور انھوں نے کوئی وصیت نہیں کی ہے۔

حالانکہ تاریخی اعتبار سے یہ بات ثابت نہیں ہے اور نہ منطقی طور پر یہ بات صحیح ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ وقت آخر پیغمبرؐ کا سر علیؑ کی آغوش میں تھا اور اصحاب کی طرف سے طرح طرح کی سازشیں ہو رہی تھیں جس کے نتیجہ میں پیغمبرؐ کو قلم دوات تک نہ مل سکا اور وہ نہ لکھ سکے جو لکھنا چاہتے تھے۔

خود بخاری ہی نے نقل کیا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا کہ حضور نے وقت آخر وصیت فرمائی تھی کہ مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال دیا جائے اور وفود کو اسی طرح اجازت دی جائے جس طرح میں دیا کرتا تھا اور پھر خاموش ہو گئے۔ یا تیسری بات میں بھول گیا۔ (صحیح بخاری کتاب النبی الی کسریٰ و قیصر باب مرض النبی و وفاتہ ۱۳۷/۵ دار الفکر)

دوسری طرف رسول اکرمؐ کے بیت عائشہ میں مبینہ طور پر انتقال نہ کرنے کی دلیل خود عمر بن الخطاب کا قول ہے کہ ان کے زمانہ میں صحابہ کے اجتماع میں کعب نے یہ سوال اٹھایا کہ پیغمبرؐ کے آخری کلمات کیا تھے؟ تو عمر نے کہا کہ علیؑ سے دریافت کرو۔ اور پھر علیؑ نے اس کی تفصیل یوں بیان کی کہ آپ نے وقت آخر فرمایا کہ میرے بھائی کو بلاؤ تو لوگوں نے مجھے بلایا اور آپ نے قریب بٹھا کر گفتگو شروع کی۔ یہاں تک کہ باتیں کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ (طبقات ۲/۲۶۲ حدیث نمبر ۱۱۰۷، کنز العمال ۴/۱۵۵ حدیث نمبر ۱۱۰۷،

۲۹۲/۶ حدیث نمبر ۱۰۰۹، ۴/ ۵۵ حدیث نمبر ۱۱۰۶، ۴/ ۵۵ حدیث نمبر ۱۱۰۸، شرح النہج ۲/ ۱۹۶)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جس انداز وفات پر انکار وصیت کی بنیاد ہے وہ انداز وفات ہی ثابت نہیں ہے تو انکار وصیت کی کیا حیثیت ہے۔؟

ولیِ خدا اور خلیفۂ رسولؐ کے چند امتیازات

ایک دن سرکار نے مجمع اصحاب میں حضرت علیؑ سے فرمایا کہ "میرا امتیاز نبوت ہے جس میں تم شریک نہیں ہو اور تمہارے خصوصیات سات ہیں جن میں قریش کا کوئی آدمی شریک نہیں ہے۔ تم سب سے پہلے ایمان لانے والے۔ سب سے زیادہ عہد خدا کے وفا کرنے والے۔ سب سے بہتر امر خدا کے ساتھ قیام کرنے والے۔ برابر سے تقسیم کرنے والے، رعایا میں سب سے زیادہ انصاف کرنے والے۔ قضایا کو سب سے بہتر درک کرنے والے اور اللہ کے نزدیک سب سے عظیم مرتبہ رکھنے والے ہو"۔

(حلیۃ الاولیاء ص ۶۵ - ۶۶، تاریخ ابن عساکر ۱/ ۱۱۷ حدیث ص ۱۶۰، الریاض النضرۃ ۲/ ۲۶۲، مطالب السئول ۱/ ۹۵، شرح النہج ۹/ ۱۷۳، مناقب خوارزمی ص ۱۷، میزان الاعتدال ۱/ ۳۱۳، کفایۃ الطالب ص ۲۷۰، الغدیر ۳/ ۹۶، ینابیع المودۃ ص ۳۱۵، منتخب الکنز برحاشیہ مسند احمد ۵/ ۳۴، فرائد السمطین ۱/ ۲۲۳ حدیث نمبر ۱۷۴)۔

ایک دن آپؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ "علیؑ قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے اور یہ دونوں حوض کوثر تک جدا نہیں ہو سکتے ہیں"۔ (مناقب خوارزمی ص ۱۱۰، معجم صغیر طبرانی ۱/ ۵۵، کفایۃ الطالب ص ۳۹۹، تاریخ الخلفاء ص ۱۷۳، اسعاف الراغبین بر حاشیہ نور الابصار ص ۱۵۷، نور الابصار ص ۷۳، الغدیر ۳/ ۱۸۰، ینابیع المودۃ ص ۹۰ - ۱۸۵، غایۃ المرام ص ۵۴۰، الجامع الصغیر سیوطی ۲/ ۵۶)۔

دوسری مرتبہ فرمایا کہ "علیؑ حق کے ساتھ ہے اور حق علیؑ کے ساتھ ہے۔ اور دونوں حوض کوثر تک جدا نہ ہوں گے"۔ (تاریخ بغداد ۱۴/ ۳۲۱، تاریخ ابن عساکر ۳/ ۱۱۹، حدیث نمبر ۱۱۶۲، غایۃ المرام ص ۵۳۹، الامامۃ والسیاسۃ ۱/ ۷۳، منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ۵/ ۳۰)

تحفظ ولی و خلیفۂ رسولؐ

حضورؐ نے مجمع اصحاب میں علیؑ سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا "یا علیؑ! جو مجھ سے جُدا ہو گیا وہ خدا سے جُدا ہو گیا اور جو تم سے جُدا ہو گیا وہ مجھ سے جُدا ہو گیا۔" (مستدرک ۳/۱۴۶، ذخائر العقبیٰ ص ۶۶، مجمع الزوائد ۹/۱۳۵، تاریخ ابن عساکر ۲/۲۶۸ حدیث نمبر ۷۸۹، مناقب ابن مغازلی ص ۲۴۱، الریاض النضرہ ۲/۲۲۰، ینابیع المودۃ ص ۹۱، میزان ذہبی ۲/۱۸)

"جس نے علیؑ کو بُرا بھلا کہا اُس نے مجھے بُرا بھلا کہا۔" (خصائص نسائی ص ۲۴، مناقب خوارزمی ص ۸۲، مجمع الزوائد ۹/۱۳۰، تاریخ ابن عساکر ۲/۱۸۴، تاریخ الخلفاء ص ۷۳، مشکوٰۃ المصابیح ۲/۲۴۵، الفتح الکبیر ۳/۱۹۶، منتخب الکنز برحاشیہ مسند احمد ۵/۳۰)

"جس نے علیؑ کو گالیاں دیں اس نے مجھے گالیاں دیں۔ اور جس نے مجھے بُرا کہا اس نے خدا کو بُرا کہا اور جس نے خدا کو بُرا کہا خدا اسے منہ کے بھل جہنم میں گرا دے گا۔" (ذخائر العقبیٰ ص ۶۶، مناقب خوارزمی ص ۸۱-۸۲، مناقب ابن مغازلی ص ۸۳، فصول مہمہ ص ۱۱۱، الریاض النضرہ ۲/۲۱۹)

"جس نے علیؑ کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔" (مستدرک حاکم ۳/۱۲۲، تلخیص المستدرک ذہبی بذیل مستدرک ۳/۱۲۳، تاریخ ابن عساکر ۱/۳۸۹، شواہد التنزیل ۲/۹۸، مناقب ابن مغازلی ص ۵۲، استیعاب برحاشیہ اصابہ ۳/۳۷، ذخائر العقبیٰ ص ۶۵، صواعق محرقہ ص ۷۳، انساب الاشراف ۲/۱۴۶، تاریخ الخلفاء سیوطی، ملحق المراجعات ص ۱۵۱-۱۵۲)

"جس نے علیؑ سے محبت کی اس نے مجھ سے محبّت کی اور جس نے علیؑ سے دشمنی کی اُس نے مجھ سے دشمنی کی۔" (الاستیعاب برحاشیہ اصابہ ۳/۳۷، میزان ذہبی ۲/۱۲۵، مناقب ابن مغازلی ص ۱۰۹، الریاض النضرۃ ۲/۱۶۵، مسند احمد ۵/۳۰)

فصل پنجم

ولیِّ خدا کی تاجپوشیُ خلافت

۱۔مناسبت حجۃ الوداع

سرکارِ دو عالمؐ نے اپنے اصحاب اور آنے والے وفود سب کو اشارہ دے دیا تھا کہ یہ حج میری زندگی کا آخری حج ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ہر طرف تیاریاں شروع ہوگئیں کہ اس طرح حج بیت اللہ اور صحابیت دونوں شرف حاصل ہوجائیں گے اور ۹۰ ہزار یا ایک لاکھ ۱۴ ہزار یا ایک لاکھ ۲۰ ہزار افراد جمع ہوگئے اور یہی عدد حضورؐ کیساتھ غدیر خم میں بھی رہا۔ (تذکرۃ الخواص ص ۳۰، السیرۃ الحلبیہ ۳/ ۲۵۷، سیرۃ النبی زینی دحلان برحاشیہ سیرت حلبیہ ۳/ ۳، الغدیر ۱/ ۹)

۲۔مکان تاجپوشی

حذیفہ بن اسید الغفاری کا بیان ہے کہ جب رسول اکرمؐ حجۃ الوداع سے واپس ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ بطحاء کی جھاڑیوں کے قریب قافلہ نہ اترے اور اس کے بعد کانٹوں کی صفائی کا حکم دیا اور نماز کے بعد خطبہ ارشاد فرمایا۔ (طبرانی معجم کبیر)

زید بن ارقم کی روایت ہے کہ جب حجۃ الوداع سے واپسی پر مقام غدیر خم پر پہونچے تو یہ واقعہ پیش آیا۔

براء ابن عازب یوں بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اکرمؐ کے ساتھ تھے جب مقام غدیر خم پر اترے تو نماز جماعت کے لئے آواز دی گئی اور آپ نے دو درختوں کے درمیان جگہ بنائی۔

سعد بن ابی وقاص کے الفاظ ہیں "ہم نے روز جمعہ رسول اکرمؐ کا یہ بیان سنا کہ آپ نے

علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر خطبہ ارشاد فرمایا۔۔۔۔

دوسری روایت سعد میں وارد ہوا ہے کہ ہم رسول اکرمؐ کے ساتھ تھے جب آپ منزل غدیر خم پر پہونچے تو توقف فرمایا۔ آگے والے پیچھے آئے، پیچھے والوں کا انتظار ہوا جب سب جمع ہو گئے تو آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس تاجپوشی کی منزل غدیر خم کا میدان ہے۔

نصب خلافت کے لئے حکم الٰہی

اہل مدینہ و اطراف اس حقیقت سے خوب باخبر تھے کہ ولی خدا اور خلیفۂ رسولؐ حضرت علیؑ ہیں۔ اس حقیقت کا اندازہ مسلسل تصریحات پیغمبرؐ سے ہو چکا تھا اور آپ افراد اور جماعات کے سامنے اس امر کی برابر تکرار فرما چکے تھے۔

مدینہ اسلامی حکومت کا دار الحکومت تھا اور اہل مدینہ و اطراف ہی اس بات کے قانونی مجاز تھے کہ ولیِ خدا اور خلیفۂ رسولؐ کی تعیین کریں اس لئے پروردگار نے چاہا کہ ایک مرتبہ اجتماعی طور پر یہ بات واضح ہو جائے کہ حاکم اسلامی اور خلیفۂ رسولؐ علیؑ بن ابی طالب ہیں۔ چنانچہ قدرت نے اس امر کے لئے حجۃ الوداع کا انتخاب کیا کہ یہ آخری حج ہے اور اس کے واقعات فراموش نہیں کئے جا سکتے ہیں۔

پھر پانی سے قریب مقام کا انتخاب فرمایا کہ پانی زندگی کا راز اور جزیرۃ العرب کی روح حیات ہے۔

مکان بھی خُم نام کا تھا جس کا دوسرا کوئی ہمنام پورے عرب میں نہیں تھا۔

لیکن مشکل یہ تھی کہ اتنے اہم مسئلہ کا اعلان اتنے عظیم مجمع میں مختلف قسم کے سوالات، احتمالات اور شبہات کا منشا ہو سکتا تھا۔ اس لئے سرکار دو عالمؐ حکم الٰہی کی تعمیل کے لئے ذہنی طور پر تیاری فرما رہے تھے کہ قدرت نے آپ کے اطمینان قلب اور جوازِ موقف کے اثبات کے لئے آیۂ تبلیغ نازل فرما دی۔ جس کا کھلا ہوا مفہوم یہ تھا کہ رسالت کا مستقبل اسی تبلیغ سے وابستہ ہے۔ آیت ذی الحجہ کی اٹھارہ تاریخ کو مقام غدیر خم میں نازل ہوئی اور حضورؐ

وہیں علیؑ کو ولی۔ مولا۔ خلیفہ اور پرچم ہدایت اسلام نامزد کر دیا۔ یہ واقعہ پنجشنبہ کے دن کا ہے۔ (تاریخ ابن عساکر ۲/ ۸۶، فتح البیان صدیق حسن خاں ۳/ ۶۳، شواہد التنزیل ۱/ ۱۸۷ حدیث نمبر ۲۴۳۔ ۲۵۰، اسباب النزول ص ۱۱۵، درمنثور ۲/ ۲۹۸، فتح القدیر شوکانی ۲/ ۶۰، مطالب السئول ۱/ ۴۴، فصول مہمہ ص ۲۵، ینابیع المودۃ ص ۱۲۰، ۲۴۹، الملل والنحل شہرستانی ۱/ ۶۳، الفصل ابن حزم ۱/ ۲۲۰، فرائد السمطین ۱/ ۱۵۸، الغدیر ۱/ ۲۱۴، تفسیر نیشاپوری ۶/ ۱۹۴، تفسیر القرآن عبدالوہاب بخاری تفسیر آیت مودت، اربعین جمال الدین الشیرازی مفتاح النجا بدخشی ص ۴۱، روح المعانی ۲/ ۲۴۹، المنار ۶/ ۴۶۳، ارجح المطالب ص ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۵۶۷۔ ۵۷۰۔

نص ولایت وخلافت

۱۔ روایت حذیفہ بن اسید الغفاری (معجم کبیر طبرانی)

رسول اکرمؐ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ ایہا الناس! مجھے خدائے لطیف وخبیر نے خبر دی ہے کہ ہر نبی کی زندگی سابق نبی سے نصف رہی ہے لہٰذا امکان ہے کہ اب مجھے بُلا لیا جائے اور میں داعی اجل کو لبیک کہہ دوں۔ میں بھی مسئول ہوں اور تم بھی مسئول ہو۔ اب تمہارا کہنا کیا ہے۔؟

سب نے عرض کی کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے تبلیغ کی ہے۔ کوشش کی ہے اور نصیحت فرمائی ہے۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔

فرمایا کیا تم لوگ اس امر کی گواہی نہیں دیتے ہو کہ خدا وحدہٗ لاشریک ہے۔ محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ جنّت و جہنم۔ موت و حشر سب برحق ہیں۔ قیامت آنے والی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے اور سب قیامت کے دن قبروں سے نکالے جائیں گے۔

سب نے عرض کی بیشک ہم گواہی دیتے ہیں۔

فرمایا خدایا! تو گواہ رہنا۔

اس کے بعد فرمایا کہ ایہا الناس! اللہ میرا مولا ہے اور میں صاحبانِ ایمان کا مولا ہوں اور ان کے نفوس سے اولیٰ ہوں اور جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ مولا ہے۔ خدایا!

جو اس سے محبت کرے اس سے محبت کرنا اور جو اس سے دشمنی کرے اس سے دشمنی کرنا۔

"ایہا الناس! میں تم سے پہلے جا رہا ہوں اور تم سب میرے پاس حوض کوثر پر وارد ہوگے۔ اس وقت میں تم سے ثقلین کے بارے میں سوال کروں گا لہٰذا اس کا خیال رکھنا کہ میرے بعد ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے۔ ان میں ثقل اکبر کتاب خدا ہے۔ وہ ریسمان ہدایت جس کا ایک سرا خدا کے پاس ہے اور ایک تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ اس سے متمسک رہو۔ نہ گمراہ ہو اور نہ تبدیلی پیدا کرو۔ دوسرے میری عترت اور اہلبیتؑ ہیں۔ خدائے لطیف و خبیر نے خبر دی ہے کہ یہ دونوں اس وقت تک جدا نہ ہوں گے جب تک حوض کوثر پر وارد نہ ہوں" (صواعق محرقہ۔ مجمع الزوائد ۹/۱۶۴، تاریخ ابن عساکر ۲/۴۵، کنز العمال ۱/۱۶۸ حدیث نمبر ۹۵۹، الغدیر ۱/۲۶-۲۷، عبقات الانوار حدیث ثقلین ۱/۲۰۲، نوادر الاصول حکیم ترمذی ص ۲۸۹ (افسوس کہ دست تحریف نے کتاب سے اس حدیث کو نکال دیا ہے جب کہ درخشی نے نزل الابرار ص ۱۸ پر اسی کتاب کے حوالے سے مکمل حدیث نقل کی ہے)۔ ینابیع المودۃ ص ۳۷، فصول مہمہ ص ۲۹، مناقب ابن مغازلی ص ۱۶ حدیث نمبر ۲۳، کنز العمال ۱/۱۶۸ حدیث نمبر ۹۵۸ بروایت زید)

۲۔ روایت زید بن ارقم

رسول اکرمؐ حجۃ الوداع سے واپس ہوئے منزل غدیر خم پر نازل ہوئے تو زمین کو صاف کر کے خطبہ ارشاد فرمایا:

"گویا کہ مجھے بلایا جا رہا ہے اور میں لبیک کہنے والا ہوں اور میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں جن میں ایک دوسرے سے بزرگ تر ہے۔ ایک کتاب خدا اور دوسرے میری عترت و اہلبیت۔ اس کا خیال رکھنا کہ ان کے سلسلہ میں تمہارا برتاؤ کیا ہوتا ہے۔ یہ آپس میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہانتک کہ میرے پاس حوض کوثر پر وارد ہوں۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ میرا مولا ہے اور میں ہر مومن کا مولا ہوں۔ اور پھر علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ بھی ولی ہے۔ خدایا!

جو اس سے محبت کرے اس سے محبت کرنا اور جو اس سے دشمنی کرے اس سے دشمنی کرنا۔"

(خصائص نسائی ص ۲۱، مناقب خوارزمی ص ۹۳، ینابیع المودۃ ص ۳۷، الغدیر ۱/ ۳۰، کنز العمال ۱۵/ ۹۱ حدیث نمبر ۲۵۵، عبقات الانوار حدیث ثقلین ۱/ ۱۱۷-۱۲۱-۱۴۴-۱۵۲-۱۶۱)

۳۔ روایت براء بن عازب

"ہم رسول اکرمؐ کے ہمراہ تھے۔ جب مقام غدیر پر نازل ہوئے تو نماز جماعت کے لئے بلایا گیا۔ رسول اکرمؐ نے درختوں کے درمیان نماز ظہر ادا کی اور علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا" کیا تم لوگ نہیں جانتے ہو کہ میں مومنین کے نفوس سے اولیٰ ہوں ؟

سب نے عرض کی بیشک معلوم ہے۔

فرمایا کیا نہیں جانتے ہو کہ میں ہر مومن سے اس کے نفس کی بہ نسبت زیادہ اولیٰ ہوں ؟

سب نے عرض کی بیشک۔!

پھر علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ بھی مولا ہے۔ خدایا! اس کے دوست کو دوست رکھنا اور اس کے دشمن کو دشمن رکھنا۔

جس پر عمر بن الخطاب نے مبارکباد دی کہ مبارک ہو فرزند ابوطالب! تم میرے اور ہر مومن و مومنہ کے مولا ہو گئے"۔

(ذخائر العقبیٰ ص ۶۷، فضائل الخمسہ ۱/ ۳۵۰، الریاض النضرۃ ۲/ ۲۲۳، فصول مہمہ ص ۲۴، الحاوی للفتاوی سیوطی ۱/ ۱۲۲، کنز العمال ۵/ ۱۱۷، ابن عساکر ۲/ ۴۷ حدیث نمبر ۵۴۶/۲، انساب الاشراف ۲/ ۱۱۵، مناقب خوارزمی ۹۴، فرائد السمطین ۱/ ۶۴-۷۵، الغدیر ۱/ ۱۸-۲۰)

۴۔ روایت سعد بن ابی وقاص

"میں نے رسول کرمؐ سے روز جمعہ سنا کہ آپ نے علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر خطبہ ارشاد فرمایا اور حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ ایہا الناس! کیا میں تمہارا ولی ہوں ؟

سب نے کہا بیشک!

پھر علیؑ کو بلند کر کے فرمایا کہ یہ میرا ولی ہے۔ یہ میرے قرض کو ادا کرے گا۔ میں اس کے دوست کا دوست اور اس کے دشمن کا دشمن ہوں"۔ (خصائص نسائی ص ۱۰۱، فضائل الخمسہ ص ۳۶۵،

البدایۃ والنہایۃ ۵/۲۱۲، الغدیر ۱/۳۸-۴۱، ملحق المراجعات ص ۱۷۶)

۵۔ روایت ثانیہ سعد بن ابی وقاص

"ہم رسول اکرمؐ کے ہمراہ تھے۔ جب مقام غدیر خم پر پہونچے تو آپ نے توقف فرمایا۔ آگے والوں کو پیچھے بلایا۔ پیچھے والوں کا انتظار کیا اور جب سب جمع ہو گئے تو فرمایا کہ:

"ایہا الناس! تمھارا ولی کون ہے۔؟

سب نے تین مرتبہ کہا اللہ اور اس کا رسولؐ۔

فرمایا کہ جس کا ولی اللہ اور رسولؐ ہے اس کا یہ علیؑ بھی ولی ہے۔ خدایا! اس کے دوست کو دوست رکھنا اور اس کے دشمن کو دشمن رکھنا۔"

(خصائص نسائی ص ۱۰۱، فضائل الخمسہ ۱/۳۶۵، اسعاف الراغبین برحاشیہ نور الابصار ص ۱۴۹، الریاض النضرۃ ۲/۲۸۲)

کلام فہمی اور مبارکباد

غدیر خم کے تمام حاضرین نے اس اعلان کا مفہوم سمجھا اور سب نے ولی خدا اور اور خلیفۂ رسول خدا کو اس عظیم نعمت الٰہیہ کی مبارکباد دی اور سب سے آگے آگے عمر بن الخطاب تھے جنھوں نے یہ الفاظ استعمال کئے "ابو طالب کے فرزند مبارک ہو۔ تم میرے اور ہر مسلمان کے مولا ہو گئے۔" (ابن عساکر ۲/۷۵، مناقب ابن مغازلی ص ۱۸، مناقب خوارزمی ص ۹۴، تاریخ بغداد ۸/۲۹۰، شواہد التنزیل ۱/۱۵۸ حدیث نمبر ۲۱۳، سر العالمین غزالی ص ۲۱، احقاق الحق ۶/۲۵۶، الغدیر ۱/۱۲۲، فرائد السمطین ۱/۷۷)

دوسرے الفاظ ہیں: "مبارک ہو فرزند ابو طالب! تم ہر مومن و مومنہ کے ولی ہو گئے۔" (تاریخ ابن عساکر ۲/۵۰ حدیث نمبر ۵۴۸-۵۴۹-۵۵۰، مناقب خوارزمی ص ۹۴، مسند احمد ۴/۲۸۱، فصول مہمہ ص ۲۴، الحاوی للفتاوی ۱/۱۲۲، ذخائر العقبیٰ ص ۶۷، فضائل الخمسہ ۱/۳۵۰، فضائل الصحابہ للسمعانی، تاریخ الاسلام ذہبی ۲/۱۹۷، علم الکتاب خواجہ حنفی ص ۱۶۱، نظم درر السمطین ص ۱۰۹، ینابیع المودۃ ص ۳۰-۳۱-۲۴۹، تفسیر رازی ۳/۶۳، تذکرۃ الخواص

ص ۲۹، مشکوٰۃ المصابیح ۲/۲۴۲، عبقات الانوار حدیث ثقلین ۱/۲۸۵، فرائد السمطین، الغدیر ۱/۲۷۲، الریاض النضرۃ ۲/۱۶۹، کفایۃ الطالب ص ۲۸، مناقب ابن الجوزی الحنبلی، البدایۃ والنہایۃ ۵/۲۱۲، الخطط المقریزی ص ۲۲۳، بدیع المعانی ص ۷۵، شرح دیوان امیرالمومنینؑ للمیبذی ص ۴۰۶، کنزالعمال ۶/۳۹۷، وفاء الوفاء للسمہودی ۲/۱۷۳، الصراط السوی لمحمود الشیخانی المدنی)

نصوص یوم الغدیر

اہلسنت کا اجماع ہے کہ رسول اکرمؐ نے روز غدیر علیؑ کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا:

ا۔ جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ مولا ہے۔ خدایا اس کے دوست کو دوست رکھنا اور اس کے دشمن کو دشمن رکھنا۔ اس کے مددگار کی مدد کرنا اور اس کو چھوڑ دینے والے کو چھوڑ دینا۔" (تاریخ ابن عساکر ۲/۱۳ حدیث نمبر ۵۰۸، ۵۱۲، ۵۱۵، کنزالعمال ۶/۴۰۳، خصائص نسائی ص ۹۶، الفصل لابن حزم ۱/۲۶۰، مسند امام احمد ۵/۳۲، انساب الاشراف ۲/۱۱۲، مناقب خوارزمی ص ۹۴، ملحق المراجعات ص ۱۸۳)

ب۔ جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ مولا ہے۔

ج۔ جس کا میں مولا ہوں اس کا علی مولا ہے، خدایا اس کے دوست کو دوست رکھنا اور اس کے دشمن کو دشمن رکھنا۔" (ترمذی ۵/۲۹۷، تاریخ ابن عساکر ۱/۲۱۳، مجمع الزوائد ۹/۱۰۳، خصائص نسائی ص ۹۴، مستدرک ۳/۱۱۰، جامع الاصول ابن اثیر ۹/۴۶۸، مناقب خوارزمی ص ۷۹، تلخیص المستدرک ذہبی ۳/۱۱۰، حلیۃ الاولیاء ۵/۲۶، درمنثور ۵/۱۸۲، تاریخ الاسلام ذہبی ۲/۱۹۶، تاریخ بغداد ۸/۲۹۰)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ان روایات نے کس طرح صورت حال کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے کہ غدیر خم کا اقرار تو کیا ہے لیکن نہ مجمع کی کثرت کا ذکر کیا ہے اور نہ یہ بتایا کہ یہ حج آخر کا واقعہ ہے جب کہ یہ بیان اس طرح قوی تھا کہ اموی حکومت میں علیؑ پر قانوناً سب و شتم کے واجب ہونے اور حکومت کے تمام عالم اسلامی پر قابض ہونے کے باوجود حکومت اس اعلان کو محو نہ کر سکی اور زمانہ کے ساتھ یہ اعلان دائمی اور ابدی شکل اختیار کرتا گیا جب کہ امت نے ولیعہد پیغمبرؐ اور خلیفہ رسولؐ

سے غداری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور یہ بہر حال طے ہے کہ امور کا انجام پروردگار کے ہاتھ میں ہے۔

واقعہ نصب خلافت امر یقینی ہے

احمد بن حنبل نے اس واقعہ کو ۴۰ طریقوں سے نقل کیا ہے۔

ابن جریر نے ۷۲ طریق بیان کئے ہیں۔

الجزری المقری نے ۸۰ طریقہ بیان کئے ہیں۔

اور ابن عقدہ نے ۱۰۵ طریق سے نقل کیا ہے۔

ابوسعید السجستانی نے ۱۲۰ طریقوں سے اور ابوبکر الجصابی نے ۱۲۵ طریقوں سے۔ اور محمد عیینی نے ۱۵۰ طریقوں سے نقل کیا ہے اور ابوالعلاء العطار الہمدانی نے اس عدد کو ۲۵۰ تک پہونچا دیا ہے۔

اہل تشیع کے نزدیک یہ حدیث مسلمات میں ہے اور اس کا واقعہ حجۃ الوداع کے موقع پر میدان غدیر میں پیش آیا ہے۔ اہلسنت حدیث غدیر کا اعتراف تو کرتے ہیں اور اسے رسول اکرم سے نافذ ہونے والی حدیث سمجھتے ہیں لیکن اس کے بعد حکام کے زیر اثر تاویل شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ حضرت علیؑ کی صرف ایک فضیلت ہے جس سے تاریخ میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی ہے اور پھر یہ مقولہ نسلوں میں وراثت میں منتقل ہو گیا اور اسے ایک سنت سلف کی حیثیت حاصل ہو گئی، جس کے خلاف بولنا جرم ہے کہ اس کی مخالفت حکام بنی امیہ کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لیتی ہے اور بنی عباس، بنی عثمان اور تمام حکام مسلمین کی حکومت کو غیر شرعی قرار دے دیتی ہے۔ اور اس طرح شیعوں کا موقف حق بجانب ہو جاتا ہے اور یہ ناممکن ہے اس لئے کہ انھوں نے حکام کی وراثت میں یہ جملہ پایا ہے کہ شیعہ دین کے دشمن ہیں۔ ان کے حق بجانب ہونے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ (انا للہ)

عید غدیر

دورِ قدیم میں مسلمانوں میں روزِ غدیر ایک عید کی حیثیت رکھتا تھا اور اس میں

باقاعدہ جشن منایا جاتا تھا۔ لیکن جب امور مملکت باقاعدہ دشمنانِ اہلبیتؑ کے ہاتھوں میں آگئے، تو مسلمانوں نے اس جشن سے گریز کیا اور دھیرے دھیرے نسلیں اسے فراموش کر بیٹھیں جس کا سبب حکام مسلمین کا دباؤ یا ان کی خوشامد اور رضامندی کی جستجو تھا۔ شیعیانِ حیدرِ کرارؑ میں یہ دن ہمیشہ عید کا دن رہا ہے اور آج بھی ہے۔ (الغدیر ۱/۲۶۷ از الآثار الباقیہ فی القرون الخالیہ للبیرونی ص ۳۳۴، مطالب السؤول ابن طلحہ شافعی ۱/۲۴، وفیات الاعیان ۱/۹۰ در حالات مستعلی بن المنتصر ۱/۲۲۳)

روزۂ یومِ غدیر

ابوہریرہ راوی ہیں کہ جس نے ۱۸ ذی الحجہ کا روزہ رکھا اللہ اسے ساٹھ مہینوں کے روزے کا ثواب دے گا۔ یہ دن غدیر کا دن ہے۔ جب رسول اکرمؐ نے علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا تھا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ مولا ہے۔ خدایا اس کے دوست کو دوست رکھنا اور اس کے دشمن سے دشمنی کرنا۔ جس کے بعد عمر بن الخطاب نے مبارکباد دی تھی، ابوطالب کے لال مبارک ہو۔ آپ میرے اور تمام مسلمانوں کے مولا ہو گئے۔ (تاریخ ابن عساکر ۲/۷۵، شواہد التنزیل ۱/۲۰۰ احدیث نمبر ۲۱۰-۲۱۳، الغدیر ۱/۴۰۲، تاریخ بغداد ۸/۲۹۰، فرائد السمطین ۱/۷۷، باب ۱۳۔ ملحق المراجعات ص ۱۹۲-۱۹۳)

فصل ششم

اعلانِ ولایت اور اکمالِ دین و اتمامِ نعمت

رسول اکرمؐ کے اس عظیم اجتماع میں حضرت علیؑ کو مولا اور جانشین مقرر کرنے کے بعد دین کامل ہوگیا اور نعمتیں تمام ہوگئیں۔ اب پروردگار کا حقوقی نظام مکمل ہے اور علیؑ اس کے ذمہ دار مقرر ہو گئے ہیں۔ اب نبی کے لئے ممکن ہے کہ وہ دنیا کو چھوڑ کر نہایت اطمینان کے ساتھ جوار الٰہی کا رُخ کریں۔ اس لئے کہ ولی کی صرف یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس نظام کو انھیں خطوط پر چلائے جو ۲۳ سال کے اندر رسول اکرمؐ نے مقرر کر دئے ہیں اور ان کی وضاحت فرما دی ہے۔

اس تقرر کے بعد قرآن مجید کی آیت اکملت لکم دینکم بھی نازل ہوئی تھی۔ (تاریخ ابن عساکر ۲/۵۷، حدیث نمبر ۵۷۵ - ۵۷۸ - ۵۸۵، شواہد التنزیل ۱/۱۵۷ احدیث نمبر ۲۱۱ - ۲۱۵، مناقب ابن مغازلی ص ۱۹ حدیث نمبر ۲۴، تاریخ بغداد ۸/۲۹۰، درمنثور ۲/۲۵۹، اتقان ۱/۳۱، مناقب خوارزمی ص ۸۰، تذکرۃ الخواص ص ۳۰، تفسیر ابن کثیر ۲/۱۴، مقتل خوارزمی ۱/۱۱۵، فرائد السمطین ۱/۷۲ - ۷۴ - ۳۱۵، تاریخ یعقوبی ۲/۳۵، الغدیر ۱/۲۳۰، کتاب الولایہ ابن جریر طبری، مفتاح النجا بدخشی، ما نزل من القرآن فی علی ابونعیم اصفہانی، کتاب الولایہ ابوسعید سجستانی۔ خصائص علویہ ابوالفتح، توضیح الدلائل علیٰ ترجیح الفضائل شہاب الدین احمد، تاریخ ابن کثیر ۵/۲۱۰، مناقب عبید اللہ شافعی ص ۱۰۶ مخطوط، الکشف والبیان ثعلبی مخطوط، روح المعانی آلوسی ۶/۵۵، البدایۃ والنہایۃ ۵/۲۱۳، ۷/۳۴۹، ملحق المراجعات ص ۱۸۸ - ۱۸۹)

اگر پیغمبر اسلامؐ نے امام اور خلیفہ مقرر کئے بغیر اور منصب امامت کے انتقال کا طریقہ

سمجھائے بغیر دنیا کو چھوڑ دیا ہوتا تو نہ دین کامل ہوتا اور نہ نعمت تمام ہوتی۔ اس لئے کہ امام، رسول کا قائم مقام ہوتا ہے اور رسول ہی دین و دنیا کے نظام کی بنیاد اور اس کی ہر تحریک کا محور ہوتا ہے۔

اس امر کا ادراک حکام دنیا کو بھی رہا ہے۔ اسی لئے کسی حاکم نے بھی اپنا نائب مقرر کئے بغیر دنیا کو نہیں چھوڑا ہے اور ہر شخص نے اسے اپنا مطلق حق تصور کیا ہے۔

ابن خلدون نے حکام کے بارے میں اس طرح وضاحت کی ہے کہ "حاکم قوم کا ولی اور اس کے امور کا امانت دار ہوتا ہے جو زندگی میں بھی ان کے معاملات کی نگرانی کرتا رہتا ہے اور مرنے کے بعد کے بارے میں بھی نگاہ رکھتا ہے تاکہ کسی شخص کو مقرر کر دے جو اُن کے امور کا متولی رہے اور وہ اس پر اسی طرح اعتماد کریں جس طرح پہلے والے پر اعتماد کیا کرتے تھے۔" (مقدمہ ابن خلدون فصل ۳۰/۱۲۰)

اب اگر کسی خلیفہ نے اپنا جانشین نامزد نہیں کیا ہے تو وہ قابل ملامت ہے جیسا کہ عبداللہ بن عمر نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ "یا امیرالمومنین! امت پر کسی کو اپنا جانشین بنا دیں اس لئے کہ اگر کوئی چرواہا بھی آپ کے پاس اپنے جانوروں کو بغیر نگراں کے چھوڑ کر چلا آئے تو آپ اس کی ملامت کریں گے اور کہیں گے کہ تو نے امانت کو ضائع کر دیا ہے تو آپ امت پیغمبرؐ کے بارے میں کیا جواب دیں گے۔" (مروج الذہب ۲/۳۵۲)

یہی بات ام المومنین عائشہ نے ابن عمر سے کہی تھی کہ "اپنے باپ سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ امت کو بلا نگراں نہ چھوڑیں۔ کسی کو جانشین بنا دیں اور انھیں لاوارث نہ قرار دیں کہ مجھے فتنہ کا اندیشہ ہے۔" اور جب عبداللہ نے یہ پیغام پہونچایا تو عمر نے کہا کہ پھر کسے بنا دیا جائے۔ (الامامۃ والسیاسۃ ص ۲۳)

گویا تاریخ اسلام میں ہر خلیفہ کو یہ معلوم تھا کہ امت کو بغیر نگراں کے چھوڑ دینا خلافِ حکمت ہے اور اس سے فتنوں کے سر اٹھانے کا خطرہ ہے اور انسان قابلِ ملامت ہو جاتا ہے۔ ہر چرواہے کو یہ حقیقت معلوم تھی۔ ام المومنین کو مکمل طور پر اس حقیقت کا اندازہ تھا۔

مگر افسوس کہ اگر اندازہ نہیں تھا تو صرف رسول اللہ کو۔ ؟ یا سب اپنے تقریّیں

قابل اعتماد تھے اور رسول اکرمؐ قابل اعتماد نہیں تھے ؟ (انا للہ) حقیقت یہ ہے کہ اندھی تقلید والوں کے سامنے دو راستے تھے یا دین کا وہ تصور لیں جو رسول اکرمؐ نے دیا ہے یا وہ راستہ اختیار کریں جو حکام نے مقرر کیا ہے۔

اب چونکہ حکام کو غلبہ حاصل ہو گیا تھا لہذا ابن عمر کے فتوی پر عمل کیا گیا کہ ہمیں غلبہ حاصل کرنے والے کے ساتھ رہنا چاہیئے۔ ولاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

اب جسے حاکم مقرر کر دے گا وہ حاکم ہو جائے گا اور جسے غلبہ حاصل ہو جائے گا وہ امت پیغمبرؐ کا سربراہ ہو گا۔ چاہے کوئی بھی ہو اور کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ (وللہ عاقبۃ الامور)

انتقال منصب الٰہی کی خدائی ترتیب

پروردگار عالم نے قرآن مجید کو ایک پیغام اور ایک خدائی نظام بنا کر بنی نوع انسان کی طرف بھیجا ہے جس کی وضاحت کے پیش نظر اسے پیغمبر اسلامؐ پر نازل کیا ہے کہ مالک کائنات نے انھیں کو اس کی توضیح و تشریح کے لئے منتخب کیا تھا اور وہی اس قانون کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے اور وہی سب سے بہتر انسان تھے اور قیادت قوم کے سب سے زیادہ اہل تھے۔

اب جب تک یہ نظام دعوت کی منزل میں رہا انھوں نے مرشد کا فرض انجام دیا۔ اس کے بعد جب حکومت کے مرحلہ میں آگیا تو وہی قائد امت اور رئیس مملکت ہو گئے۔

ان کا طریقۂ کار سنت ہونے کے اعتبار سے جزء مذہب ہے اور کائنات میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ان کی ضرورت کو پورا کر کے ان کی طرف سے بے نیاز بنا سکے۔ وہی اس دائرہ مذہب کا مرکز ہیں اور وہی اس پوری امت کا مرجع اور محور ہیں۔

قائد کا تقرر کون کرے ؟

کھلی ہوئی بات ہے کہ قائد و امام مقرر کرنے کا حق صرف پروردگار کو ہے۔

اسی نے رسول اکرمؐ کو قائد و امام بنایا ہے کہ ان سے زیادہ اعلم، افضل اور انسب کوئی نہ تھا اور ان خصوصیات کو حتمی اور یقینی طور پر اس کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے۔

یہ حق خصوصی طور پر پروردگار کا ہے اور اسی نے قائد کی تعیین کی ہے اور اسی نے قائد کو نظام کی توضیح اور تطبیق کا اختیار دیا ہے اور اس قابل بنایا ہے کہ مرجعیت اور قیادت دونوں فرائض انجام دے سکے اور دینی قوانین کے مطابق امور دین و دنیا کا فیصلہ کر سکے۔

قائد اور امام کون ہو؟

حقیقت امر یہ ہے کہ ہر دور میں امام امت سربراہ اہلبیتؑ کو ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ اہلبیتؑ ہی ثقلین کی ایک فرد ہیں اور ہدایت کا حصول ثقلین سے تمسک کے بغیر ناممکن ہے۔ اور یہ کوئی اجتہادی رائے نہیں ہے بلکہ متعدد نصوص شرعیہ کا نتیجہ ہے جس میں قول و فعل و تقریر پیغمبرؐ سب شامل ہیں۔ (ترمذی ۳۲۸/ ، صحیح مسلم ۳۶۲/۲، شرح نووی ۱۵/ ۱۸، تفسیر ابن کثیر ۱۱۳/۴، مصابیح السنہ ص ۲۰۶، جامع الاصول ابن اثیر ۱۸۷/۱، احیاء المیت برحاشیہ اتحاف ص ۱۱۴، الفتح الکبیر نبہانی ۵۰۳/۱، صواعق محرقہ ص ۱۴۷، ۲۲۶، در منثور ۷/۶، ذخائر العقبیٰ ص ۱۶، معجم صغیر طبرانی ۱۳۵/۱، کنز العمال ۱۵۴/۱، طبقات ۱۹۴/۲، سیرت حلبیہ ۳۲۱/۳، خصائص نسائی ص ۲۱)

پروردگار نے اس امر کا بھی اعلان کرا دیا ہے کہ "ان کی مثال سفینۂ نوح کی ہے جو سفینہ پر سوار ہوگا نجات پائے گا ورنہ غرق ہو جائے گا"۔ (تلخیص مستدرک بذیل مستدرک، صواعق محرقہ ص ۱۸۴، ۲۳۴، تاریخ الخلفاء، اسعاف الراغبین ص ۱۰۹، مجمع الزوائد ۱۶۸/۹، معجم صغیر طبرانی ۲۲/۲، حلیۃ الاولیاء ۳۰۶/۴، جامع صغیر سیوطی ۱۳۲/۲، مسند امام احمد ۹۲/۵ حاشیہ)

پھر اہلبیتؑ ہی امت کے لئے باعث امن و امان ہیں اور پروردگار عالم نے انھیں کو اس کام کے لئے مہیا کیا ہے۔ (صواعق محرقہ ص ۱۴۰، احیاء المیت، ذخائر العقبیٰ ص ۱۷، جامع صغیر ۱۶۱/۲، الفتح الکبیر ۲۶۷/۲، مسند احمد ۹۲/۵، اسعاف الراغبین برحاشیہ نور الابصار ص ۱۲۸)

اہلبیتؑ ہی ذریت پیغمبر اسلامؐ ہیں کہ اللہ نے ہر نبی کی ذریت کو اس کے صلب سے قرار دیا ہے اور پیغمبر اسلام کی ذریت کو صلب علیؑ اور بطن فاطمہؑ سے قرار دیا ہے۔ (صواعق محرقہ

ص ۱۱۲، مستدرک حاکم ۳/۱۶۴، کنز العمال ۶/۱۵۲، مناقب خوارزمی ص ۲۷)۔

نبیؐ کے بعد خلیفہ کا تقرر کون کرے؟

وہ انسان جو عقیدہ کے بارے میں سب سے زیادہ اعلم، احکام کے بارے میں سب سے زیادہ صاحب فہم۔ ماننے والوں میں سب سے افضل اور قیادت امت کے لئے سب سے زیادہ انسب ہو۔ اسے یقینی طور پر سوائے پروردگار کے کوئی نہیں جانتا ہے لہذا خلیفہ معین کرنے کا بنیادی حق اسی کو حاصل ہے۔

اسی بنا پر اس نے حضرت علیؑ بن ابی طالب کو مرجعیت اور قیادت و امامت کے لئے اختیار کیا تھا اور مرسل اعظمؐ کو حکم دے دیا تھا کہ وہ مسلسل اس امر کی وضاحت کرتے رہیں کہ یہی انسان اعلم، افہم، افضل اور انسب ہے اور اسی کو وہ تمام دینی اور دنیاوی ذمہ داریاں سپرد کی جاتی ہیں جو پیغمبرؐ انجام دیا کرتے تھے۔ صرف اسے نبوت سے الگ رکھا گیا ہے ورنہ یہ حق کے ساتھ ہے اور حق اس کے ساتھ ہے بلکہ اسی کے ساتھ گردش کرتا ہے لہٰذا یہی ابن خلدون کے قانون کے مطابق قوم کے لئے ثقہ اور محل اعتماد ہے۔

خلیفۂ رسولؐ کے بعد خلیفہ کون معین کرے؟

جب یہ طے ہو گیا کہ مرسل اعظمؐ کے بعد بلا فصل خلیفہ علیؑ بن ابی طالب ہیں۔ وہی حق کے ساتھ ہیں اور حق انھیں کے ساتھ ہے اور انھیں کے ساتھ گردش کرتا ہے اور وہی اعلم۔ افہم، افضل اور انسب ہیں اور وہی قرآن کے ساتھ رہیں گے جب تک حوض کوثر پر وارد نہ ہو جائیں تو ان سے زیادہ اپنے بعد کے خلیفہ کے تقرر کا اہل اور حقدار کون ہوگا اور اسی لئے ہر امام کا یہ فرض قرار پایا کہ بعد والے امام کی تعیین کرے کہ یہ سب بنص آیت مباہلہ اولاد رسولؐ ہیں۔ (صواعق محرقہ ص ۱۱۲، مستدرک حاکم ۳/۱۶۴، کنز العمال ۶/۱۵۲، مناقب خوارزمی ص ۲۷)

امت اسلامیہ کا اس امر پر اجماع ہے کہ یہ آیت مباہلہ اہلبیتؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے اور اس آیت کی رو سے امام حسنؑ اور امام حسینؑ فرزندان رسول اکرمؐ ہیں تو اس کے بعد قوم

کس آیت پر ایمان لائے گی ؟ اور کون سی زبان لوگوں کو تقلید سے نجات، حق کے اتباع اور عقل کے استعمال پر آمادہ کر سکے گا ؟

کم سے کم یہ حضرات سب قریش میں سے تو ہیں اور قریش قبیلۂ پیغمبرؐ ہیں جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ خلافت کا حق صرف قریش کو ہے ۔ (کنز العمال ۲۵/۱۲ نقل از مسند احمد، معجم کبیر طبرانی، سنن بیہقی، مستدرک حاکم حدیث نمبر ۸۹ ، ۳۳ ۔ ۳۳۸۹۰)

پھر قریش کی نمایاں جماعت بنی ہاشم ہیں اور بنی ہاشم کا خلاصہ بنو عبدالمطلب ہیں اور بنو عبدالمطلب کا روشن چہرہ محمدؐ اور ان کے اہلبیتؑ ہیں ۔ (کنز العمال ۴۳/۱۲ نقل از مستدرک حاکم، سنن بیہقی، معجم کبیر طبرانی)

اللہ نے انھیں حضرات کو طیب و طاہر قرار دیا ہے اور انھیں کی شان میں آیت تطہیر نازل کی ہے اور اگر کوئی یہ کہے کہ اس آیت کا نزول ازواج پیغمبرؐ کے بارے میں ہے تو بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ ازواج طیب و طاہر ہوں اور اولاد طیب و طاہر نہ ہو ۔

پھر کم سے یہ قیادت، اہلبیتؑ کے ان خدمات کا بدلہ بھی ہے جو انھوں نے محاصرہ کے درمیان تین سال تک شعب ابی طالب میں انجام دئے ہیں ۔

ائمہ اثنا عشر بھی یہی ائمہ اطہار ہیں ۔ حکام مسلمین نہیں ہیں ۔ حکام کی تعداد سیکڑوں تک پہونچی ہوئی ہے اور ان کے بارہ ۱۲ ہونے کا کوئی سوال نہیں ہے ۔ (ملاحظہ ہو مروج الذہب مسعودی فہرست حکام مسلمین)

صرف آلِ محمدؐ کیوں ؟

خلافت و امامت کو آل محمدؐ میں صرف اس لئے منحصر رکھا گیا ہے کہ انھیں مالک کائنات نے طیب و طاہر قرار دیا ہے اور اس کام کے لئے تیار کیا ہے ۔ ان سے کوئی خطرہ بھی نہیں ہے ان کے ہوتے ہوئے کسی مقابلہ کا امکان بھی نہیں ہے ورنہ اس کے بعد خلافت غلبہ کا نتیجہ ہو جائے گی اور امت پر ہر بے دین، بے ضمیر اور جاہل حکومت کر سکے گا ۔ لیکن جب یہ خلافت آلِ رسولؐ میں رہے گی تو امت نہایت درجہ طیبِ خاطر کے ساتھ ان کا اتباع کریگی

کہ یہ ہمارے پیغمبرؐ کی اولاد ہیں اور اس طرح استقرار و اطمینان عام ہو گا اور حرص و طمع کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔

امت اور امامت

امامت کے سلسلہ میں امت کا کام یہ ہے کہ اس شخص کی جستجو کرے جو عقیدہ میں اعلم اور احکام میں افہم ہو۔ یہ ایک حقوقی نظام ہے جس کی تطبیق کا پہلا ذمہ دار امام ہے۔ اب اگر امام ہی اعلم اور افہم نہ ہو گا تو تمام مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

اس کے بعد یہ بھی دیکھے کہ امت میں سب سے افضل کون ہے۔ اس لئے کہ سب کی مصلحت اور سب کے لئے باعث فخر یہ ہے کہ افضل کی اطاعت کرے اور امت عاقلہ وہی امت ہے جو قیادت کے لئے انسب کو تلاش کرے تاکہ وہ ساری قوم کو راہِ خدا پر لے کر چل سکے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ حتمی اور یقینی طور پر اعلم، افہم، افضل، انسب کا طے کرنا نہ امت میں کسی فرد کے بس کا کام ہے نہ کسی جماعت کا اور نہ ساری امت کا۔ یہ کام صرف پروردگار کا ہے لہٰذا اسی کا فرض ہے کہ بندوں پر رحم کھا کر یہ بتا دے کہ جس موزوں ترین ہستی کو تلاش کر رہے ہو وہ حتمی اور یقینی طور پر فلاں شخص ہے جو تمھاری قیادت اور تمام عالم اسلام کی راہنمائی کا اہل اور حقدار ہے۔ اور امت کی عقل اور اس کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اس خدائی رہنمائی کو قبول کر لے اور خوش ہو کہ اس نے اپنے مدعا کو پا لیا ہے۔ دل سے اس کی بیعت کرے کہ وہ اس کی سیر تکامل کا قائد اور امام ہے اور اس طرح وہ امت کا بالفعل امام بن جائے اور امت الٰہی قانون کی تنفیذ و تطبیق میں اس سے مکمل طور پر تعاون بھی کرے۔

واقعات اور قانون کی جُدائی

اب اگر امت نے خدا کے اس فیصلہ کو قبول نہ کیا اور اس کے بنائے ہوئے

علم، افضل اور انسب کو رد کر کے اپنی خواہش کے مطابق افضل و انسب تلاش کرنا شروع کر دیا تو واقعات اور قانون میں خود بخود جدائی ہو جائے گی اور امت کا بنایا ہوا قائد اور ہوگا اور پروردگار کا معین کیا ہوا امام اور۔ خدائی امام ان افراد پر حکومت نہ کر سکے گا جنھوں نے اسے نظر انداز کر دیا ہے اور وہ اپنی دیانت کی بنیاد پر ہر وسیلہ سے کرسئ اقتدار تک جا بھی نہیں سکتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکام حکومت اور مرجعیت پر قبضہ کر لیں گے اور اپنے خیال میں خلیفہ رسولؐ اور وارث پیغمبرؐ ہو جائیں گے اور جو مقابلہ کرے گا اسے سلطنت کی لاٹھی سے راستہ پر لے آئیں گے۔

جس کا ایک منظر یہ دیکھنے میں آیا کہ حسینؑ بن علیؑ نص پیغمبرؐ سے ولی، امام اور مرجع تھے لیکن امت نے بخوشی یا بجبر۔ یزید کی بیعت کر لی اور یزید واقعی حاکم ہوگیا۔ امام حسینؑ صرف شرعی امام رہ گئے اور اپنی صلاحیات اور اپنے اختیارات کو استعمال نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یزید قہر و غلبہ سے تخت حکومت پر قابض ہوگیا۔ امت نے جبراً یا بخوشی اس کی بیعت کر لی اور شرعی امام سے منہ پھیر لیا کہ اب امام حسینؑ کا فریضہ ہوگیا کہ اس امر واقع کو تسلیم کر لیں یا سلطنت کی طاقت کا مقابلہ کریں اور روز بروز دباؤ بڑھتا جائے اور ایک دن قتل کی نوبت آجائے۔

حکومت، شرعی امام کی رفیقۂ حیات ہے جو اس سے جدا نہیں ہونا چاہتی لیکن اہل اقتدار اسے غصب کرنا چاہتے ہیں اور انھیں معلوم ہے کہ اس رفیقۂ حیات کے دل سے اپنے واقعی رفیق حیات کا خیال نہیں نکل سکتا ہے اور وہ غاصب سے مانوس نہیں ہو سکتی ہے لہذا مسئلہ کا صحیح حل یہی ہے کہ واقعی رفیق حیات کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے تاکہ ہر جہت سے اس کے جسم و روح پر قبضہ ہو جائے اور وہ دوبارہ واپس جانے کے بارے میں سوچ ہی نہ سکے۔

قانونی ائمہ طاہرین

۱۔ علیؑ بن ابی طالب۔ ۲۔ حسنؑ بن علیؑ۔ ۳۔ حسینؑ بن علیؑ۔ ۴۔ علیؑ بن الحسینؑ۔

۵۔ محمدؑ بن علیؑ۔ ۶۔ جعفرؑ بن محمدؑ۔ ۷۔ موسیٰؑ بن جعفرؑ۔ ۸۔ علیؑ بن موسیٰؑ۔ ۹۔ محمدؑ بن علیؑ۔
۱۰۔ علیؑ بن محمدؑ۔ ۱۱۔ حسنؑ بن علی العسکری۔ ۱۲۔ محمدؑ بن الحسن المہدی۔

خلیفۂ رسولؐ کے سامنے مستقبل کی وضاحت

رسول اکرمؐ نے امانت الٰہی کو ادا کر دیا۔ پیغام الٰہی کو پہونچا دیا اور جملہ امور کی وضاحت کر دی۔ حکم خدا کے مطابق ولی امر اور جانشین بھی مقرر کر دیا اور افرادِ امت کو اس تقرر سے باخبر بھی کر دیا۔ یہانتک کہ ایک لاکھ کے مجمع میں اس کا اعلان بھی کر دیا اور تمام مسلمانوں نے عمر بن الخطاب کی سرکردگی میں مبارکباد بھی پیش کر دی اور ہر شے اپنی منزل پر پہونچ گئی کہ اب تاریخ فطری اصولوں پر آگے بڑھے گی۔ لیکن پیغمبر اکرمؐ نے اس صورت حال پر اکتفا نہیں کی بلکہ مستقبل کے بعض مشکلات کا اشارہ بھی دے دیا۔

ایک مرتبہ کبار اصحاب جن میں ابوبکر و عمر بھی شامل تھے سب کے سامنے فرمایا کہ تم میں سے ایک شخص تاویل قرآن کے مطابق جنگ کرے گا جس طرح کہ میں نے تنزیل کے مطابق جنگ کی ہے۔ تو ابوبکر نے سر اٹھا کر کہا کہ وہ میں ہوں گا؟۔ فرمایا نہیں۔

عمر بولے تو پھر میں؟۔

فرمایا نہیں۔ وہ میری جوتیوں کی اصلاح کرنے والا ہے اور یہ کہہ کر حضرت علیؑ کی طرف اشارہ کیا جو اس وقت نعلین کی اصلاح کر رہے تھے۔

ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ میں نے علیؑ کو اس فضیلت کی بشارت دی تو انھوں نے کوئی توجہ نہیں کی جیسے انھیں پہلے سے یہ معاملہ معلوم تھا۔ (مطالب السئول ۱/ ۶۴، مناقب خوارزمی ص ۱۸۳، نظم درر السمطین ص ۱۱۵، تاریخ ابن عساکر ۳/ ۱۳۷، خصائص نسائی ص ۱۳۱، مسند احمد ۵/ ۳۷ برحاشیہ، حلیۃ الاولیاء ۱/ ۶۷، اسد الغابہ ۳/ ۲۸۲، الریاض النضرۃ ۲/ ۲۵۲، ذخائر العقبیٰ ص ۷۶، مناقب ابن مغازلی ص ۲۹۸، شرح النہج تحقیق ابو الفضل ۲/ ۲۷۷، مجمع الزوائد ۹/ ۳۳، تاریخ الخلفاء ص ۱۷۳، صواعق محرقہ ص ۷۴، اصابہ ۲/ ۳۹۲، کنز العمال ۱۵/ ۹۴، ملحق المراجعات ص ۱۶۱-۱۶۲)۔

اس کے بعد آپ نے براہ راست حضرت علیؑ کے سامنے مستقبل کی وضاحت فرمائی کہ "عنقریب تم میرے بعد زحمتوں کا سامنا کرو گے"۔

عرض کی "یا رسول اللہ! کیا میرا دین سلامت رہے گا۔؟"

فرمایا "بے شک"۔

(مستدرک حاکم ۱۴۰/۳، تلخیص المستدرک بذیل المستدرک، نظم درر السمطین ص۱۱۸، منتخب کنز العمال بر حاشیہ مسند احمد ۳۲/۵، فضائل الخمسہ ۵۳/۳، ملحق المراجعات ص ۱۶۱)۔

یہی نہیں بلکہ آپ نے اپنے خلیفہ برحق کو اس امر سے بھی باخبر کر دیا کہ امت میری وفات کے بعد تم سے غداری کرے گی۔ (شرح النہج ۴۵/۶، البدایۃ والنہایۃ ۲۱۸/۶، فضائل الخمسہ ۵۱/۳، تلخیص الشافی للشیخ الطوسی ۵۱/۳)

اس سے بالاتر "یا علیؑ! ایک باغی گروہ تم سے جنگ کرے گا اور تم حق پر ہو گے۔ جو تمھاری مدد نہیں کرے گا اس کا مجھ سے کوئی رابطہ نہیں"۔ (تاریخ ابن عساکر ۱۷۱/۳، الغدیر ۹۳/۳، منتخب کنز العمال بر حاشیہ مسند احمد ۳۲/۵)

پھر پیغمبر اکرمؐ نے ساری کوشش صرف کر دی کہ امت کو آگاہ اور ہوشیار کر دیں۔ کبھی کسی صحابی سے خطاب کر کے فرمایا "ابو رافع! ۔ میرے بعد ایک قوم علیؑ سے جنگ کرے گی۔ ان لوگوں سے جہاد کرنا فرض ہے۔ جو ہاتھ سے جہاد نہ کر سکے وہ زبان سے جہاد کرے اور جو زبان سے جہاد نہ کر سکے وہ کم سے کم دل سے نفرت کا اظہار کرے"۔

(مجمع الزوائد ۱۳۴/۳، تاریخ ابن عساکر ۱۲۲/۳، احقاق الحق ۴۳۴/۷، ملحق المراجعات ص ۱۶۴)

جاہلی نظام کی بربادی

ریاست و قیادتِ اسلامی سے متعلق پروردگار عالم کے اس نظام نے جاہلیت کے سیاسی نظام کو ہوا میں اڑا کر رکھ دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ اسلام میں قیادت ایک فنی عمل ہے جسے اعلم، افہم، افضل اور انسب ہی انجام دے سکتا ہے جب کہ جاہلی نظام میں اس کی بنیاد قبائلی تقسیم پر تھی اور ہر قبیلہ کا بلا امتیازِ فضل و شرف ایک حصہ تھا۔ کسی کے پاس

قیادت تھی تو کسی کے پاس رفادہ۔ کوئی سقایت کا مالک تھا تو کوئی لوا یا سفارت کا۔ جاہلیت پرستوں کے پاس اس سے بہتر نظام کا کوئی امکان نہ تھا جہاں مساویانہ تقسیم تھی اور غالب و مغلوب کا کوئی جھگڑا نہ تھا۔ کسی قبیلہ کی کوئی مصلحت نہ عہدہ کی تبدیلی میں تھی اور نہ نئے عہدہ کی تحصیل میں۔ یہ ایک سیاسی عقیدہ تھا اور بزرگوں کا مقدس سیاسی ترکہ جس کے خلاف خروج کرنا جرم عظیم تھا۔

مکہ کے قبائل کی خواہش یہ تھی کہ کوئی ایسا نبی ظہور نہ کرنے پائے جو ہمارے برسوں کے نظام کو تباہ و برباد کردے۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ کے ظہور کے بعد سب نے مل کر مقابلہ کیا۔ یہ اور بات ہے کہ ناکام ہو گئے اور بنی ہاشم کی نبوت ایک کائناتی تقدیر بن گئی جس میں تبدیلی کا کوئی امکان نہ تھا۔ تو اب یہ سوال پیدا ہو گیا کہ کیا نبوت کی طرح خلافت بھی کوئی مقدر امر ہے جس سے نجات ممکن نہیں ہے؟ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ پروردگار سارے عہدے ایک ہی گھر میں رکھ دے اور باقی افراد کو محروم کر دے۔

اس تصور نے قریش کے اندر ایک جذبۂ حسد بیدار کر دیا اور انھوں نے طے کر لیا کہ نبوت اور خلافت کو ایک گھر میں جمع نہ ہونے دیں گے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس تصور کے اظہار پر وجود پیغمبرؐ کی لگام چڑھی ہوئی ہے۔ اور اس کے اظہار کے لئے ان کی وفات کا انتظار کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ مستقبل کے لئے منصوبہ سازی شروع ہو گئی۔ اور وہ کچھ ہونے لگا جس کی تفصیل دوسرے باب میں بیان کی جائے گی تاکہ موضوع کی مکمل شکل سامنے آسکے، اور بحث کا حق ادا کیا جا سکے۔

انقلاب

فصل ہفتم

بغاوت کی کامیابی کی تاریخی فضا

ا۔ قریش کے بطون

قبیلۂ قریش ۲۵ شاخوں سے مل کر منظم ہوا تھا۔ (مروج الذہب ۲/۲۹۱)

ان تمام شاخوں میں سب سے افضل بنی ہاشم بن عبد مناف تھے جیساکہ روایات میں بھی وارد ہوا ہے۔ (السیرۃ الحلبیہ ۱/۳۔۴، الجامع الاصول علی ناصف ۳/۴۱۹، سیرت دحلانیہ برحاشیہ سیرت حلبیہ ۱/ ۴۔۱۱، طبقات ابن سعد، شرح النہج ۲/ ۵۶ خطبہ نمبر ۱۸۵)

ان سے کمتر شرف کے مالک بنو عبد المطلب بن عبد مناف، بنو الحارث بن عبد مناف، بنو امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف، بنو نوفل بن عبد مناف تھے جو سادات قریش کہے جاتے تھے اور انھیں کو مجبرون بھی کہا جاتا تھا۔ انھیں خاندانوں نے سب سے پہلے قریش کے تحفظ کا انتظام کیا اور حرم سے باہر نکلے ہاشم نے ملوک شام سے رابطہ پیدا کیا۔ عبد شمس نے نجاشی سے تعلقات قائم کئے۔ نوفل نے کسریٰ کی پناہ لی اور مطلب نے حمیر سے رشتہ جوڑا اور اس طرح قریش مختلف شہروں میں پھیل گئے اور ان افراد کو "اقداح النضار" کہا جانے لگا۔

(طبقات ۱/۵۷، طبری ۲/۱۸۰، النظام السیاسی فی الاسلام ص ۹۳)

ب۔ سیاسی نظام

قریش کی تمام شاخوں نے اپنے درمیان ایک سیاسی نظام مرتب کیا تھا جس کی بنیاد مختلف مناصب کی مساویانہ تقسیم پر تھی اور اس طرح قیادت، لواء، ندوہ، فادۃ، سفارت

جیسے منصب مختلف شاخوں میں تقسیم ہو گئے اور ایسا محسوس ہوا کہ اس سے بہتر سیاسی نظام ممکن نہیں ہے جس میں غالب و مغلوب کا کوئی جھگڑا نہیں ہے اور یہ سیاسی منصب گویا ایک قدر مشترک ہے جس میں کسی قبیلہ کی مصلحت نظام کی تبدیلی میں نہیں ہے اور ہر ایک کے دل میں یہ خوف سمایا ہوا ہے کہ اگر اس نظام میں ذرا بھی تبدیلی پیدا کی گئی تو خدا جانے اس کا انجام کیا ہوگا اور شائد موجودہ منصب بھی ہاتھ سے نکل جائے۔

اس کے علاوہ ولایتِ بیت الحرام کا ایک نظام مرتب ہو گیا ہے اور ہر قبیلہ اس صورت حال سے مطمئن ہے تو اس میں تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس باہمی اتفاق کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تقسیم منصب کا نظام ایک سیاسی عقیدہ بن گیا اور بزرگوں کا ایک مقدس ترکہ قرار پا گیا جسے نسلوں میں اسی طرح منتقل ہونا ہے اور اس کے خلاف کسی طرح کا بھی اقدام ایک قابل مذمت عمل ہے۔

ج۔ موجودہ نظام کا تزلزل

قحط کے زمانہ میں مکہ میں ہاشم کے علاوہ کوئی نہ تھا جو لوگوں کے کھانے پینے کا انتظام کر سکے اور ان کی مدد کر سکے۔ انھیں کا نام ابو البطحاء اور سید البطحاء ہو گیا تھا اور انھیں کا دستر خوان ہر سرد و گرم زمانہ کے ساتھ بچھا ہوا تھا۔ مسافروں کو کھانا دینا اور خوفزدہ افراد کو پناہ دینا انھیں کا کارنمایاں تھا۔ (طبری ۲/ ۱۸۰، سیرت حلبیہ ۱/ ۵، طبقات ابن سعد ۱/ ۷۶)۔

اس صورت حال سے امیہ بن عبد شمس کو یہ خوف پیدا ہو گیا کہ نظام مساوات خطرہ میں ہے اور اس حسد نے ہاشم کی نقل کرنے پر آمادہ کیا۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا تو قریش نے طعنے دئے اور اس نے ہاشم کو مقابلہ کی دعوت دی۔ انھوں نے انکار کیا تو اس نے اصرار کیا اور بالآخر اپنے کئے کی سزا یہ پائی کہ پچاس اونٹ دئے اور دس سال کی جلاوطنی اختیار کرنا پڑی اور ہاشم کی افضلیت نمایاں ہو گئی جس کے نتیجہ میں حسد اور عداوت کی تخم ریزی ہو گئی اور اس کی بنیاد صرف یہ خوف تھا کہ ہاشم کی شخصیت کا نمایاں ہونا

قیادت بنی عبد شمس کے لئے کھلا ہوا خطرہ ہے اور اس طرح پرانا سیاسی نظام بھی تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا۔ (سیرت حلبیہ ۱/ ۱۵، النظام السیاسی فی الاسلام ص ۱۷۰۔ ۱۷۲)

ث۔ شہرت نبوت

مکہ میں یہ خبر پھیل گئی کہ عنقریب ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے اور وہ عبد مناف کی نسل سے ہوگا۔ جن لوگوں کے ذہنوں میں یہ خبر راسخ ہو گئی ان میں سے ایک ابوسفیان بھی تھا۔ اس کے تعلقات امیہ بن عبد الصلت سے بہت گہرے تھے اور اسے یقین تھا کہ یہ نبی پرانے سیاسی نظام کو ہوا میں اڑا دے گا اور اس کے ہاتھ سے قیادت چھین لے گا اور اس وقت قیادت بنو امیہ کے ہاتھ میں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ نبی بنی امیہ کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد اسے یہ سوچ کر قدرے اطمینان ہو گیا کہ اگر نبوت عبد مناف کی اولاد میں آنے والی ہے تو اس نسل میں اُس سے بالاتر کوئی شخصیت نہیں ہے اور عجب نہیں کہ نبی منتظر اسی کی ہستی ہو۔ (سیرت حلبیہ ۱/ ۸۰)

ج۔ اعلان نبوت

تھوڑا عرصہ نہ گذرا تھا کہ ہاشمی پیغمبرؐ نے اپنی نبوت کا اعلان کر دیا اور یہ واضح کر دیا کہ قدرت نے جس شخص کا انتخاب عالم عربیت اور عالم انسانیت کی ہدایت کے لئے کیا ہے وہ میں ہوں اور میرے پاس اس کی عظیم دلیل کلام خدا موجود ہے۔ چند افراد نے اس دعوت کو قبول بھی کر لیا جو دقیق النظر اور صاحب فراست کہے جاتے تھے یا جن کے دل میں انسانیت کا درد پایا جاتا تھا۔

ح۔ بنی ہاشم کا اجتماع

اس کے بعد بنی ہاشم نے پوری طاقت کے ساتھ پیغمبرؐ کے گرد ایک حلقہ بنا لیا اور قریش نے یہ سوچا کہ محمدؐ کے مرنے کی خبر عام کر دی جائے تاکہ اپنی قومی عظمت باقی رہ جائے۔ لیکن جیسے

ہی ابوطالب کو یہ خبر ملی انھوں نے تمام بنی ہاشم کو جمع کر کے سب کو ایک ایک دھار دار لوہا دیدیا اور بنی ہاشم و اولاد عبد المطلب کو لے کر میدان میں نکل آئے اور بلند آواز سے پکار کر کہا کہ قریش والو تمھیں معلوم ہے ہمارا ارادہ کیا ہے؟

لوگوں نے کہا ہمیں کوئی خبر نہیں ہے۔

فرمایا کہ نوجوانو! ذرا اپنی تلواریں نکال لو۔ اور اس کے بعد قریش سے خطاب کر کے فرمایا کہ اگر تم نے محمدؐ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو میں کسی ایک کو زندہ نہ چھوڑوں گا یہاں تک کہ خود بھی قتل ہو جاؤں۔

یہ دیکھ کر قوم کے حوصلے پست ہو گئے اور سب سے زیادہ شکستہ دل ابوجہل ہو گیا۔

(طبقات ابن سعد ۱/ ۲۰۲ - ۲۰۳)

خ۔ پرانے نظام کا تحفظ اور حسد

قریش کے تمام قبائل نے ابوسفیان کی قیادت میں پیغمبرؐ سے مقابلہ کرنے کا منصوبہ بنالیا اور اس کے لئے مختلف اسالیب طے کر لئے لیکن بنی ہاشم نے بھی پیغمبرؐ کو ان کے سپرد نہ کرنے کا اعلان کر دیا۔ اور اس طرح قریش نے انتقامی کارروائی کے طور پر حسب ذیل پروگرام بنایا:

۱۔ بنی ہاشم کا بائیکاٹ کیا جائے۔

بنی تیم و بنی عدی سمیت تمام قبائل نے مقاطعہ کا اعلان کر دیا اور بنی ہاشم کو تین سال تک شعب ابوطالب میں محصور رکھا یہاں تک کہ وہ لوگ درختوں کے پتے چبانے پر مجبور ہو گئے اور بچے شدتِ تشنگی سے ریت چوسنے لگے۔ جس حقیقت سے دنیا کا کوئی انسان انکار نہیں کر سکتا ہے لیکن اس کے باوجود پیغمبر اسلامؐ یا بنی ہاشم نے گھٹنے نہیں ٹیکے اور اللہ نے قریش کے مکر کو باطل کر دیا اور ان کا مقاطعہ تین سال کے بعد ناکام ہو گیا۔

۲۔ اب پیغمبرؐ نے حکم پروردگار سے یہ فیصلہ کر لیا کہ مدینہ کی طرف ہجرت کر جائیں کہ وہاں ایک جماعت تیار ہو چکی ہے لیکن جیسے ہی قریش کو اس ارادہ کی خبر ملی فوراً قتلِ پیغمبرؐ کا

منصوبہ بنالیا اور ہر قبیلہ سے ایک ایک شخص کا انتخاب کر لیا تاکہ بنی ہاشم بدلہ لینے کے قابل نہ رہ جائیں اور پیغمبرؐ کا خون تمام قبائل میں تقسیم ہو جائے۔ ورنہ یہ مدینہ پہونچ گئے تو پھر ان کی قیادت وسیادت ختم ہی ہو جائے گی۔

اس منصوبہ کے مکمل ہو جانے کے بعد نبی اکرمؐ کے گھر پر حملہ کر دیا گیا۔ لیکن بستر پر علیؑ بن ابی طالب کو پایا اور ایک جنونی کیفیت کا شکار ہو گئے اور یہ اعلان کر دیا کہ جو محمدؐ کو زندہ یا مردہ لے آئے گا اسے انعام دیا جائے گا۔

اُدھر پیغمبرؐ، اُن کے ہم سفر اور ایک راہنما برابر راستہ طے کرتے جا رہے ہیں اور حکم خدا سے صحیح وسالم ہیں۔ یہ بھی ایک ایسی واضح حقیقت ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

(سیرت حلبیہ ۱/ ۸۰، طبقات ابن سعد ۱/ ۲۰۸ - ۲۰۹)

د۔ نظام کہنہ کی خاطر جنگیں

اس صورت حال میں بھی نہ قریش پیغمبر اسلامؐ اور بنی ہاشم کی شکست کی طرف سے مایوس ہوئے اور نہ پیغمبر اسلامؐ قریش اور کفر و شرک کی ہزیمت کی طرف سے مایوس ہوئے اور مقابلہ جاری رہا۔

جس کے بعد عرب تین حصوں پر تقسیم ہو گئے:

ایک حصہ قریش اور اس کی مشرک قیادت کے ساتھ تھا۔

ایک مختصر حصہ پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ تھا۔

اور تیسرا حصہ غالب آجانے والے کے انتظار میں تھا تاکہ اسی کے ساتھ ہو جائے۔

بدر واحد کے معرکے ہوئے، مشرکین نے یہودیوں سے مل کر احزاب کی جنگ چھیڑی اور مدینہ تک چڑھ آئے لیکن رسول اکرمؐ محفوظ رہے اور مشرک قیادت کو خدائی لشکر کے مقابلہ میں برابر شکست ہوتی رہی یہاں تک کہ ایک دن پیغمبرؐ مکہ میں داخل ہو گئے اور مشرک قیادت گھٹنے ٹیکنے اور اسلام قبول کرنے پر مجبور ہو گئی اور اس طرح تمام عرب جھک گیا اور جزیرۃ العرب پیغمبرؐ کے زیر اقتدار آ گیا اور لوگ دین خدا میں فوج در فوج داخل ہونے لگے۔

ذ۔ نبوت ایک تقدیر کائنات

قبائل قریش نے بنی امیہ کی قیادت میں نبوت پیغمبرؐ کا مکمل طور سے انکار کر دیا۔ اور دین محمدی کو کسی طرح قبول کرنے پر تیار نہ ہوئے اور ہر طرح کا مقابلہ بھی کیا۔ اصنام کی محبت میں نہیں بلکہ پرانے نظام کی محبت میں کہ اگر یہ دین بنی ہاشم کی طرف سے آیا تو بنی ہاشم کو قیادت حاصل ہو جائے گی اور پرانا ڈھانچہ بکھر جائے گا۔ لیکن اس کے باوجود ایک دن اچانک ابوسفیان نے دیکھا کہ خدائی لشکر مکہ کے قریب آگیا ہے اور عباس اسے اس لشکر کا جاہ و جلال دکھلا رہے ہیں اور اس کے دل میں دہشت سمائی جارہی ہے اور وہ اپنے واقعی جذبات کا اظہار کر رہا ہے کہ ایسی ملوکیت تو قیصر و کسریٰ اور بنی الاصفر کے پاس بھی نہیں دیکھی۔ (سیرت حلبیہ ۳/۷۹)

اور عباس اسے کھینچ کر پیغمبرؐ کے پاس لا رہے ہیں اور آپؐ فرما رہے ہیں کہ ابوسفیان، کیا ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ تو کلمۂ توحید پڑھ لے؟ اور وہ کہہ رہا ہے کہ واقعاً میرا خیال ہے کہ اگر کوئی دوسرا خدا ہوتا تو ضرور میرے کام آتا۔

فرمایا پھر میری رسالت کے بارے میں کیا خیال ہے؟

کہا اس کی طرف سے ابھی بھی دل میں کچھ شبہات ہیں!

عباس نے پکار کر کہا ابوسفیان! تیرا برا ہو۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہدے قبل اس کے کہ تیری گردن اڑا دی جائے۔

گردن کا نام سنا تو لرز گیا اور سمجھ گیا کہ اب بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اور رسول اکرمؐ کی طرف دیکھ کر سوچنے لگا کہ آخر یہ کس طرح غالب آگئے ہیں۔ آپؐ نے وحی الٰہی کے ذریعہ اس کے خیالات کا مشاہدہ کر کے فرمایا کہ "اللہ کے ذریعہ"۔

اب قبائل قریش کو اندازہ ہوگیا کہ یہ نبوت ایک تقدیر کائنات ہے جس سے کوئی مفر نہیں ہے اور یہ بشری اختیارات کے دائرہ سے باہر ہے لہٰذا اسے قبول کر لینا چاہیئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس طرح قدیم سیاسی نظام تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا لہذا اب دوسرے محاذ پر مقابلہ کرنا چاہیئے اور بنی ہاشم کو نبوت کے علاوہ کسی دوسرے شرف کا مالک نہ بننے

دینا چاہیئے۔

ہاشمی عظمت کے مقابلہ میں پیش پیش کون؟

اس بات پر تو سارے قبائل قریش متحد تھے کہ بنی ہاشم کی نبوت نے ایک طوفان برپا کر دیا ہے اور اس آبائی سیاسی نظام کے تار و پود بکھیر دئیے ہیں جس کی بنیاد قبائل کے درمیان مناصب کی تقسیم پر تھی اور بنی مطلب بن عبد مناف کے علاوہ کوئی اس نبوت کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ لیکن سب سے زیادہ پُرجوش اور مخالفت میں پیش پیش بنی امیہ تھے جن کی تمامتر کوشش یہ تھی کہ اب خلافت و نبوت ایک خاندان میں جمع نہ ہونے پائیں اور اس کے مختلف اسباب تھے۔

۱۔ بنی ہاشم اور بنی امیہ کے درمیان اسلام کے پہلے سے شدید عداوت چلی آرہی تھی اور بنی امیہ کے دل بغض و حسد سے بھرے ہوئے تھے۔

۲۔ ہاشمی نبوت نے بنی امیہ کی قیادت کے منصب کا خاتمہ کر دیا تھا۔

۳۔ بنی ہاشم نے میدان جنگ میں بنی امیہ کے تمام سرداروں کو تہ تیغ کر دیا تھا اور وہ کسی قیمت پر انھیں برداشت نہ کر سکتے تھے، خصوصیت کے ساتھ ابو سفیان کی زوجہ اور معاویہ کی ماں ہندہ نے نمایاں طور پر اس حسد و بغض کا اظہار کیا جب جناب حمزہ کی شہادت کے بعد ان کے جسم کے ٹکڑے کئے، اور ان کے کلیجہ کو چبانے کا ارادہ کیا۔

لیکن مجبوری یہ تھی کہ نبوت کی کامیابی اور اس کی نورانیت نے انھیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ علی الاعلان کسی بغاوت کا اظہار نہ کر سکیں اور انھیں یہ بات ستا رہی تھی کہ انھوں نے بہت دیر میں اسلام قبول کیا ہے اور ہر معرکہ میں اسلام کے خلاف جنگ کی ہے۔

نیا موجۂ طوفان

"نبوت اور حکومت ایک خاندان میں جمع نہیں ہو سکتی"۔

یہ نظریہ دھیرے دھیرے ایک طوفان کی شکل اختیار کر گیا جو دلوں کے اندر جوش

مار رہا تھا لیکن اس پر وجود پیغمبرؐ نے باندھ باندھ رکھا تھا اور تمام صحابہ اس قیادت کے زیر اثر متحد تھے، پروردگار بھی اس کی مسلسل تائید کر رہا تھا کہ ان میں سے کوئی ایک عنصر بھی کم ہو جاتا تو اس کی قانونی شکل ختم ہو جاتی یا اس کے ماننے والے کالے بیل کے جسم پر سفید تل ہو کر رہ جاتے اور اقتدار، غلبہ حاصل کرنے والے کے ہاتھ میں چلا جاتا۔

س۔ پاکیزہ قرابت خلافت راشدہ کی شرعی بنیاد

جب تینوں مہاجرین (ابوبکر، عمر، ابوعبیدہ) سقیفہ بنی ساعدہ میں داخل ہوئے تو اپنے استحقاق کے لئے اس طرح استدلال شروع کیا:

ابوبکر ـــ ہم قبیلۂ رسول اکرمؐ سے ہیں لہٰذا تم لوگ (انصار) دین میں ہمارے اور رسول اکرمؐ کے وزیر اور مددگار رہو۔

عمر ـــ دو تلواریں ایک نیام میں جمع نہیں ہو سکتی ہیں۔ خدا کی قسم عرب تمہاری (انصار) حکومت پر راضی نہ ہوں گے۔ اس لئے کہ نبوت تم میں نہیں تھی اور ہمارے پاس ان کے مقابلہ میں واضح برہان اور مستحکم دلیل موجود ہے۔ ہم ان کے رشتہ اور قبیلہ والے ہیں۔ ہمارا مقابلہ وہی کرے گا جو باطل کا پرستار۔ گنہگار یا ہلاکت میں پڑ جانے والا ہوگا۔

(الامامۃ والسیاسۃ ص ۶۔۸)

انصار نے اس تقریر پر یہ ردعمل ظاہر کیا کہ "اس طرح ہم علیؑ کی بیعت کریں گے کہ وہ اس پوری تقریر کا مکمل مصداق ہیں"۔ اگرچہ حضرت علیؑ اس وقت موجود نہیں تھے۔

(طبری ۳/۱۹۸، شرح نہج البلاغہ ۲/۲۶۶)

مگر تھوڑی دیر میں ابوبکر کا معاملہ مکمل ہو گیا اور انھوں نے حضرت علیؑ کو بیعت کرنے کے لئے طلب کر لیا۔

آپ نے فرمایا کہ میں اس امر کا تم سے زیادہ حقدار ہوں۔ تمہارا فرض ہے کہ میری بیعت کرو نہ یہ کہ مجھ سے بیعت طلب کرو۔ تم نے اس امر کو انصار سے اس بنیاد پر لیا ہے کہ تم پیغمبرؐ کے قرابت دار ہو اور اب مجھ سے بھی غصب کرنا چاہتے ہو جب کہ میں تم سے قریب تر ہوں۔

کیا تم نے انصار سے یہ نہیں کہا ہے کہ تم اس بنیاد پر حقدار ہو کہ پیغمبرؐ تم میں سے ہیں اور انھوں نے اسی بنیاد پر قیادت اور امارت تمھارے حوالے کر دی ہے تو اب میں بھی یہی احتجاج کر رہا ہوں کہ ہم حیات و موت کے ہر مرحلہ پر پیغمبرؐ سے زیادہ قریب تر ہیں لہٰذا یہ حق ہمیں ملنا چاہیئے۔

ص۔ نیا انقلاب

عمر بستر مرگ پر امت کے مستقبل کے بارے میں سوچ رہے ہیں اور اسکی مختلف شکلوں پر غور کر رہے ہیں:

ابو عبیدہ زندہ ہوتے تو انھیں بنا دیتا۔

معاذ بن جبل باقی ہوتے تو انھیں کو بنا دیتا۔

خالد بن ولید ہوتے تو انھیں خلافت دے دیتا۔

سالم مولیٰ ابو حذیفہ موجود ہوتے تو انھیں کے سپرد کر دیتا۔

جب کہ سالم موالی میں سے تھے اور ان کا عرب میں کوئی نسب نہیں تھا۔

معاذ انصار میں سے تھے جن کے بارے میں طے ہو چکا تھا کہ ان کی خلافت جائز نہیں ہے۔

خالد بنی مخزوم میں سے تھے جو صحابہ کے دسویں طبقہ میں تھے کہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان ہجرت کی تھی۔

اُدھر عمر نے دوران خلافت بھی ابن عباس سے کہا تھا کہ "ابن عباس تمھیں معلوم ہے کہ تمھاری قوم نے پیغمبرؐ کے بعد تمھیں کیوں مسترد کر دیا ہے؟

ابن عباس کا بیان ہے کہ میں نے جواب دینا پسند نہیں کیا اور یہ کہا کہ اگر مجھے نہیں معلوم ہے تو امیر المومنین کو تو بہر حال معلوم ہے۔!

فرمایا کہ قوم ایک گھرانے میں نبوت اور خلافت کو برداشت نہیں کر سکتی ہے لہٰذا قریش نے اسے اپنے لئے اختیار کر لیا اور ٹھیک کیا۔ کامیاب بھی ہوئے۔

ابن عباس نے کہا کہ اگر بولنے کی اجازت ہو اور آپ غصہ نہ کریں تو میں بھی کچھ کہوں؟

عمر نے کہا بتاؤ؟

ابن عباس نے کہا کہ آپ کا یہ کہنا کہ قریش نے اپنے لئے اختیار کر لیا اور کامیاب بھی ہو گئے تو اگر قریش نے خدائی اختیار کے مطابق اختیار کیا ہوتا تو یقیناً حق ان کے ساتھ ہوتا نہ کوئی رد کر سکتا اور نہ حسد۔! لیکن......

اور یہ بات کہ قوم نبوت و خلافت کو ایک خاندان میں پسند نہیں کرتی ہے تو پروردگار نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ "بعض لوگ خدائی حکم کو پسند نہیں کرتے ہیں تو ہم ان کے اعمال کو برباد کر دیتے ہیں"۔

عمر نے کہا ہیہات ابن عباس۔ تمہاری طرف سے بہت سی خبریں ملتی تھیں اور میں اعتبار نہیں کرنا چاہتا تھا کہ تمہاری منزلت گر جائے گی۔؟

ابن عباس نے کہا کہ اگر وہ باتیں صحیح ہیں تو کوئی حرج نہیں ہے کہ منزلت کم ہو جائے اور اگر غلط ہیں تو میں باطل کو اپنے سے دور رکھنا جانتا ہوں۔

عمر نے کہا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ تم نے یہ کہا ہے کہ قوم نے ہم سے خلافت حسد، ظلم اور تعدی کی بنیاد پر الگ کر دی ہے۔

ابن عباس نے کہا کہ بے شک۔! ظلم تو جاہل و عالم سب پر واضح ہو چکا ہے۔ اور حسد آدم کے ساتھ کیا گیا ہے تو ہم تو انھیں کی اولاد ہیں لہذا محسود بہر حال ہوں گے۔

عمر نے کہا کہ تم بنی ہاشم کے دل سے حسد نہیں جا سکتا۔

ابن عباس نے کہا کہ امیر المومنین! اس قوم کو حسد سے متہم نہ کریں جس سے خدا نے ہر رجس کو دور رکھا ہے اور اسے منزل حق طہارت پر فائز کیا ہے۔ (کامل ۳/۲۴، شرح النہج ۳/۱۰۷، تاریخ بغداد)

مسعودی نے مروج الذہب میں عمر اور ابن عباس کے جس مکالمہ کا ذکر کیا ہے اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ایک فکری انقلاب پیدا ہو گیا تھا اور حیاتِ پیغمبرؐ کے دوران سینوں کے اندر گھٹنے والا طوفان نمایاں ہو گیا تھا۔

واقعہ کے الفاظ

عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ عمر نے ان کے پاس ایک شخص کو بھیجا کہ حمص کا گورنر مر گیا ہے اور وہ اہل خیر میں سے تھا اور اہل خیر دنیا میں بہت کم ہیں اور امید یہ ہے کہ تم انھیں میں سے ہوگے۔ میرے دل میں تمھاری طرف سے بہت سی باتیں ہیں جن کا اظہار نہیں کر سکتا۔ کیا تم حمص کی گورنری کر سکتے ہو؟

ابن عباس نے کہا کہ اس وقت تک نہیں۔ جب تک وہ باتیں نہ بتائیے جو آپ کے دل میں ہیں۔

عمر نے کہا کہ تمھیں اس سے کیا مطلب ہے؟

ابن عباس۔ میں جاننا چاہتا ہوں تاکہ اگر وہ باتیں صحیح ہیں تو اُن کے نتائج کے بارے میں سوچوں ورنہ مطمئن ہو جاؤں کہ میں ان الزامات سے بری ہوں اور تمھارے عہدہ کو قبول کر لوں۔ اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ آپ جس بات کو چاہ لیتے ہیں اس میں جلد بازی سے کام کر لیتے ہیں۔

عمر۔ ابن عباس! مجھے صرف یہ خوف ہے کہ مجھے موت آجائے اور تم عہدہ پر برقرار رہو اور لوگوں کو اپنی طرف دعوت دیتے رہو جبکہ تم اس امر کے اہل نہیں ہو۔ کہ رسول اکرمؐ نے دوسروں کو حاکم بنایا ہے تمھیں نہیں بنایا ہے۔

ابن عباس۔ یہ بات تم نے دیکھی ہے تو اس کا سبب کیا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ سوچا ہے؟

عمر۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ تم کو نااہل سمجھتے تھے یا انھیں یہ خوف تھا کہ اس طرح تم اس منزلت سے فائدہ اٹھا لوگے اور عتاب نازل ہو جائے گا۔

ابن عباس۔ میری نظر میں مناسب یہی ہے کہ میں تمھارے لئے کام نہ کروں۔

عمر۔ کیوں؟

ابن عباس۔ موجودہ صورت حال میں میں کام کروں گا تو تمھاری آنکھ میں تنکا ہی

بنا رہوں گا۔

عمر۔ پھر کوئی دوسرا آدمی بتاؤ۔

ابن عباس۔ اسے بناؤ جو تم سے صحیح ہو اور تمھارے حق میں صحیح ہو۔ (مروج الذہب مسعودی ۲/ ۲۵۳-۲۵۴)

گویا حضرت عمر کو مصلحت مسلمین کا اسقدر خیال تھا کہ اپنے مرنے کے بعد بنی ہاشم کے اقتدار کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اور مذکورہ مقولہ ایک طوفان کی شکل اختیار کر گیا تھا اور اس نے اپنے کو قوم کے ذہنوں پر اس طرح مسلط کر دیا تھا کہ حکومت کا ایمان بھی اسی فلسفہ پر تھا اور عوامی اکثریت کا بھی۔ اس لئے ہاشمی اقتدار کو روکنے کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں تھا اور یہ قانون بنی ہاشم کے تمام امتیازات کا بدل ہے اور بقول حضرت عمر قریش کی ہدایت اور اس کی توفیق و کامیابی کا بہترین مظہر ہے۔

دوسری طرف ابوسفیان کو حکومت کی طرف کھینچنے کی کوشش، اس کے ہاتھ میں تمام صدقات کو چھوڑ دینا۔ اس کے بیٹے یزید کو قائد لشکر شام بنا دینا۔ اس کے دوسرے بیٹے کو اس لشکر کا دوسرا قائد نامزد کر دینا۔ پھر یزید کو والیٔ شام بنا دینا۔ ان تمام امور نے حکومت اور طلقاء کے درمیان رابطے مستحکم کر دئے تھے اور اس کی بنیاد یہ قرار پائی تھی کہ بنی ہاشم نبوت اور حکومت دونوں پر قبضہ نہ کرنے پائیں اور اس طرح اس نظریہ کو مکمل استحکام حاصل ہو گیا اور وہ قوم کے ذہنوں میں راسخ ہو گیا۔

ض۔ نظریۂ عدم اجتماع خلافت و نبوت کی شرعی توجیہ

یہ نظریہ اگرچہ بنیادی طور پر جاہلیت کی پیداوار ہے اور اسلامی نصوص سے مکمل طور پر متصادم ہے۔ اسلام نظام میں داؤدؑ پیغمبر تھے اور ان کے فرزند سلیمانؑ کے پاس ان کی خلافت تھی اور اس طرح نبوت اور خلافت ایک ہی گھرانے میں تھی۔ انبیاء کرام اور ان کی ذرّیتوں کو حکم و نبوت و کتاب سب عطا کیا گیا ہے اور کسی نے اعتراض نہیں کیا کہ ایک خاندان میں ان کا اجتماع نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ فضل و کرم خدا کے ہاتھ میں ہے،

وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اور خلافت دنیاوی اقتدار سے پہلے دینی قیادت ہے اور خلیفہ نبی کا قائم مقام ہوتا ہے جس کا کام بیان احکام اور تطبیق نظام ہے اور یہ کام ایک فنی کام ہے جس کی یقینی صلاحیت کو پروردگار کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے۔

اگر کوئی شخص اسلام کے سیاسی نظام کے دفعات واصول سے باخبر ہے تو اس پر یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس جاہلیت زدہ نظریہ نے اسلام کے سیاسی نظام کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے اور اس کو بالکل کھوکھلا بنا ڈالا ہے۔ اب اسلام الٰہی عقیدہ کے بجائے ایک دنیاوی نظام ہوگیا ہے جس کی شکل عام نظاموں سے مختلف ہے لیکن روح بالکل ایک جیسی ہے۔

اس سے بالاتر یہ کہ اب اسلامی قیادت و ریاست ایک خوشگوار لقمہ ہے جسے ہر غلبہ حاصل کرنے والا کھانا چاہتا ہے اور اس کا خیال یہ ہے کہ غلبہ کے ذریعہ کرسی نبوت یا حصیر نبوت پر بیٹھ کر جبۂ اسلام زیب تن کر لینے والا خلیفۃ المسلمین ہو جاتا ہے۔ چاہے وہ طلیق ہی کیوں نہ ہو اور ساری زندگی اسلام سے جنگ ہی کیوں نہ کی ہو۔

اب ہر حیلہ و وسیلہ سے اسلام سے جنگ کرنے والا اور بدرجہ مجبوری کلمہ پڑھ لینے والا طلیق بھی اس مہاجر کا حاکم ہے جس نے اسلام کی طرف سے جہاد کیا ہے اور خدا و رسول کے نصوص سے معین ہونے والا ولی ایک باشندہ ہے اور بس!

اب جاہل بولے گا اور عالم چُپ رہے گا۔ محاصرہ کرنے والا آگے بڑھے گا اور محاصرہ میں رہنے والا پیچھے رہے گا۔ صرف اس لئے کہ قبائل کو انصاف دیا جا سکے اور نبوت و خلافت کو ایک خاندان میں جمع نہ ہونے دیا جائے۔

یا دقیق تر لفظوں میں اسلام سے پہلے والے سیاسی نظام کو واپس لایا جا سکے اور اسے نیا رنگ دیا جا سکے۔ پہلے جاہلی دور میں مناصب شرف کی تقسیم قبائل کی بنیاد پر ہوتی تھی اور ہر قبیلہ کا ایک حصہ تھا اور اب ہر شخص کو رئیس مملکت اسلامیہ بننے کا حق ہے اور ہر قبیلہ کو اس میں شرکت اور منصب تقسیم کر لینے کا حق ہے۔ رہ گئے پروردگار کے سیاسی احکام تو ان کی دنیا الگ ہے اور وہ احکام اس سیاسی طرز فکر کے ساتھ نہیں

چل سکتے ہیں جو مکہ میں اسلام کی آمد سے پہلے رائج تھے۔

نظریۂ عدم اجتماع نبوت وخلافت کے نتائج

۱۔ ان سارے امتیازات کا خاتمہ ۔۔ جو اسلام سے ہر انداز سے جنگ کرنے والوں پھر مجبوراً کلمہ پڑھ لینے والوں اور اسلام کے ساتھ ہر معرکہ میں ثابت قدم رہنے والوں اور پیغمبر اسلامؐ کی مدد کرکے اسلامی حکومت قائم کرنے والوں کے درمیان تھے۔

اب سب مسلمان ہیں اور سیاسی اعتبار سے کسی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سب مسلمان ہیں۔ سب جنتی ہیں۔

تین سال تک شعب ابوطالب میں محصور رہنے والے اور محاصرہ کرنے والے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ بھی مسلمان ہو گیا ہے اور اسلام نے پچھلے تمام معاملات کو ختم کر دیا ہے۔

اب سید الشہداء حمزہ پلٹ کر دنیا میں آجائیں تو ان کا وہی سیاسی درجہ ہوگا جو اُن کے قاتل وحشی کا ہوگا۔ قاتل و مقتول، مہاجر و طلیق، جاہل و عالم سب ایک جیسے ہوں گے۔ بلکہ جاہل غلبہ حاصل کرلے تو عالم پر اس کی اطاعت اور اس کے احکام کا اتباع واجب ہوگا۔

اگر ایک مقام پر حضرت علیؑ بن ابی طالب جیسا عالم اور انصار کا کوئی عالم جمع ہو جائیں تو انصاری، ہاشمی پر مقدم ہوگا جیسا کہ حضرت عمر نے وقت آخر فرمایا تھا کہ اگر معاذ بن جبل زندہ ہوتے تو انھیں کو خلیفہ بنا دیتا۔ حالانکہ اس وقت علیؑ بن ابی طالب موجود تھے اور انھیں یاد نہ آئے بلکہ وہ تو علیؑ کے ہوتے ہوئے خالد کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے جس نے ہر معرکہ میں اسلام سے مقابلہ کیا تھا۔

ان کی نظر میں سالم جیسا غلام بھی خلافت کا اہل تھا جس کا عرب میں کوئی نسب نہ تھا۔ اور علیؑ بن ابی طالب خود انھیں کے اقرار اور میدان غدیر میں مبارکباد کے مطابق سالم، عمر، ابوعبیدہ سب کے ولی تھے۔

۲۔ اختلاف کی تخم ریزی

جب یہ طے ہوگیا کہ مہاجر و طلیق، قاتل و مقتول، محاصِر و محاصَر میں کوئی فرق نہیں ہے اور سب کو اسلام کے سمجھنے اور اپنی سمجھ کے گرد لوگوں کو جمع کرنے کا حق ہے تو اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ متعدد مرجعیتیں وجود میں آئیں۔ متعدد مفاہیم اسلام پیدا ہوں اور ہر فریق اپنے کو برحق قرار دے۔ کوئی شمال میں جائے اور کوئی جنوب میں۔ کوئی مشرق کا رُخ کرے اور کوئی مغرب کا۔۔۔۔ اور اس طرح کوئی ایک مرجع نہ رہ جائے جس کا کلام حجت شرعی ہو اور سب اس کا اعتراف کریں۔

جس کے نتیجہ میں نرم زمین میں اختلافات کی تخم ریزی ہوجائے اور حضرت علیؑ اور ایک مرد طلیق کے درمیان ترجیح کا فیصلہ عوام الناس کریں کہ علیؑ اور طلیق میں سیاسی قانون کی بنا پر کوئی فرق نہیں رہ گیا ہے اب دونوں مسلمان، دونوں صحابی اور دونوں جنتی ہیں اور قانوناً کوئی جواز کسی ایک کو مقدم کرنے کا نہیں ہے۔ متساوی افراد کے درمیان بلاوجہ ترجیح دینا بھی خلاف عقل و منطق ہے۔؟

گویا مختلف شخصیات ایک قیمت کے مختلف سکّے ہیں جن میں حجم، شکل، مقدار اور قیمت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے اور مکمل مساوات پائی جاتی ہے لہذا کسی کو بھی اٹھایا جاسکتا ہے اور کسی کو بھی چھوڑا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی اتفاق حاصل بھی ہوجائے تو وہ صرف ظاہری ہوگا ورنہ اندر اندر ایک کینسر ہے جو بڑھ رہا ہے اور ایک دن ناقابل علاج سرطان کی شکل میں ظاہر ہونے والا ہے۔ جس کے بعد اتحاد امت پارہ پارہ ہوجائے گا اور امت شریعت و قانون کے دائرہ سے نکل کر جہالت اور غموض کے اندھیرے میں ڈوب جائے گی۔

۳۔ ریاست اسلامی بنی ہاشم کے علاوہ سب کا حق ہے۔

اب اسلام کا کوئی قانون کسی بھی شخص کے رئیس اسلام ہونے سے نہیں روک سکتا ہے، بشرطیکہ وہ کرسیٔ اقتدار تک پہونچ جائے اور لوگ اس کے غلبہ و استبداد کو قبول کرلیں اور وہ بنیادی طور پر بنی ہاشم میں نہ ہو ورنہ ایک گھرانے میں نبوت و حکومت کا اجتماع ناقابلِ برداشت ہوگا۔

اس عمومی حق نے طمع ریاست کو امت کے ذہن پر ایک کابوس کی شکل میں مسلط کردیا ہے اور امت کا سکون و استقرار غارت ہوگیا ہے۔ اب اسلام ہر طماع اور حریص انسان کی تجربہ گاہ ہے اور تمام شرعی اور سیاسی اصول معطل ہوکر رہ گئے ہیں۔

رئیس کس قبیلہ کا ہے؟ اس کا دین کیسا ہے؟ اس کے علم کی حد کیا ہے۔ اس کے سوابق اور کارنامے کیا ہیں اور یہ کن لوگوں پر حکومت کرے گا؟

یہ ثانوی امور ہیں جن کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور نہ ان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ غالب غالب ہے اور مغلوب کی رائے پر قابو لینا ایک فن ہے جو صرف غالب آجانے والے کے پاس ہے۔

اب یزید جیسے فاسق و فاجر کو اسلامی مملکت کا رئیس ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا ہے کہ وہ معاویہ جیسے رئیس کا فرزند ہے۔ اور حضرت حسینؑ بن علیؑ جو بنص رسولؐ سردار جوانان جنت، ریحان رسولؐ اور امام شرعی ہیں انھیں کوئی یزید کی رعایا بننے سے نہیں بچا سکتا ہے اس لئے کہ دونوں مسلمان اور دونوں جنتی ہیں؟ — یزید قاتل مجرم بھی جنتی ہے اور حسینؑ مظلوم شہید بھی جنتی ہیں؟ — دونوں صحابی ہیں اور صحابی جنتی ہوتا ہے — اور جو تنقید کرے وہ زندیق و کافر ہوتا ہے اور اس کا بائیکاٹ واجب اور اس کی نماز جنازہ حرام ہو جاتی ہے۔؟

۴۔ خلط ملط

اس نظام جاہلیت نے تمام اوراق زندگی۔ حق و باطل۔ خیر و شر، حنظل و شہد سب کو مخلوط کر دیا ہے اور متاخر کو مثل متقدم، لاحق کو مثل سابق۔ قاعد کو مثل مجاہد اور قاتل کو مثل مقتول بنا دیا ہے۔ محاصِر اور محاصَر میں کوئی فرق نہیں ہے اور اسلام سے جنگ کرنے والے اور اسلام کی طرف سے جنگ کرنے والے سب ایک درجہ میں ہیں۔ سب دین خدا میں داخل ہو چکے ہیں۔ سب نے نبی اکرمؐ کی زیارت کر لی ہے، سب صحابی بن چکے ہیں اور سب جنتی ہو گئے ہیں۔

صادقین گم ہو گئے۔ شہروں میں منتشر ہو گئے اور بقول معاویہ کالے بیل میں سفید تل ہو گئے۔ اسلام کا سیاسی نظام غارت ہو گیا اور متقدم، متاخر بنا دئے گئے اور متقدم، متاخر کر دئے گئے۔ وللہ عاقبۃ الامور

فصل ہشتم

مقدمات انحراف

۱۔ رسول اکرمؐ بستر موت پر

رسول اکرمؐ اپنے بیت الشرف میں بستر مرگ پر ہیں اور جبریل کی زیارت کا سلسلہ جاری ہے۔ آپ مستقبل امت سے بخوبی باخبر ہیں اور اپنا دور رسالت مکمل کر کے سارا پیغام الٰہی پہونچا چکے ہیں۔ مسلمانوں کو تمام احکام سے آگاہ کر چکے ہیں اور اپنے گرد و پیش کے حالات سے باقاعدہ طور پر باخبر ہیں کہ یہ سکوت ایک طوفان کا پیش خیمہ ہے اور اس سکون کے بعد آندھیاں چلنے والی ہیں ـ اور یہ آندھیاں اگر چل گئیں اور یہ آتش فشاں اگر پھٹ گیا تو سارا شرعی سیاسی نظام تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام اپنے عظیم ترین اسلحہ سے محروم ہو جائے گا اور دعوت و دولت کا بنیادی محرک معطل ہو جائے گا۔

ظاہر ہے کہ رسول اکرمؐ جیسا انسان نہ ان آندھیوں سے مرعوب ہو سکتا ہے اور نہ اس دھماکہ کے انتظار میں چُپ رہ سکتا ہے۔ انھیں احساس ذمہ داری اور امت کے حال پر رحم و کرم سے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی ہے ــ اور دین اگرچہ کامل ہو چکا ہے اور نعمتیں تمام ہو چکی ہیں اور امت کے تمام ضروری مسائل (بشمول احکام بول و براز) بیان ہو چکے ہیں ــ لیکن پھر بھی ضرورت ہے کہ امت کے لئے اس موقف کی وضاحت کر دی جائے جس کے بعد گمراہی کا امکان نہ رہ جائے اور ہدایت حتمی و یقینی ہو جائے۔ امت تمام ناگہانی خطرات سے بسلامتی باہر نکل آئے اور جو حادثات منھ پھیلائے وفات پیغمبرؐ کا انتظار کر رہے ہیں ان کا اثر نہ ہونے پائے کہ اسلام کا صاف ماحول مکدر ہو جائے اور اس کی حرکت رُک جائے یا اس کا جادہ تبدیل ہو جائے۔

خانۂ رسالت عیادت کرنے والے صحابۂ کبار سے چھلک رہا ہے لہٰذا آپ نے موقع غنیمت جانا کہ امت کے لئے اس موقف کی وضاحت کردیں اور اسلام کے مستقبل کے خطوط معین کردیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ آؤ میں تمھارے واسطے ایک ایسا نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہوگے۔

اس رسالتی پیشکش میں کیا غلطی ہے؟ کون مسلمان گمراہی کے مقابلہ میں تحفظ نہیں چاہتا ہے؟ یہ سب حضور کس کی مصلحت اور کس کے فائدہ کے لئے کر رہے ہیں؟ پھر ہر مسلمان کو وصیت کرنے کا حق ہے اور ہر مرنے والے کو اختیار ہے کہ موت سے پہلے جو چاہے کہے۔ اس کے بعد سامعین کو اختیار ہے کہ عمل کریں یا نہ کریں۔

پھر پیغمبرؐ ایک عام انسان بھی نہیں ہیں کہ انھیں اتنے ہی حقوق حاصل ہوں وہ نبی مرسل اور قائد امت ہیں۔ لیکن اس کے باوجود عمر بن الخطاب درمیان میں حائل ہوگئے اور صاف کہہ دیا کہ پیغمبرؐ پر مرض کا غلبہ ہے۔ تمھارے پاس کتاب خدا موجود ہے اور وہی کافی ہے جس کے بعد حاضرین میں اختلاف پیدا ہوگیا۔

بعض نے کہا کہ قلم دوات دے دو تاکہ وہ تحریر لکھ دیں جس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہوں اور بعض نے عمر ہی کی بات دہرادی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قدر ہنگامہ ہوا کہ حضورؐ نے فرمادیا کہ میرے پاس سے نکل جاؤ۔ (صحیح بخاری کتاب المرض ۷/۵، مسلم ۵/۵ ۷، شرح مسلم نووی ۹۵/۱۱، مسند احمد ۴/۳۵۶ حدیث نمبر ۲۹۹۲، شرح النہج ۶/۵۱)

دوسری روایت کی بنا پر جب قلم دوات مانگا کہ وہ نوشتہ لکھ دیں جس کے بعد گمراہ نہ ہو، تو آپس میں جھگڑا شروع ہوگیا جب کہ نبی کے پاس جھگڑا جائز نہیں ہے۔ اور بعض لوگوں نے کہہ دیا کہ "رسول اللہ ہذیان بک رہے ہیں"۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں اسی حال میں بہتر ہوں۔ (صحیح بخاری ۲/۲۱، صحیح مسلم ۲/۱۶، مسند احمد ۱/۲۲۲-۲۸۶/۳)

بخاری کی تیسری روایت کے مطابق آپؐ نے فرمایا کہ "ایک کاغذ لاؤ میں وہ نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہو"۔ تو عمر بن الخطاب نے کہا کہ پیغمبرؐ پر مرض کا غلبہ ہے اور ہمارے لئے کتاب خدا کافی ہے اور آپس میں اختلاف اور ہنگامہ شروع ہوگیا جس کے بعد آپؐ نے

فرمایا کہ میرے پاس سے نکل جاؤ نبی کے پاس جھگڑا جائز نہیں ہے۔ (صحیح بخاری ۱/ ۳۷)

بخاری کی چوتھی روایت۔ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ "آؤ میں ایک نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہو" تو لوگوں نے آپس میں جھگڑا شروع کر دیا جب کہ نبی کے سامنے جھگڑا جائز نہیں ہے اور بعض لوگوں نے کہہ دیا انھیں کیا ہو گیا ہے کیا ہذیان بک رہے ہیں؟ ذرا دریافت تو کرو۔ لوگوں نے دریافت کرنا چاہا فرمایا مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ تمھاری ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔ (بخاری ۵/ ۱۳۷، طبری ۳/ ۱۹۲-۱۹۳)

پانچویں روایت۔ "لاؤ کاغذ لاؤ وہ تحریر لکھ دوں جس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہو"۔ لوگوں نے جھگڑا شروع کر دیا جب کہ نبی کے پاس جھگڑا جائز نہیں ہے۔ لوگوں نے کہا انھیں کیا ہو گیا ہے۔ دریافت کرو کیا ہذیان بک رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں اسی حال میں بہتر ہوں"۔ (بخاری ۲/ ۱۳۲ - ۴/ ۶۵-۶۶)

چھٹی روایت۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "آؤ ایک نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہوگے"۔ تو عمر نے کہا کہ نبی پر مرض کا غلبہ ہے اور تمھارے پاس قرآن موجود ہے اور وہی کافی ہے۔ اس کے بعد گھر والوں میں اختلاف شروع ہو گیا۔ بعض لوگوں کہا کہ قلم کاغذ دے دو، بعض نے عمر کی بات دُہرا دی۔ جب اختلاف اور ہنگامہ زیادہ ہوا تو آپ نے فرمایا کہ میرے پاس سے نکل آؤ۔

(صحیح بخاری ۵/ ۱۶۱)

ایک روایت میں ہے کہ عمر نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ رسولؐ ہذیان بک رہے ہیں۔
(تذکرۃ الخواص ص ۶۲، سر العالمین غزالی ص ۲۱)

خود عمر نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انھیں نے مرسل اعظمؐ کو کتابت سے روک دیا تاکہ اس مسئلہ کو علیؑ کے حوالے نہ کر دیں۔ (شرح النہج معتزلی ۳/ ۱۱۴ سطر ۲۷، طبع اول مصر و بیروت و جلد ۱۲ ص ۷۹، سطر ۳۔ تحقیق محمد ابو الفضل ۳/ ۸۰ دار مکتبۃ الحیاۃ ۳/ ۱۶۷ دار الفکر)

۲۔ مقابلہ کا تجزیہ

فریق اول ۔ حضرت محمد رسول اللہ، خاتم النبیین۔ رئیس مملکت اسلامیہ

فریق دوم ۔ عمر بن الخطاب، صحابی معروف، وزیر حکومت اسلامی اور خلیفۂ دوم بعد رسولؐ۔

جائے مقابلہ ۔ خانۂ رسول اکرمؐ
گواہ ______ صحابۂ کبار

مقابلہ کے ابتدائی نتائج

۱۔ حاضرین کی تقسیم

اس مقابلہ کے بعد مجمع دو حصوں پر تقسیم ہوگیا:

ا۔ "فاروق" کے مویدین جن کا منشا یہ تھا کہ رسول اکرمؐ کو تحریر نہ لکھنے دی جائے اور ان کی دلیل یہ تھی کہ فاروق ایک بڑے صحابی ہیں، انھیں اسلام سے بیحد ہمدردی ہے اور پیغمبر اسلامؐ مرض کے عالم میں ہیں لہٰذا انھیں تکلیف دینا مناسب نہیں ہے۔ پھر کتاب خدا ہدایت کی ضمانت دینے کے لئے موجود ہے لہٰذا کسی دوسری تحریر کی ضرورت نہیں ہے۔

ب۔ پیغمبر اسلامؐ کے مویدین جن کا کہنا یہ تھا کہ حاکم و محکوم ۔ رسول اور امتی کے درمیان مقابلہ کی کوئی تاویل نہیں ہوسکتی ہے۔

رسول اکرمؐ کے تعلیمات وحی الٰہی کے ذریعہ پروردگار کی طرف سے آتے ہیں اور فاروق کے پاس صرف ذاتی اجتہاد اور رائے ہے۔

رسول اکرمؐ مملکت اسلامی کے رئیس ہیں اور فاروق کا شمار رعایا میں ہوتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کو اس بات کا موقع ملنا چاہیئے کہ وہ اپنی بات کہیں اور اگر لکھنا چاہتے ہیں تو لکھیں۔ وہ نبی ہیں اور تاحیات نبی رہیں گے۔ بیماری ان کی نبوت کا خاتمہ نہیں کرسکتی ہے۔ وہ آخری سانس تک رئیس مملکت اسلامی ہی رہیں گے۔ پھر کم سے کم وہ ایک بندۂ مسلم تو ہیں جسے اپنی بات کہنے کی آزادی ملنی چاہیئے اور جو کچھ کہنا یا لکھنا چاہیں اس کا حق ملنا چاہیئے۔

پھر معاملہ ان کے گھر کے اندر کا ہے اور ہر انسان کم سے کم اپنے گھر کے اندر تو آزاد ہوتا ہے۔ یہ ساری پابندیاں سرکار دو عالمؐ ہی کے لئے کیوں ہیں۔؟

۲۔ ایک نئی طاقت کا ظہور

اس مقابلہ سے حضرت فاروق، ایک نئی طاقت کی شکل میں نمودار ہو گئے۔ جو

پیغمبر اکرمؐ کی راہ میں حائل ہونے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں اور انھیں ان کے مقاصد سے روک بھی سکتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں ایک بڑی جماعت بھی تیار کر سکتے ہیں اور حالات کو خود ان کی موجودگی میں اپنے منشار کے مطابق موڑ سکتے ہیں۔ چنانچہ آجتک کسی کو یہ نہیں معلوم ہے کہ انصار کے ذہن میں سقیفہ میں اجتماع کا خیال کس نے پیدا کیا؟ اس اجتماع کی دعوت کس نے دی؟ سارے مہاجرین میں صرف عمر کو اس اجتماع کی خبر کس طرح ہو گئی؟ اور پھر مہاجرین میں صرف تین ہی افراد کیوں جمع ہوئے؟ باقی افراد کو خبر کیوں نہیں دی گئی جب کہ مقابلہ سخت تھا۔؟

عمر نے صرف ابو بکر کو اطلاع کیوں دی؟ اور اگر وہ اہلبیتؑ کے ساتھ شریک غم تھے تو وہاں کے دوسرے افراد کو اطلاع کیوں نہ ہوئی؟ ابو بکر و عمر کو راستہ میں صرف ابو عبیدہ ہی کیوں مل گئے؟ اور وہ کس طرف سے کس طرف جا رہے تھے۔؟

حقیقت یہ ہے کہ حضرت فاروق اس پورے قضیہ میں مرکزی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ لمحہ بہ لمحہ حالات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ سقیفہ میں بھی ان کا رول اتنا مرکزی تھا کہ اگر چاہتے تو خود ہی خلیفہ بن جاتے۔ باہر نکلنے کے بعد بھی بیعت عام کی راہ انھوں نے ہموار کی ہے اور مہاجرین تک یہ خبر انھیں نے پہونچائی ہے کہ ہم نے اور انصار نے ابو بکر کی بیعت کر لی ہے لہٰذا اب فوراً ان کی بیعت کر لیں۔ جس کے بعد عثمان اور بنی امیہ نے بیعت کا سلسلہ شروع کر دیا اور ان کا شمار سب سے پہلے بیعت کرنے والوں میں ہو گیا۔

پھر عمر ہی نے بیعت کرنے والوں کا وہ لشکر تیار کیا تھا جو درِ زہراؑ پر آ کر حضرت علیؑ اور ان کے ساتھیوں کو "صدیق" کی بیعت کے لئے نکالنا چاہتا تھا۔

(الامامة والسیاسة ص ۵)

پھر عمر ہی نے آگ اور لکڑیاں جمع کی تھیں کہ اگر لوگ بیعت کے لئے نہ نکلیں تو گھر میں آگ لگا دی جائے۔

پھر عمر ہی نے حضرت علیؑ کو دھمکی دی تھی کہ اگر بیعت نہ کرو گے تو تمھیں قتل کر دیا

جائے گا۔

عمر ہی نے ابو بکر کو مشورہ دیا تھا کہ ابو سفیان کے قبضہ کے صدقات کو انھیں واگذار کر دیا جائے تاکہ اس کی حمایت حاصل کی جا سکے۔ (شرح النہج ۱/ ۳۰۶-۳۰۷، تحقیق حسن تمیمی)

عمر ہی نے ابو بکر سے کہا تھا کہ یزید بن ابو سفیان کو قائد لشکر شام بنا دیا جائے۔

غرض کہ عمر ہی وہ عظیم ترین طاقت تھے جس نے تمام حالات کا رُخ موڑ دیا۔ اور ابو بکر کی خلافت مضبوط کر دی جو زیادہ دیر نہ چل سکی اور انھیں ان کی تمام ریاضتوں کا صلہ مل گیا اور بلا کسی زحمت و مشقت کے خلافت ان کی طرف منتقل ہو گئی اور گویا کہ یہ ایک فطری عمل انجام پایا۔

آج یا کل محققین اس نکتہ کا انکشاف کر لیں گے کہ رسول اکرمؐ سے ٹکرا کر فاروق نے وہ حیثیت پیدا کر لی تھی کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد حکومت اسلامی کی تشکیل میں انھیں بنیادی رول حاصل تھا اور انھوں نے اسلام کے مستقبل کو اس طرح مرتب کیا تھا کہ اب قیامت تک نبوت اور خلافت ایک خاندان میں جمع نہیں ہو سکتی ہیں اور خلافت صرف غلبہ حاصل کرنے والوں کا حق رہے گی چاہے ان کی حیثیت کچھ بھی ہو اور اس کا کوئی جواز ہو یا نہ ہو۔

دو ہمرنگ حادثات

۱۔ صدیق مرض الموت کے عالم میں تھے اور مرض شدید تھا لیکن مشورہ مکمل کرنے کے بعد عثمان کو تنہائی میں بلایا اور وصیت لکھنے کا حکم دے دیا۔ امابعد! .... اس کے بعد بیہوش ہو گئے اور عثمان نے از خود مکمل کر دیا کہ عمر میرا خلیفہ ہوگا۔ ہوش آنے پر پوچھا تو انھوں نے پوری تحریر سُنا دی۔

فرمایا کہ تمھیں یہ خوف تھا کہ کہیں میں مر نہ جاؤں تو قوم میں اختلاف ہو جائے۔

عرض کی بے شک!

فرمایا "شاباش" خدا جزائے خیر دے۔ اور یہ کہہ کر اس تحریر کو نافذ کر دیا۔

(طبری ۳/ ۴۲۹، نظام الحکم للقاسمی ص ۱۷۶، سیرت عمر ابن الجوزی ص ۳۷، تاریخ ابن خلدون ۸۵/۲)

ب۔ عمر مرض الموت میں تھے۔ معالج نے کہہ دیا کہ آج شام ہونا مشکل ہے۔ جو کرنا ہے کر ڈالئے۔ انھوں نے اپنے فرزند عبداللہؓ سے فرمایا کہ کتف لاؤ پھر شدت درد سے فرمانے لگے کہ اگر میرے پاس کل کائنات ہوتی تو مستقبل کے ہولناک مراحل کے فدیہ کے طور پر دے دیتا۔

اس وقت ان کا سر عبداللہؓ کی گود میں تھا۔ فرمایا کہ میرے رخسارے زمین پر رکھ دو۔ عبداللہؓ نے عمل نہ کیا تو پھر اصرار کیا اور سرزنش بھی کی فرمایا کہ اگر خدا نے معاف نہ کیا تو عمر اور مادر عمر دونوں کے لئے ویل ہے۔ (الامامۃ والسیاسۃ ص ۲۱۔۳۱، طبقات ابن سعد)

مذکورہ واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ ابوبکر نے شدت مرض کے باوجود وصیت نامہ لکھا اور عمر نے وصیت کی بلکہ لکھی اور پورا نظام شوریٰ مرتب کیا اور عثمان کی خلافت کی طرف سے اطمینان حاصل کر لیا کہ اب قیامت تک کوئی ہاشمی حکومت نہیں بنا سکتا ہے۔

اور دونوں کی وصیت نافذ بھی ہوئی۔ انھیں موقع بھی دیا گیا حالانکہ دونوں کا مرض الموت شدید تھا۔ صرف جواز یہ تھا کہ ابھی تک خلیفۃ المسلمین ہیں لہٰذا اپنے حقوق کے استعمال کرنے کے مجاز ہیں اور کسی کو روکنے کا حق نہیں ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس متفق علیہ صورت حال کے باوجود کیا اسباب تھے کہ ان دونوں کو شدت مرض اور بیہوشی کے باوجود یہ سارے حقوق دے دئے گئے اور سرکار دو عالمؐ کو ان سارے حقوق سے محروم کر دیا گیا اور انھیں وصیت نامہ لکھنے کا موقع نہ دیا گیا۔

کیا پیغمبر اکرمؐ کو اتنے حقوق بھی حاصل نہیں ہیں جتنے ابوبکر و عمر کو حاصل ہیں؟ اگر دونوں برابر بھی ہیں؟ جب کہ برابری کا کوئی امکان نہیں ہے۔ آپ نبی مرسل اور امام امت ہیں اور ابوبکر و عمر آپ کے تابع اور غلام ہیں۔

آپ کی طرف وحی آتی ہے اور اکثر مرض کی حالت میں آتی ہے۔ (طبقات ابن سعد ۱۹۳/۲)

پروردگار عالم نے آپ کے بارے میں بار بار اعلان کیا تھا "جو رسول دیدے اسے لے لینا اور جس سے روک دے اس سے رک جانا"۔

"تمھارا ساتھی دیوانہ نہیں ہے"۔

"تمھارا ساتھی نہ گمراہ ہوا ہے اور نہ بہکا ہے"۔

"اس کا کلام وحی الٰہی ہے جو برابر نازل ہوتی رہتی ہے"۔

یہ یکبارگی کیا ہوگیا کہ اس شان کے عظیم ترین انسان کے بارے میں کہہ دیا گیا کہ "ہذیان بک رہے ہیں" اور ان کی تحریر کا کوئی بھروسہ نہیں ہے اگرچہ یہ سارے حقائق ایسے ہیں جنھیں دنیا کی کوئی طاقت جھٹلا نہیں سکتی ہے اور نہ ان کا دفاع کر سکتی ہے۔ اور اس واقعہ نے اسلام کے مستقبل کو تباہ کر ڈالا ہے اور مسلمانوں کے تمام مصائب و آلام کا سرچشمہ یہی واقعہ ہے لیکن ہمارے اہلسنت حضرات مسلسل تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہیں اور اسے صرف ایک تاریخی قصہ قرار دینا چاہتے ہیں۔

انھیں یہ اندازہ نہیں ہے کہ اس طرح غلام آقا پر غالب آگیا ہے اور غلام کے سامنے آقا کو حالات کے تماشائی کا درجہ دے دیا گیا ہے کہ غلام جو چاہے وہ ہو جائے اور آقا منھ دیکھتا رہ جائے۔ لوگ محکوم کے گرد جمع ہو جائیں اور یہ اجتماع و غلبہ ایک شرعی دلیل بن جائے اور امت کو ہر دور میں یہ اختیار مل جائے کہ حالات کا تماشہ دیکھتی رہے اور جو غالب آجائے اسی کے ساتھ ہو جائے چاہے اس کا دین و ایمان کچھ بھی ہو۔ (نظام الحکم للقاسمی ص ۲۴۴-۲۴۵)

اب ہر محکوم میں طمع حکومت ہے اور ہر مفضول کو فاضل پر مقدم کیا جائے گا۔ اب کوئی تعجب نہیں ہے اگر معاویہ بن ابی سفیان طلیق بن طلیق اور مولفۃ القلوب میں ہونے کے باوجود کرسیٔ اقتدار تک پہونچ جائے اور خلافت پیغمبرؐ میں اس سے مقابلہ کرے جو نص پیغمبرؐ ولی خدا اور اول المسلمین ہو اور جسے ہر مومن مرد و عورت کا مولا بنایا گیا ہے۔ اور پھر امت کو یہ بھی باور کرایا جائے کہ وہ علیؑ سے افضل اور اصلح ہے۔

اور کوئی حیرت نہیں ہے اگر علماء اسلام کی زبان پر یہ فقرہ آجائے کہ یہ بھی مجتہد ہے

اور وہ بھی مجتہد ہے اور دونوں جنتی ہیں۔

اس پر بھی کوئی تعجب نہیں ہے اگر مروان بن الحکم امیدوار خلافت ہو جائے جبکہ وہ اس حکم بن العاص کا فرزند ہے جس پر سرکار دو عالمؐ کے دور سے دور عمر تک مدینہ میں داخلہ تک بند تھا اور عثمان کے دور حکومت میں اعزاز واحترام کے ساتھ داخل ہوا ہے اور قابل انعام بھی قرار پایا ہے اور اس کا بیٹا عثمان کا رئیس الوزراء اور داماد ہو گیا ہے۔

حاکم و محکوم، مقدم و موخر کے اس خلط ملط کا سلسلہ تاریخ میں یوں ہی جاری رہا یہاں تک کہ ولید بن عقبہ امام حسینؑ پر حکومت کرنا چاہتا ہے اور انھیں نصیحت کر رہا ہے کہ اس بات کو قبول کر لیں جب کہ یہ وہ شخص ہے جس نے صبح کی نماز چار رکعت پڑھانے کے بعد بھی یہ کہا تھا کہ اگر حاضرین کی خواہش ہو تو مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اب یہ شخص امام حسینؑ کا امام اور امیر بننا چاہتا ہے اور ایسی مرجعیت کا طلبگار ہے جس میں امام حسینؑ کو امور دین و دنیا میں اس کی طرف رجوع کرنا پڑے۔ (انا للہ۔ یہ ہیں برکات مقابلہ فاروق)

۴۔ غالب کی کامیابی

اس مقابلہ کے بعد یہ طے ہو گیا کہ جو بھی غالب آجائے وہی کامیاب ہے۔ کوئی بھی ہو اور کیسا ہی ہو۔ اسی کا نام امام المسلمین ہوگا۔ وہی رئیس مملکت اسلامی ہوگا اور وہی دین و دنیا کے تمام امور کا مرجع ہوگا۔ وسائل طاقت اس کے ہاتھ میں ہوں گے۔ سرکاری خزانوں پر اسی کا قبضہ ہوگا۔ جس کو جو چاہے عطا کرے اور جس کو جب چاہے محروم کر دے۔ دین و دیانت کی مقدار کے علاوہ کوئی نگراں نہ ہوگا۔ اسلامی لشکر بھی اسی کے تابع فرمان ہوگا۔ وہ داخلی یا خارجی کسی بھی محاذ پر اسے استعمال کر سکتا ہے۔ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بنانا اس کے اختیار میں ہوگا۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعہ وہ بے ارزش انسان کو ہمالیہ بنا سکے گا اور ہمالیہ کو ذرہ بنا دے گا۔ اس کے موئدین منظر عام پر ہوں گے۔ حل و عقد کے سارے کام ان کے قبضہ میں ہوں گے اور بعد میں وہی مراجع امت ہو جائیں گے۔ اسی نظریہ غلبہ کی وہ بھی ترویج کریں گے اور انھیں وسائل مرجعیت کو وہ بھی استعمال کریں گے۔ معاشرہ کے سردار اور سماج کے روشن ستارے وہی ہوں گے۔ کوئی شخص بھی ان کے ساتھ چلے گا تو اسے

اسی محور کی طرف کھینچ کر لائیں گے اور وہ بھی اسی غلبہ کے ساز پر رقص کرے گا۔ امت میں اسی بنیاد پر اتحاد پیدا ہو جائے گا اور ہر ایک سال کے بعد یہ نظریہ مزید رسوخ پیدا کرے گا اور اس کی جڑیں اور اندر تک چلی جائیں گی۔ اسی کا نام رائے عامہ ہوگا اور یہی سماج کا سیاسی عقیدہ بن جائے گا۔

عترت پیغمبرؐ کی علیحدگی

اسی فضا میں عترت اطہارؑ نے قانون کا نعرہ بلند کیا اور اعلان کیا کہ ہمارا بھی ایک حق ہے جو ہمیں ملنا چاہیئے۔ لیکن لوگ اس حق کے درمیان حائل ہو گئے اور انھیں اس حق سے محروم کر دیا گیا۔

اس سلسلہ کا سب سے پہلا مقابلہ حضرت علیؑ اور ابو بکر کے درمیان ہوا جس میں تمام شرعی، منطقی اور واضح دلائل پیش کئے گئے، اور بشیر بن سعد اس کا گواہ تھا جس نے سب سے پہلے ابو بکر کی بیعت کی تھی ـــ اور اس نے مکالمہ سننے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ "اگر اس بیان کو انصار نے ابو بکر کی بیعت سے پہلے سن لیا ہوتا تو یا علیؑ آپ کے بارے میں دو رائے نہ ہوتی"۔

لیکن اب حکومت حکومت ہے اور اختلاف اختلاف۔ اور فطری طور پر حکومت کے امکان میں نہیں ہے کہ وہ حزب اختلاف کی سیاسی حیثیت کا اعتراف کر لے یا اس کے مطالبات کو قبول کر لے۔

یہ صرف فاطمہؑ بنت پیغمبرؐ کے پہلو میں ہونے کا اثر ہے کہ مخالف کا قتل ممکن نہیں ہے اگرچہ دھمکی دی جا چکی ہے اور بظاہر احترام فاطمہؑ میں بیعت پر بھی مجبور نہیں کیا جا رہا ہے، اور اس وقت بھی کوئی ایکشن نہیں لیا جا رہا ہے جب رات کے وقت حضرت علیؑ جناب فاطمہؑ کو لے کر انصار کے دروازے پر جاتے ہیں اور مدد کا مطالبہ کرتے ہیں اور انصار کا جواب یہ ہوتا ہے کہ "دختر پیغمبرؐ! اب ہم اس شخص کی بیعت کر چکے ہیں اگر آپ کے شوہر ابو بکر سے پہلے ہمارے پاس آ گئے ہوتے تو ہم ان سے عدول نہ کرتے"۔

اور حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں رسول اللہ کے جنازہ کو چھوڑ دیتا اور لوگوں کے ساتھ اقتدار کی رسہ کشی میں شامل ہو جاتا۔

اور جناب فاطمہؑ فرماتی ہیں کہ "ابوالحسنؑ نے وہی کیا جو ان کا فرض تھا اور قوم نے وہ کیا ہے جس کا محاسبہ پروردگار کرے گا۔" (الامامۃ والسیاسۃ ص ۱۲)

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود عملی صورت حال یہ ہوئی کہ جناب فاطمہؑ کے انتقال کے بعد حضرت علیؑ اور ان کے ساتھیوں کو سماج سے بالکل الگ کر دیا گیا اور خود بنی ہاشم سے بھی الگ کرنے کی کوشش کی گئی کہ عباس کو رشوت دے کر حکومت میں شامل کر لیا جائے اور علیؑ بالکل یکہ و تنہا رہ جائیں۔ لیکن عباس نے اس پیشکش کو قبول نہ کیا اور سختی کے ساتھ انکار کر دیا۔ (الامامۃ والسیاسۃ ص ۱۵۔۱۶)

یہ ایک بنیادی قانون ہے کہ عام انسان کو حکومت اور مخالف کے درمیان اختیار دے دیا جائے تو وہ حکومت کا رُخ اختیار کرے گا کہ وہ رُخ قوی تر ہوتا ہے اور مخالف بہرحال کمزور ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اہلبیتؑ کا اختلاف برابر جاری رہا اور قریب تھا کہ حکومت سے رابطہ بالکل ختم ہو جائے جب عمر نے خانۂ زہراؑ کو آگ لگانے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن پروردگار نے اس صورت حال سے بچا لیا۔

اور حکومت اپنے نظریہ میں اس قدر مطمئن ہو گئی کہ گویا بنی ہاشم میں "نبوت اور خلافت کے جمع نہ ہونے کا نظریہ" بنی ہاشم کے ارتقار کو روکنے کا بہترین ذریعہ ہے اور اس طرح حکومت کو وہ منزل حاصل ہو گئی جس کی مدتوں سے جستجو تھی۔ (کامل ۲/۲۴ حوادث ۲۳ھ، شرح النہج ۳/۹۷۔۱۰۷، تاریخ بغداد احمد بن ابی طاہر، مروج الذہب ۲/۲۵۳)

اس سے اہم تر بات یہ ہے کہ اس نظریہ نے حکومت کے لئے ایک شرط کی شکل اختیار کر لی کہ اب کسی ہاشمی کو کوئی عہدہ نہیں دیا جا سکتا ہے چاہے وہ کتنا ہی ایمان دار اور دیانتدار کیوں نہ ہو۔ جس پر ابوبکر و عمر کے دور میں باقاعدہ طور پر عمل ہوتا رہا اور عمر کی مکمل کوشش یہ تھی کہ بنی ہاشم کی کسی فرد یا علیؑ کے کسی موید کو حکومت میں کوئی جگہ نہ دی جائے۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت علیؑ اور ان کے شیعہ حکومت سے کنارہ کش ہو گئے اور

اس کے زیر اثر حکومت نے وظائف میں حصہ دینا شروع کر دیا اس طرح ان کے جان و مال کی حفاظت کا ایک راستہ بھی نکل آیا اور حکام عصر حضرت علیؑ سے مشورہ بھی کرنے لگے حالات قدرے پُرسکون ہوئے اور فتوحات نے حالات کو مزید پُرسکون بنا دیا۔

لیکن عثمان کے حکومت پاتے ہی صحابۂ کرام نے اپنی رائے بدلنا شروع کر دی اور بنی امیہ قصر خلافت میں وارد ہونے لگے۔ تھوڑی دنوں کے بعد سارے صحابہ غائب ہو گئے اور قصر خلافت بنی امیہ سے چھلکنے لگا۔

بنی امیہ نے کوئی نیا طرز عمل ایجاد نہیں کیا۔ اہلبیتؑ اور ان کے شیعہ پہلے ہی سے سرکاری عہدوں سے محروم تھے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ دور عثمان میں عہدہ حاصل کر لیتے جب کہ اہلبیتؑ بنی امیہ کی غلط کاریوں پر خاموش بھی نہیں رہ سکتے تھے اور بنی امیہ ہی عثمان کے حاشیۂ مملکت اور عمّال تھے اور ان کا خیال یہ تھا کہ اہلبیتؑ کی طرف سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر درحقیقت بنی امیہ کی درپردہ مخالفت ہے اور اس طرح وہ بنی امیہ کو بدنام کرنا چاہتے ہیں۔

یہ صورت حال بڑھتی ہی چلی گئی اور ماضی کی عداوتوں نے مزید اثر کیا یہاں تک کہ فریقین میں مسلح مقابلہ کا بازار گرم ہو گیا جہاں ایک طرف حاکم شام معاویہ تھا اور دوسری طرف امت مسلمہ اور اس کے قائد حضرت علیؑ۔

یہاں بھی طاقت نے قانون پر فتح حاصل کر لی اور معاویہ کے سر پر ملوکیت کا تاج رکھ دیا گیا اور سال کا نام "عام الجماعہ" ہو گیا۔

اب آل محمدؐ سے مقابلہ کا ایک نیا دور شروع ہوا جس میں اشک و خون کا ایک سلسلہ تھا اور انھیں مکمل طور پر تباہ کر دینے کا ایک منصوبہ تھا۔ علاوہ ان افراد کے جن کے مقدر میں زندگی لکھی ہو۔ اب ان پر سب و شتم بھی فرض ہو گیا اور قوم نے حکام کے ساز پر گنگنانا شروع کر دیا۔ شیعیانِ آل محمدؐ کو دربدر کیا گیا۔ کسی ایک کی شہادت کو قابل قبول نہیں قرار دیا گیا۔ دیوانِ حکومت سے سب کے نام کاٹ دئے گئے اور سرکاری وظائف سے سب کو محروم کر دیا گیا۔ (ابن عساکر ۳/ ۴۰۷، معاویہ فی المیزان استاد عقاد

ص ١٦، شیخ المضیرہ محمود ابوریہ ص ١٨٠)

اقتدار پر قبضہ

ا۔ یاد دہانی اور تسلسل حوادث۔

سابق میں بیان کیا جا چکا ہے کہ حضور اکرمؐ نے وقت آخر نوشتہ نجات لکھنے کا مطالبہ کیا اور عمر بن الخطاب نے فوراً قوم سے خطاب کر کے آواز بلند کر دی کہ اِن پر مرض کا غلبہ ہے اور ہمارے لئے قرآن کافی ہے۔

جس کے بعد مجمع دو حصّوں پر تقسیم ہو گیا۔

ایک حصہ قلم دوات دینے کے حق میں تھا اور دوسرا عمر کی تائید کر رہا تھا اور اس شدّت کے ساتھ کہ رسول اکرمؐ کو ہذیان گو کہہ رہا تھا اور رسول اکرمؐ اس منظر کو دیکھ رہے تھے اور ان آوازوں کو سُن رہے تھے جس کے بعد آپؐ نے فرما دیا کہ تم لوگ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ (بخاری ۷/۹، مسلم ۵/۷۵، شرح نووی ۱۱/۹۵)

ب۔ فاروق نے اس معرکہ میں رسول اکرمؐ کے مقابلہ میں نمایاں کامیابی حاصل کی کہ قوم کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا اور آقا و غلام، حاکم و محکوم، نبی و امت کے فرق کو مٹا دیا اور رسول اکرمؐ کو تحریر لکھنے سے روک دیا۔

دوراہہ

اب رسولِ اکرمؐ کے لئے دو راستے تھے:

اگر تحریر لکھنے پر اصرار کریں تو فاروق کی جماعت کہے گی کہ ہذیان بک رہے ہیں اور اس طرح سارا دین بے اعتبار ہو جائے گا۔

اور تحریر کا ارادہ ملتوی کر دیں تو یہ کہا جائے گا کہ بیماری کی شدّت ہے اور کتابِ خدا کافی ہے۔

لہذا آپ نے ترکِ تحریر کا راستہ اختیار کیا تاکہ کم سے کم قرآن کا نام تو باقی رہے ورنہ

دل نازنین پر یہ صدمہ بہرحال رہ گیا کہ مجھے ہذیان گو کہا گیا ہے۔

قانون کا رنگ

عمر بن الخطاب کی ذہانت یہ تھی کہ انھوں نے اس مقابلہ کو بھی شرعی اور قانونی رنگ دے دیا کہ حضورؐ سے ہمدردی میں بیماری کا حوالہ دے دیا۔ قوم کو سمجھانے کے لئے قرآن کا نام لے لیا اور پھر اپنا مقصد بھی حاصل کر لیا کہ رسول اکرمؐ کوئی تحریر نہ لکھنے پائیں۔

(اب "ہذیان" کا کیا ہوگا۔ خدا بہتر جانتا ہے۔ جوادی)

فصل نہم

مقاصد و اہداف فاروق

قریش کے جملہ قبائل نے ہاشمی نبوت کا بھرپور مقابلہ کیا اور اس سلسلہ میں سارے اسلحے استعمال کئے۔

نہ اس لئے کہ انھیں بتوں سے کوئی خاص محبت یا اسلام سے کوئی خاص نفرت تھی۔ اسلام میں کوئی چیز خلاف فطرت نہ تھی کہ اس سے نفرت کی جاتی اور بتوں میں کوئی چیز قابلِ محبت نہ تھی کہ ان کی راہ میں قربانی دی جاتی۔

یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ اس سیاسی نظام کا تحفظ کیا جائے جو تقسیم مناصب کی بنیاد پر قائم ہے اور جس سے کوئی قبیلہ دوسرے کے مقابلہ میں کوئی امتیاز نہیں رکھتا ہے اور سب اپنی جگہ استقلال رکھتے ہیں اور بنی ہاشم کا نبوت کے گرد جمع ہو جانا اور اس کی راہ میں مرنے کے لئے تیار ہو جانا اس نظام کی تباہی اور بنی ہاشم کی برتری کا اعلان ہے۔ اس لئے سارے قبائل نے ان کے خلاف اجتماع کر لیا۔

پہلے انھیں شعب ابو طالب میں محصور کیا اس کے بعد سب نے مل کر قتل پیغمبرؐ کا منصوبہ بنایا اور آخر میں جنگ وجدال پر آمادہ ہو گئے۔

لیکن مقدر کی خرابی یہ کہ محاصرہ ناکام ہو گیا۔ قتل کا منصوبہ فیل ہو گیا اور جنگوں میں بھی کامیابی نہ مل سکی یہانتک کہ خود چاروں طرف سے گھر گئے اور مجبوراً اسلام قبول کرنا پڑا اور یہ احساس ہو گیا کہ نبوت ہاشمی ایک تقدیر کائنات ہے جس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہوگا۔

لیکن اگر نبوت حتمی شے ہے اور اس سے مقابلہ ناممکن ہے تو نبوت بنی ہاشم میں

رہے کوئی قبیلہ ان کا حصہ دار نہ ہوگا لیکن یہ طوفان اسی منزل پر رُک جائے۔ اور دیگر حقوق پر قبضہ نہ کیا جائے مگر مشکل یہ ہے کہ پیغمبرؐ نے پوری تیاری اپنے بعد علیؑ اور اولاد علیؑ کی خلافت کے لئے کرلی ہے۔ انھیں یہ اندازہ ہے کہ یہی افراد اسلام کے لئے اعلم، احکام کے لئے افہم۔ امت میں سب سے افضل اور قیادت کے لئے سب سے زیادہ انسب ہیں اور ان کے سامنے نفوس امت بطیب خاطر جھک جائیں گے۔

مثالی حل

قریش نے دیکھا کہ سارے قبائل اسلام میں داخل ہو گئے ہیں اور اسلام نے پُرانے معاملات کو معاف کر دیا ہے اور قریش کا اسلام کے سایہ میں متحد ہونا ایک شرعی مصلحت بھی ہے اور اسلام کی بے پناہ کامیابی اور اس کے پھیلاؤ کے مقابلہ میں وقت کی ضرورت بھی۔ لیکن اس اتحاد کا ایک ہی راستہ ہے کہ نبوت کو بنی ہاشم کے لئے چھوڑ دیا جائے اور اس میں کسی طرح کی شرکت کا دعویٰ نہ کیا جائے۔ اور اس کے بعد خلافت کو قبائل قریش کے درمیان بانٹ لیا جائے کہ اس میں کسی ہاشمی کا کوئی حصہ نہ رہے چاہے دیگر قبائل انصار اور موالی وغیرہ کو حصہ دینا پڑے۔ اس لئے کہ انھیں حصہ دینے سے بنی ہاشم کے اقتدار میں آجانے کا کوئی خطرہ نہیں رہ جائے گا اور ان کا امتیاز بہرحال قائم نہ ہو سکے گا۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نبوت و خلافت کا ایک گھرانہ میں جمع نہ ہونا ایک مستقل نظریہ بن گیا اور پھر یہ نظریہ ایک ہیجانی تصور بن کر دلوں میں راسخ ہو گیا۔

انکشاف

قبائل قریش اسلام میں داخل ہو گئے، نبوت کو تقدیر کائنات کے طور پر قبول کرلیا لیکن اب اپنے حل کے تحقق کی آرزو ہے کہ خلافت بنی ہاشم میں نہ جانے پائے۔

مشکل یہ ہے کہ اس آرزو پر وجود پیغمبرؐ کی لگام لگی ہوئی ہے اور کوئی اس کا اظہار نہیں کر سکتا ہے۔ اب اس کی تکمیل کا امکان وفات پیغمبرؐ کے بعد ہی ہے جب فضا سازگار

ہوجائے گی اور حالات ساتھ دینے پر آمادہ ہوجائیں گے۔

فاروق کا اتفاق وارتقاء

بدقسمتی سے حضرت عمر بھی قریش کے اس نظریہ سے متفق ہوگئے اور اس طوفان کیساتھ ہوگئے جو وفات پیغمبرؐ کے بعد اٹھنے کا ارادہ کررہا تھا اور انھوں نے اسے شرعی شکل بھی دے دی کہ یہ نظریہ صحیح اور توفیق کا نتیجہ ہے اور اس کا مقصد بنی ہاشم کو دیگر قبائل کے مقابلہ میں امتیازات کا روکنا ہے۔

چنانچہ انھوں نے اس نظریہ کو آگے بڑھانا شروع کردیا۔

پہلے اسے شرعی شکل دی تاکہ آسانی سے آگے بڑھایا جاسکے اور دین وشریعت کے غلاف کے اندر جاہلیت کے احساسات اور جذبات کو چھپایا جاسکے کہ یہ نعرہ سو فیصدی جاہلیت کے نظام کا احیاء اور جاہلانہ نظریہ ہے جس کی جڑیں تاریخ قبائل میں ظہور اسلام سے پہلے تک پھیلی ہوئی ہیں اور اس کا مقصد قبائلی بنیاد پر مناصب اور عہدوں کی تقسیم ہے اور بس!

دوسری طرف اسلامی خلافت کے لئے جس شخصیت کا نام لیا گیا ہے وہ قریش میں محبوب شخصیت نہیں ہے اور ہر قبیلہ میں اس کے خلاف جذبات انتقام پائے جاتے ہیں کہ اس نے سرداران قبائل کو اسلامی معرکوں میں تہ تیغ کیا ہے۔ بنی امیہ کے تمام سردار، حنظلہ بن ابی سفیان، عاص بن ہشام بن المغیرہ (حضرت عمر کے ماموں) کا قاتل بھی وہی شخص ہے۔

(طبقات ۲/۱۷-۱۸)

نبی ہاشمیؐ کو کفار کے مقابلہ میں اپنے نیزہ وشمشیر کے ذریعہ ہر حربہ اور حملہ سے اسی نے بچایا ہے۔

بھلا ایسے حالات میں ابوسفیان راضی ہوگا کہ اس کے فرزند اور ابناء عم کا قاتل خلیفہ ہوجائے۔ یا ہند اور اس کا بیٹا معاویہ اس بات پر راضی ہوگا کہ اس کے خاندان والوں کا قاتل رئیس مملکت اسلامی ہوجائے۔

عمر اپنے ماموں کے قاتل کو حاکم بنا سکتے ہیں کہ وہ "صاحب ایمان" ہیں۔ لیکن

سب تو ایسے نہیں ہیں اور سب کے دل میں تو ایسا "جذبۂ ایمانی" نہیں ہے۔

پھر ہر ایک کی نظر میں یہ بھی ہے کہ ہمارے قاتل پیغمبرؐ نہیں ہیں۔ قاتل علیؑ ہیں۔ یہ نہ ہوتے تو یہ صورت حال نہ ہوتی۔ ایسی صورت میں سارے قریش میں تعصب علیؑ کی طرف سے ہے اور سب کی نفرت علیؑ سے متعلق ہے اور سب اپنی اسلامی شکل اور پیغمبرؐ سے عقیدت کا اظہار بھی کرنا چاہتے ہیں۔

اب اگر قریش ان فضائل علیؑ کو تسلیم بھی کرلیں جو نبی اکرمؐ نے بیان کئے ہیں اور علیؑ کو خلافت دے بھی دیں تو قبائل قریش اس خلافت کے زیر اثر متحد نہیں ہوسکتے ہیں اور ایک دن اختلاف وافتراق ضرور پیدا ہوگا جس کے نتائج اسلام اور مسلمین کے مستقبل کے لئے بہت خطرناک ہوں گے لہٰذا اس طوفان کو یہیں روک دینا چاہیئے۔

یہی نکتہ تھا جہاں حضرت عمر اور قبائل قریش میں اتحاد ہوگیا اور دونوں نے مذکورہ نعرہ پر اتفاق کرلیا۔ قریش اپنے انتقام کے لئے نعرے لگا رہے تھے اور حضرت عمر وحدت اسلامی کے نام پر اسے آگے بڑھا رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عمر بھی اس کے منصوبہ ساز قرار پاگئے اور اندرونی طوفان کے فرد فرید مظہر دکھائی دئے۔

قریش کا اتحاد ولی کے خلاف

اگر آج فکر کے اتحاد نے سارے قبائل قریش کو ایک نعرہ "عدم اجتماع" کے تحت جمع کرلیا ہے تو کل یہی قریش بلا استثنا ہاشمی نبوت کے مقابلہ میں متحد تھے۔

(الامامۃ والسیاسۃ ص ۷۰-۷۲)

تین سال تک بنی ہاشم کو محاصرہ میں رکھا کہ اس طرح نبوت کا خاتمہ ہوجائے لیکن محاصرہ ناکام ہوگیا تو سب نے متفقہ طور پر قتل کا منصوبہ بنایا تاکہ ہاشمی خون قبائل میں تقسیم ہوجائے لیکن یہ منصوبہ بھی کامیاب نہ ہوسکا اور نبی کریمؐ بچ کر چلے گئے۔

آخر میں جنگ کا راستہ اختیار کیا گیا لیکن اس کا بھی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلسل ناکامیوں کے بعد مجبور ہوکر کلمہ پڑھنا پڑا اور اسلام کا اعلان کرنا پڑا کہ نبوت ایک تقدیر کائنات ہے اسے

بدلا نہیں جا سکتا ہے اور اس کے آگے سر تسلیم خم کر دینا ہی مناسب ہے۔

البتہ یہ فکر ضرور رہی کہ نبوت اور خلافت ایک گھر میں جمع نہ ہونے پائیں۔ اور اس کے لئے پھر متحدہ طور پر قیام کیا گیا اور دونوں مقامات پر اتحاد کی ایک ہی بنیاد تھی کہ اسلامی شکل کو محفوظ رکھتے ہوئے اور نبوت سے عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے جاہلیت کے نظام کا احیار کیا جائے اور اب بنی ہاشم کے کسی امتیاز کو قبول نہ کیا جائے۔

قریش کی منصوبہ بندی اور بنی ہاشم کے مصائب

قریش کو اندازہ ہے کہ نبی کریمؐ دنیا سے جانے والے ہیں اور انھوں نے خود بھی اس امر کا اعلان کر دیا ہے۔ اب اگر حالات کو ان کے رُخ پر چھوڑ دیا جائے تو خلافت علیؑ تک بہر حال یہ چلی جائے گی کہ وہ اہل بھی ہیں اور انھیں رسولِ اکرمؐ نے مقرر بھی کر دیا ہے اور اس طرح تمام مفروضہ خطرات سامنے آجائیں گے لہٰذا خفیہ طور پر اس کے خلاف کام شروع کر دینا چاہیئے اور خلافت کو خاندان نبوت میں نہ جانے دینا چاہیئے۔

اُدھر حضرت علیؑ اور بنی ہاشم وفاتِ پیغمبرِ اسلامؐ کی مصیبت میں مبتلا ہیں کہ حضور چند لمحوں میں دنیا سے جانے والے ہیں۔ آپ کے درد میں شدّت ہے اور آپ کا درد سارے گھرانے کا درد ہے۔ پھر آپ ابن عم، بھائی، محبوب اور عزیز قریب بھی ہیں اور ایسے بھائی، رشتہ دار اور محبوب کے درد کا احساس نہ ہوگا تو کس کے درد کا ہوگا۔ چنانچہ سب کلّی طور پر آپ کی طرف متوجہ ہو گئے اور سارے حالات سے منھ موڑ لیا۔ اور شاید یہ خیال بھی رہا ہو کہ باقی مسلمان بھی ایسے ہی ہوں گے اور ان کے دل میں بھی عشق سرکار ایسا ہی ہوگا۔

مستحکم منصوبہ

کون جانے کہ حضرت عمر کو کیسے معلوم ہو گیا کہ رسول اکرمؐ آج وصیت کرنے والے ہیں اور فوراً حاضر ہو گئے؟

کس نے انھیں اطلاع دی؟

کیسے وہ مجمع اکٹھا ہو گیا کہ جیسے ہی حضورؐ نے کہا کہ لاؤ ایک نوشتۂ نجات لکھ دوں فوراً عمر نے اس سے خطاب کر کے سمجھا دیا کہ ان پر مرض کا غلبہ ہے اور ہمارے واسطے کتاب خدا کافی ہے۔ اور اس مجمع نے بھی وہی کہنا شروع کر دیا جو عمر نے کہا تھا بلکہ بقولے یہ بھی کہہ دیا کہ رسول اللہ ہذیان بک رہے ہیں یا یہ سوال کر لیا کہ کیا یہ ہذیان بک رہے ہیں۔ (محققین کا خیال ہے کہ یہ قول بھی عمر کا تھا)

یہ تو ناممکن ہے کہ رسول اکرمؐ کا قول اس قدر قوم میں نفرت پیدا کرا دے اور عمر کا بیان اس قدر قوم کو مطمئن کر دے کہ لوگ لڑنے جھگڑنے اور محضر رسولؐ میں بدکلامی پر آمادہ ہو جائیں۔ یقیناً عقل وفہم ومنطق کے مطابق اس جماعت کو پہلے سے اندازہ تھا کہ حضور کیا لکھنے والے ہیں اور پہلے سے ایک طرح کا اتفاق تھا کہ ہم لوگ ایسی کوئی تحریر نہ لکھنے دیں گے چاہے اس سلسلہ میں رسول اکرمؐ سے مقابلہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے اور انھیں ہذیان گو ہی کیوں نہ کہنا پڑے اور یہی اتفاق اور اتحاد فکر اس مقابلہ کا باعث ہوا اور اس نے فوراً ایک گروہ تیار کر دیا۔

اب یہ اتفاق اتفاقاً پیدا ہو گیا یا اس کے لئے پہلے سے کوئی منصوبہ بندی ہو چکی تھی؟ اسے اللہ بہتر جانتا ہے۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ اس اتحاد نے قانون اور شریعت کی کمر توڑ دی۔

منصوبہ کا پہلا نتیجہ

اس گروہ میں یہ طاقت پیدا ہو گئی کہ پیغمبر اسلامؐ کو نوشتہ لکھنے سے روک دے اور حضرت عمر ایک قوی ترین انسان کی شکل میں نمودار ہوئے جو رسول اکرمؐ کے سامنے ان کے بارے میں یہ کہہ سکے کہ ان پر مرض کا غلبہ ہے اور تمھارے لئے کتاب خدا کافی ہے کہ اب ان کی تحریر کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور ان کا کام لغو اور غیر ضروری ہے اور حاضرین بھی ہذیان جیسی باتیں کرنے کی ہمت پیدا کر لیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس منصوبہ کا پہلا اثر رسول اکرمؐ کو تحریر لکھنے سے روکنے میں کامیابی ہے۔ اب اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ رسول اکرمؐ کو اصرار کر کے تحریر لکھ دینی چاہئے تھی یا یہ

اعلان کر دینا چاہیئے تھا کہ میرے بعد علیؑ ہی خلیفہ ہیں۔

تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ حزبِ مخالف ہذیان ثابت کرنے پر تل جاتا اور اس کے اثرات دین و مذہب پر بے شمار ہوتے اور رسول اکرمؐ کا دین بالکل بے اعتبار ہو کر رہ جاتا اور یہ تفرقہ ناممکن ہو جاتا کہ رسول اکرمؐ نے کتنی باتیں حالت صحت میں فرمائی ہیں اور کتنی باتیں حالت ہذیان میں اور اس طرح ساری شریعت بیکار ہو جاتی۔

اس لئے آپ نے مناسب یہی سمجھا کہ کتابت کا ارادہ ترک کر دیا جائے تاکہ خلافتِ علیؑ کے بجائے اصل دین کا تحفظ کیا جائے۔ اس لئے یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ میرے پاس سے نکل جاؤ۔ میں اسی حالت میں بہتر ہوں۔ گویا کہ قوم کے بارے میں اپنے نظریہ کا اعلان کر دیا اور معرکہ کو جیت لیا۔ اگرچہ قوم بھی یہی سمجھ کر گھر سے باہر نکلی کہ اس نے میدان کو سر کر لیا ہے اور اپنی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ کو دور کر دیا ہے۔

بنی ہاشم کی شکست کا منصوبہ

اگر قریش اور بنی ہاشم کے درمیان عاقلانہ اور عادلانہ مقابلہ کیا جائے تو فتح بنی ہاشم کے ہاتھ میں ہو گی جس کا ثبوت تاریخ نے بار بار پیش کر دیا ہے کہ قریش نے محاصرہ کیا اور ناکام ہوئے۔

قتل پیغمبرؐ کا منصوبہ بنایا اور ناکام ہوئے۔

جنگ و جدال کے لئے لشکر تیار کئے اور سارے قبائل کو ساتھ لے لیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ فتح بہر حال بنی ہاشم کی ہوئی اور قریش کے تمام قبائل کو اجتماعی طور پر شکست ہو گئی اور مجبوراً اسلام بھی قبول کرنا پڑا اور نبوت کی حقیت کا اقرار بھی کرنا پڑا۔

تو اب دوسرا راستہ یہ ہے کہ نبوت کو بنی ہاشم کے حوالے کر دیا جائے اور ان کے اس اعزاز کو تسلیم کر لیا جائے اور قریش خلافت پر قبضہ کر کے اسے آپس میں نچاتے رہیں اور اگر کسی وقت قریش سے باہر بھی نکل جائے تو بنی ہاشم تک نہ جانے پائے ورنہ بنی ہاشم میں جانے کے بعد پھر دوبارہ نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے اور وہی مصیبت سامنے آجائے گی کہ نبوت اور خلافت ایک خاندان میں جمع ہو گئی۔ لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا کہ بنی ہاشم پھر بھی کامیاب ہے۔

ترجیح مرجح

قریش نے یہ احساس پیدا کر لیا کہ بنی ہاشم کی تمام قبائل کے مقابلہ میں مسلسل فتح اور انکی برتری کا راز کسی مرجح میں پوشیدہ ہے جو مسلسل ان کے پلہ کو بھاری بنائے ہوئے ہے اور کسی مقام پر انھیں شکست نہیں کھانے دیتا ہے۔ اور وہ مرجح ایک طرف اللہ ہے اور دوسری طرف وہ اسباب ہیں جو انھیں کامیاب بنائے ہوئے ہیں۔

مثال کے طور پر قریش کی طرف سے محاصرہ وہ واضح ظلم تھا جس نے سماجی توازن کو تباہ کر دیا تھا لیکن مالک کائنات نے بنی ہاشم کو وہ صبر دے دیا اور ان کا اس طرح ہاتھ پکڑ لیا کہ انھیں کوئی زحمت نہ ہوئی اور حزب اختلاف میں ایک گروہ ان کی تائید میں پیدا ہو گیا جو محاصرہ توڑنے کا مطالبہ کرنے لگا۔

بعینہٖ اسی طرح قتلِ پیغمبرؐ کا منصوبہ تھا جس نے فساد فی الارض اور قتل بلاسبب کا ریکارڈ توڑ دیا تھا لیکن حضرت علیؑ کے بستر پیغمبرؐ پر سو جانے اور پیغمبرؐ کے بچ کر مدینہ پہونچ جانے نے کفار کے منصوبہ کو ناکام بنا دیا۔

رسول اکرمؐ کے مقابلہ میں لشکر کشی اور مسلسل جنگ، باطل پر اصرار اور گمراہی میں دور تک چلے جانے کی مثال تھی لیکن انصار کا حضورؐ کے گرد جمع ہو جانا اور آپ کے ساتھ جہاد کرنا اور بالواسطہ بنی ہاشم کا ساتھ دینا ایک واضح سبب تھا جس نے قریش کی جنگوں کو ناکام بنا دیا اور انھیں عظیم ذلت سے دوچار کر دیا جس کے بعد ان کی مشترکہ زعامت بھی منہدم ہو گئی اور انھیں اسلام یا استسلام کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔

مواقع کی یکسانیت اور واقعیت

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر قریش اور بنی ہاشم کو ایک جیسے مواقع فراہم ہو جاتے تو ہاشمی رائے قرشی رائے پر مقدم ہوتی ــــ اور یہ ثابت کر دیتی کہ یہی رائے صحیح اور مناسب و متوازن ہے۔

اور اگر واقعیات کا حساب لگایا جائے اور دلائل کا دلائل سے مقابلہ کیا جائے تو ولیِ خدا کی دلیل تمام دوسری دلیلوں کو باطل کر دے گی۔ اس لئے کہ ولیِ خدا قرآن کے ساتھ ہے"۔ "حق اس کے ساتھ ہے اور وہ حق کے ساتھ ہے"۔ اور اگر کوئی شریفانہ مقابلہ ہوگا تو کامیابی ولیِ خدا کا حصہ ہوگی اور اذنِ خدا سے کامیاب وہی ہوگا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ولیِ خدا نہ اندھیروں میں منصوبہ بندی کر سکتا ہے اور نہ لوگوں کی گردنوں پر حکومت کر سکتا ہے اور نہ حکمِ خدا کی خلاف ورزی کر سکتا ہے۔

ولیِ خدا کو شکست دینے کا ذریعہ

بالآخر قریش نے وہ راستہ تلاش کر لیا جس کے ذریعہ امور کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے اور وہ ہیں انصار۔ کہ اگر انھیں قابو میں کر لیا جائے تو نمایاں فتح حاصل ہو سکتی ہے اور اپنے مقصد کو کامیاب بنایا جا سکتا ہے اور خلافت کو بنی ہاشم کے گھر جانے سے روکا جا سکتا ہے۔

اس لئے کہ اگر علیؑ کی خلافت ثابت ہوگئی تو یقیناً وہ اپنے بعد حسنؑ کو نامزد کریں گے کہ وہی خدا اور رسولؐ کی طرف سے امام بنائے گئے، اور انھیں کو فرزندِ رسولؐ ہونے کا شرف حاصل ہے اور وہ اپنے بعد حسینؑ کو نامزد کریں گے اور کسی میں اعتراض کرنے کا دم نہ ہوگا اور اس طرح یہ سلسلہ اولادِ رسولؐ اور بنی ہاشم میں چلتا رہے گا اور بنی ہاشم نبوت و خلافت دونوں کے مالک ہو جائیں گے۔

البتہ اس کام کے لئے ایک مرجع درکار ہے اور ضرورت ہے کہ مواقع سب کے لئے یکساں طور پر فراہم نہ ہوں اور کام کو انتہائی سُرعت اور ہوشیاری کے ساتھ انجام دیا جائے۔

۱۔ اس سلسلہ میں مرجعِ اعظم انصار کا گروہ ہے کہ اگر یہ گروہ ولیِ خدا کے ساتھ ہو گیا تو قریش شکست کھا جائیں گے اور خطرہ سامنے آجائے گا۔ اور اگر قریش کے ساتھ ہو گیا تو بنی ہاشم اور بالخصوص ولیِ خدا علیؑ کی شکست یقینی ہے۔

حد یہ ہے کہ اگر اسے غیر جانبدار بنانے میں بھی کامیابی ہو جائے تو یہ بھی ایک کامیابی ہے اور اس سے قریش اپنے مقاصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔

۲۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ مواقع سب کے لئے یکساں نہ ہوں ورنہ اگر ولی خدا کو قریش کے برابر مواقع حاصل ہو گئے تو ان کا غلبہ یقینی ہے اور وہ قریش پر شرعی دلائل قائم کر کے اس کے ہر سربراہ کو شکست دے سکتے ہیں۔

اس کا بہترین راستہ یہ ہے کہ قریش کا سربراہ علیؑ سے ذاتی طور پر بات نہ کرے بلکہ جماعت کی نمائندگی کے طور پر گفتگو کرے اور یہ ظاہر کرے کہ اس کی رائے تمام مہاجرین یا اکثریت امت کی رائے ہے اور اس طرح ولی خدا کو شکست دینے کے امکانات قوی تر ہو جائیں گے۔

۳۔ تیز رفتار عمل۔ یعنی مسئلہ کو اتنی جلدی طے کیا جائے کہ اہلبیتؑ رسولؐ تجہیز و تکفین سے فارغ نہ ہونے پائیں اور ان میں کا کوئی ایک بھی اس اجتماع میں شریک نہ ہونے پائے اور مسئلہ خلافت مکمل ہو جائے اور انھیں بعد میں عذر یا اعتراض کا موقع نہ دیا جائے اور ہر اعتراض کو فتنہ اور قانونی حکومت کے مقابلہ کا نام دے دیا جائے جس کے پاس ریاست، وزارت اور لشکر تمام طاقتیں موجود ہیں اور سب خلیفۂ وقت کے زیر اثر ہیں۔

سقیفہ کا اجتماع

رسول اکرمؐ کا انتقال ہو گیا اور وہ ماہتاب پردہ میں چلا گیا جس کے نور نے سارے عالم وجود کو منور بنا رکھا تھا۔ یہ خبر مدینہ میں پھیل گئی اور ہر طرف ایک ہراس طاری ہو گیا۔ لوگ بیت نبوت میں جمع ہونے لگے اور اپنے رسولؐ۔ قائد۔ ولی امر پر آنسو بہانے لگے۔ اُدھر آل رسول اور بالخصوص علیؑ ولی اس مصیبت میں مکمل طور سے غمزدہ تھے اور تجہیز و تکفین کی تیاریاں کر رہے تھے۔

ٹھیک اسی وقت سقیفہ بنی ساعدہ میں ایک اجتماع ہو گیا۔

سوالات بلا جوابات

یہ اجتماع ٹھیک اُس وقت کیوں ہوا؟

اس کا داعی کون تھا؟

اس وقت اجتماع کے امکانات کس طرح پیدا ہوئے ؟
حاضرین کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوا ؟
انصار میں یقینی طور پر کتنے افراد شریک ہوئے ؟ جب کہ سقیفہ میں سارے انصار کی گنجائش نہیں تھی اور بعض افراد عقل و منطق کے حکم کے مطابق بیتِ پیغمبرؐ میں رہے ہوں گے۔ سب اچانک بہر حال غائب نہیں ہو سکتے ہیں۔
اس اجتماع کے حاضرین کو کس نے جمع کرنا شروع کیا ؟
یہ اجتماع کتنی دیر میں مکمل ہوا ؟
اس اجتماع کی اطلاع عمر کے علاوہ کسی اور کو کیوں نہیں ہوئی ؟ انھیں کس نے باخبر کیا جب کہ وہ خانۂ رسالت میں نہیں تھے اور نہ ان کا شمار اس وقت کے سوگواروں میں کہیں ملتا ہے۔ شائد وہ کسی اور مقام پر تھے اور انھیں معلوم تھا کہ ابو بکر خانۂ رسالت میں ہیں اور آکر فوراً انھیں طلب کر لیا۔ انھوں نے جواب میں کہلا دیا کہ میں مشغول ہوں۔ لیکن انھوں نے اصرار کیا کہ ایک اہم مسئلہ پیش آگیا ہے جس میں آپ کی حاضری ضروری ہے اب جب باہر آئے تو بتایا کہ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو گئے ہیں اور سعد بن عبادہ کو حاکم بنانا چاہتے ہیں اور ان میں بہترین قول اس شخص کا ہے جو یہ کہہ رہا ہے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک قریش سے ہو۔ اور پھر دونوں دوڑتے ہوئے پہونچ گئے اور راستہ میں ابو عبیدہ سے ملاقات ہو گئی تو انھیں بھی ساتھ لے لیا۔ (طبری ۲۱۹/۳)

خبر کون لایا؟

طبری کا بیان ہے کہ سب سے پہلے انصار کے اجتماع کی خبر عمر نے سنی۔ (طبری ۲۱۹/۳)
دوسری روایت میں ہے کہ ابو بکر تک خبر پہونچی۔ (طبری)
ابن ہشام کے الفاظ یہ ہیں کہ "ایک شخص ابو بکر اور عمر کے پاس آیا"۔
یہ کون تھا ؟
اس کا نام دنیا میں کسی کو نہیں معلوم ہے کہ یہ نام تاریخ کے اندھیرے میں گم ہو گیا

ہے۔ (نظام الحکم للقاسمی ص ۱۲۶)

انصار میں دو[۲]

جب ان تینوں افراد نے سقیفہ کا رُخ کیا تو راستہ میں عدیم بن ساعدہ انصاری اور معن بن عدی سے ملاقات ہو گئی، جو انصار کے منتخب افراد میں سے تھے۔ (طبری ۳/ ۲۰۶)

دوسری روایتِ طبری میں عاصم بن عدی اور عدیم بن ساعدہ جو اصحاب بدر میں سے تھے۔

ایک روایت میں ہے کہ دونوں نے تینوں سے کہا کہ "جاؤ واپس جاؤ اور آپس میں اپنے معاملات کا فیصلہ کر دو"۔ یا دوسری لفظوں میں "جاؤ واپس جاؤ۔ جو تم چاہتے ہو وہ ہونے والا نہیں ہے"

قابلِ توجہ

یہ دونوں انصار اصحاب بدر میں تھے لیکن اس کے باوجود سقیفہ کے اجتماع میں شریک نہیں ہوئے اور نہ ان کا رُخ سقیفہ کی طرف تھا۔ وہ ثلاثہ کے خلاف رُخ پر سفر کر رہے تھے جبھی تو ان دونوں کی تینوں سے مڈبھیڑ ہو گئی اور پھر سب اپنے اپنے راستے چلے گئے۔ اس لئے کہ کسی نے پانچوں کے سقیفہ کے رُخ پر جانے کا ذکر نہیں کیا ہے۔

پھر اس گفتگو کا مضمون بھی عجیب ہے۔

ایک مرتبہ کہا کہ جاؤ آپس میں فیصلہ کر دو۔ یعنی انصار کو اس مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، اور دوبارہ کہا کہ جو تم چاہتے ہو وہ ہونے والا نہیں ہے یعنی انصار تمہیں حاکم نہ بنائیں گے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کس بیان کی تصدیق کی جائے اور واقعی صورت حال کیا تھی۔

فصل دھم

واقعی تجزیہ اور عدم صدفہ

مورخین اہلسنت کے درمیان اس امر پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ اس اجتماع کی خبر سب سے پہلے حضرت عمر کو ملی ۔ (طبری ۲/ ۲۱۹)

اور دوسری روایت میں ہے کہ ابو بکر تک خبر پہونچی ۔ (طبری ۲/ ۲۰۱)

اور ابو بکر تک خبر کا پہونچنا اس سے متصادم نہیں ہے کہ سب سے پہلے عمر نے یہ خبر سُنی ہو ۔

البتہ ابن ہشام کی روایت یہ ہے کہ ایک شخص نے ابو بکر و عمر کو یہ خبر پہونچائی ۔ (تاریخ ابن ہشام ۲/ ۶۵۶)

لیکن کسی کو آجتک اس شخص کا نام نہیں معلوم ہے کہ وہ کون تھا ؟

ظاہر ہے کہ اس مخبر کا گم ہو جانا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے جب کہ وہ ایک ایسی اہم شخصیت ہے جسے سماج کے خفیہ معاملات کی بھی اطلاع ہے اور اسی نے ابو بکر اور عمر کو اطلاع پہونچائی ہے اور دونوں نے اس کی بات سُنی بھی ہے اور تصدیق بھی کی ہے بلکہ اسی کے مطابق عمل بھی کیا ہے تو کیا ایسے اہم شخص کا نام بھی گُم ہو سکتا ہے اگر ایسا کوئی شخص ہے ۔ اور سچی بات یہ ہے کہ یہ گمنامی ہی شُبہ پیدا کرتی ہے کہ واقعاً کوئی مخبر ہے بھی یا نہیں ؟

پھر انصار کا سقیفہ میں جمع ہو جانا بھی کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے جب کہ وہ دار الحکومت اسلامی کی اکثریت پر مشتمل جماعت ہے اور پھر اجتماع کی مہاجرین میں عمر کے علاوہ کسی کو خبر نہ ہوئی اور انھوں نے بھی ابو بکر کے علاوہ کسی کو آواز نہ دی بلکہ مہاجرین خانۂ نبوت میں آخری دیدار کے لئے جمع تھے اور آل محمدؐ کے سوگ میں برابر کے شریک تھے ۔ بظاہر یہ بھی کوئی حادثاتی امر نہیں ہے ۔

پھر حضرت فاروق کہاں تھے کہ ان کے قدم خبر وفات پیغمبرؐ پانے کے بعد خانۂ رسالت کی طرف نہ اٹھے اور انھیں موت کا نام لینے والے کے قتل کا خیال پیدا ہو گیا۔ (طبری ۳/۱۹۷)

اور جب موت ثابت ہو گئی تو خانۂ رسالت کا رُخ کیوں نہیں کیا کہ حضورؐ کا آخری دیدار کریں اور امت و آلِ محمدؐ کے مصائب میں شرکت کریں؟ اور اگر رُخ کیا تو سقیفہ کی خبر صرف انھیں کو کیسے مل گئی؟ اور یہ مخبر کون تھا جسے ہزاروں افراد کے درمیان صرف حضرت عمر کا چہرہ نظر آیا اور انھیں باخبر کر دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ امر بھی حادثاتی نہیں ہے۔

اب آئیے انصار کی طرف۔ یہ طے ہے کہ سقیفہ میں تمام انصار جمع نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ اصحاب بدر تک جمع نہیں ہوئے تھے جن کی حضورؐ نے مدح فرمائی ہے اور یہ غیر ممکن ہے کہ انصار کا اجتماع اصحاب بدر کے بغیر مکمل ہو جائے۔ یہ دونوں افراد جو ثلاثہ سے ملے تھے یہ اصحاب بدر میں تھے مگر سقیفہ میں نہیں تھے جب کہ اجتماع کا مقصد خلیفہ کا انتخاب ہوتا تو یہ دونوں ضرور شریک ہوتے یا کم سے کم بے تعلق نہ ہوتے۔

پھر ابھی پیغمبرؐ کا جنازہ گھر میں رکھا ہوا ہے اور یہ بات انتہائی غیر معقول ہے کہ انصار میں کوئی آخری دیدار کے لئے بھی نہیں گیا جب کہ آل محمدؐ دفن و کفن کی تیاری کر رہے ہیں اور تھوڑی دیر میں حضورؐ کو سپرد لحد کر دیں گے۔ یہ وہ امر ہے جس کی تصدیق اندھی تقلید کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا ہے۔

پھر اگر سارے انصار انتخاب خلیفہ کے لئے جمع ہوئے تھے تو انھیں احکام شرع سے باخبر ہونا چاہیئے تھا اور معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ پیغمبرؐ قریش میں سے تھے اور ائمہ بھی قریش میں سے ہوں گے۔ اور پھر ان احکام سے بھی باخبر ہونا چاہیئے تھا جو اہلبیتؑ کے بارے میں وارد ہوئے تھے اور یہ معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ رسول اکرمؐ حضرت علیؑ کو میدان غدیر میں خلیفہ بنا چکے ہیں اور ان لوگوں کو علیؑ اور اہلبیتؑ کے بارے میں وصیت فرما چکے ہیں اور اجتماعی طور پر سب سے کہہ چکے ہیں کہ "گروہ انصار! کیا میں تمھیں ایسی بات سے باخبر نہ کر دوں جس سے تمسک کرو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ اور جب سب نے کہا کہ بے شک باخبر فرمائیں۔ تو فرمایا کہ "یہ علیؑ ہے اس سے میری بنیاد پر محبت کرو اور میرے احترام کی بنا پر اس کا احترام کرو جبرئیل نے مجھے اس بات کا حکم پہونچا دیا ہے جو میں تم سے کہہ رہا ہوں"۔ (شرح النہج ۹/۱۷۰، تحقیق ابو الفضل، حلیۃ الاولیاء ۱/۶۳، مجمع الزوائد ۹/۱۳۲، کفایۃ الطالب ص ۲۱۰،

ینابیع المودۃ ص ۳۱۳، کنز العمال ۱۲۶/۵، الریاض النضرہ ۲۲۳/۲، فضائل الخمسہ ۹۸/۲، مطالب السئول ۶۰/۱، فرائد السمطین ۱۹۷/۱ حدیث نمبر ۱۵۴)

آخر سب کے سب اس حدیث کو کیونکر بھول گئے۔ پھر سب کے ذہن سے واقعۂ غدیر کس طرح نکل گیا۔ ان لوگوں کا "عدم اجتماع نبوت وخلافت" سے کیا تعلق ہے۔ یہ تو قریش میں نہیں ہیں۔ انھیں تو بہرحال خلافت ملنے والی نہیں ہے۔ انھیں آل محمدؐ کو الگ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

یہ اس ارشاد پیغمبرؐ کو کس طرح بھول گئے "علیؑ میرے بعد تمہارا ولی ہے"۔ "یہ ہر مومن اور مومنہ کا مولا ہے"۔

ان کے تجاہل کی مصلحت کیا ہے؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انصار کا اجتماع خلیفہ کے انتخاب کے لئے نہیں ہوا تھا۔ وہ علیؑ ولی کی شخصیت اور خلیفۂ رسول سے مکمل طور پر باخبر تھے۔ انھوں نے علیؑ کی غیبت میں کہہ دیا تھا کہ ہم علیؑ کے علاوہ کسی کی بیعت نہ کریں گے۔ یا بعض روایات کی بنا پر بعض انصار نے کہا کہ ہم علیؑ کے علاوہ کسی کی بیعت نہ کریں گے"۔ (الامامۃ والسیاسۃ ص ۸)

جس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ انصار کسی دوسرے کی بیعت پر آمادہ ہو گئے تھے۔

اس کے بعد جب انصار ہار گئے اور جناب فاطمہؑ نے حضرت علیؑ کا حق یاد دلایا تو سب نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ "ہم اس شخص کی بیعت کر چکے ہیں اگر آپ کے شوہر پہلے آگئے ہوتے تو ہم ان کے علاوہ کسی کی بیعت نہ کرتے"۔ اور حضرت علیؑ فرماتے تھے کیا میں جنازۂ رسولؐ کو چھوڑ دیتا اور حکومت کے جھگڑوں میں شریک ہو جاتا اور جناب فاطمہؑ یہ فیصلہ فرماتیں کہ ابوالحسنؑ نے وہی کیا جو ان کا فرض تھا اور تم لوگوں نے جو کچھ کیا ہے اس کا حساب پروردگار کے یہاں دینا ہے۔ (الامامۃ والسیاسۃ ص ۱۲)

پھر بشیر بن سعد جس نے انصار کے اجماع کو توڑا اور سب سے پہلے ابوبکر کی بیعت کی تھی اس نے بھی حضرت علیؑ کا کلام سُن کر یہی کہا کہ اگر یہ بات انصار نے بیعت ابوبکر سے پہلے سُن لی ہوتی تو دو آدمی بھی اختلاف نہ کرتے۔ (الامامۃ والسیاسۃ ص ۸-۱۲)

جن لوگوں کے افکار و نظریات ایسے ہوں۔ ان کے بارے میں غیر معقول ہے کہ وہ خلیفہ

کے انتخاب کے لئے اجتماع کریں اور پیغمبرؐ کے بنائے ہوئے ولی اور مولا کی غیبت سے فائدہ اٹھائیں جب کہ سب نے غدیر کا منظر دیکھا ہے اور حضرت علیؑ کو مبارکباد دی ہے اور پھر بار بار حضور کا ارشاد سُنا ہے کہ "یہ میرے بعد تم سب کا ولی ہے"۔ یہ ہر مومن مرد و عورت کا مولا ہے"۔

پھر سعد بن عبادہ جیسا جلیل القدر صحابی اور قبیلۂ خزرج کا سردار اور صاحب مواقف و مجاہدات کس طرح تیار ہو سکتا ہے کہ حضرت علیؑ کی موجودگی میں خلافت قبول کر لے۔ وہ تو مریض تھے اور اُٹھنے کے قابل بھی نہ تھے۔ ورنہ خانۂ رسالت میں آخری مراسم میں شرکت کے لئے حاضر ہوتے اور یہ طے شدہ ہے کہ ان کا مکان خانۂ رسالت سے متصل تھا۔ اسی لئے لوگ انھیں اٹھا کر خانۂ رسالت میں لے آئے۔ ممکن ہے کہ یہ انصار ان کی عیادت اور انھیں خبر وفات پیغمبرؐ دینے کے لئے آئے ہوں اور یہ ساری گفتگو اسی ماحول میں ہوئی ہو جس میں زمانۂ بعد کا ذکر بھی آگیا ہو۔

مہاجرین ثلاثہ کا داخلہ

البتہ مہاجرین کے داخلہ نے اس اجتماع کو ایک نیا رنگ دے دیا۔ اور ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے آنے کے بعد پہلی گفتگو ختم ہو گئی ہوگی۔

اب دوبارہ یہ بحث کس نے شروع کی؟ اور مناقشات کا دروازہ کس نے کھولا؟ دنیا میں کوئی انسان حتمی طور پر اس شخص کا پتہ نہیں بتا سکتا۔

ہاں فاروق کو یہ خیال ضرور تھا کہ یہ لوگ ہمیں الگ کر کے ہمارے امر کو ہم سے چھیننا چاہتے ہیں۔ (طبری ۳/۲۰۱ - ۲۱۸)

اور انھیں کو ان نئے چہروں کا انتظار تھا جو اس اجتماع میں شریک ہونے والے ہیں اور اسی بنا پر جب قبیلۂ اسلم کے لوگ آگئے اور ابو بکر کی بیعت کر لی تو انھوں نے فرمایا کہ۔ "جب اسلم پر نظر پڑی تو مجھے یقین ہو گیا کہ اب کامیابی ہماری ہے"۔

گویا انھیں پہلے سے قبیلۂ اسلم کی رائے کا علم تھا اور انھیں کا انتظار تھا۔

قبیلۂ اسلم انصار کا ایک بہت بڑا قبیلہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ لوگ سقیفہ میں موجود نہیں تھے جس کا واضح سا مطلب یہ ہے کہ اس اجتماع کا اصلی رنگ سیاسی نہیں تھا۔ یہ رنگ

حضرت فاروق کا عطا کیا ہوا ہے۔

پھر حضرت فاروق کا کامیابی کا یقین بھی قابل بحث ہے کہ یہ کامیابی کس کے مقابلہ میں ہے؟ اور کس ذریعہ سے ہے؟

ان تمام باتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انصار کو مرجع بنانے کی مہم جاری تھی اور انھیں کے ذریعہ اہلبیتؑ پر غلبہ حاصل کرنے کا منصوبہ تھا؟

مہاجرین ثلاثہ کی آمد کا مقصد

مہاجرین ثلاثہ کے مجمع انصار میں جانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ رسول اکرمؐ کا ایک خلیفہ مقرر کر لیا جائے اور اس میں قریش کی شرکت کا بھی انتظار نہ کیا جائے گویا تمام قریش کی رائے وہی ہے جو ثلاثہ کی رائے ہے اس لئے کہ سب اول و آخر اس نکتہ پر متحد ہیں کہ اس منصب کو بنی ہاشم سے نکال لیا جائے اور خلافت نبوت کے گھرانہ میں نہ جانے دی جائے اور ایسی حالت میں قریش کی موجودگی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان کی نمائندگی یہ ثلاثہ کر رہے ہیں بلکہ تنہا حضرت عمر کر رہے ہیں جو اس قانون پر مکمل ایمان رکھتے ہیں کہ خلافت کو خانۂ نبوت میں نہ ہونا چاہیئے۔

دوسرا مقصد یہ بھی ہے کہ یہ سارا کام تمام اہلبیتؑ اور بالخصوص ان کے سربراہ حضرت علیؑ کی عدم موجودگی میں ہونا چاہیئے ورنہ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی بالخصوص حضرت علیؑ آگئے تو صورت حال بالکل بدل جائے گی اور وہ ایسی دلیل قائم کر دیں گے کہ انصار مطمئن ہو جائیں گے اور سارا منصوبہ خاک میں مل جائے گا۔ لیکن اگر وہ لوگ غائب رہے تو فضا سازگار رہے گی اور کسی ایک کو خلیفہ بنایا جا سکے گا اور اس کے مویدین انصار بیعت کر لیں گے اور جب اوس والے بیعت کر لیں گے تو خزرج بھی بیعت کر لیں گے تاکہ انھیں بھی کوئی عہدہ مل جائے اور عترت رسولؐ بالخصوص حضرت علیؑ کو انصار کی ترجیحی طاقت کا مقابلہ کرنا پڑے گا اور انصار اپنی بیعت سے انحراف کریں گے اور مقابلہ حضرت علیؑ اور ابوبکر یا حضرت علیؑ اور عمر کے درمیان نہیں ہوگا بلکہ خلیفہ حاکم اور ایک رعیت کے درمیان ہوگا یا ایک نائب خلیفہ اور ایک عام باشندہ کے درمیان ہوگا اور

ایسے مقابلہ کے نتائج واضح ہیں۔

ورنہ اگر مقابلہ حضرت علیؑ اور عمر کے درمیان ہوگا تو فاروق میں نہ علمی حیثیت سے مقابلہ کرنے کا دم ہے کہ حضرت علیؑ باب علم و حکمت ہیں اور نہ طاقت کے اعتبار سے دم ہے کہ حضرت علیؑ کے مجاہدات معروف ہیں اور معرکۂ خندق میں جب عمرو بن عبدود پکار رہا تھا تو حضرت علیؑ کے علاوہ کوئی نہیں اٹھا تھا جن کمزور لوگوں میں فاروق بھی شامل تھے کہ عمرو کی آواز سن رہے تھے اور سر اٹھانے کی ہمت نہیں کر رہے تھے۔

چنانچہ اگر فاروق نائب خلیفہ ہو گئے تو خود مقابلہ پر نہیں آئیں گے بلکہ لشکر بھیجیں گے۔ جو ولیِ خدا کو دربار خلافت تک کھینچ کر لے آئے جیسا کہ ہوا۔

ان ثلاثہ نے خلیفہ کے تقرر کا جو وقت منتخب کیا تھا وہ بھی نہایت درجہ مناسب تھا کہ اہلبیتؑ سب تجہیز و تکفین پیغمبرؐ میں مصروف تھے اور یہ ایک مثالی وقت تھا جب ولیِ خدا اور خاندان رسالت کی عدم موجودگی میں خلیفہ مقرر کیا جا سکتا تھا۔ وہ لوگ اپنے وجود سے غافل تھے ان کے دل و دماغ پر غم فراق پیغمبر حاوی تھا۔ انھیں کہاں فکر تھی کہ خلافت سازی کی دوڑ میں شرکت کرتے لہٰذا حضرات نے اس مناسب وقت سے فائدہ اٹھایا جو قریش کی دیرینہ تمنا کے عین مطابق تھا۔

اس کے بعد اپنے پلہ کو بھاری بنانے کے لئے انصار کا انتخاب بھی ایک نہایت درجہ کا بیباک انتخاب تھا کہ قریش تو بہرحال خلافت و نبوت کو ایک خاندان میں نہیں چاہتے ہیں کہ یہ طریقہ ان کے موروثی نظام سیاست سے متصادم ہے اور ان کی نظر میں کوئی آدمی بھی نہیں ہے صرف ایک بات ہے کہ بنی ہاشم میں کوئی نہ ہونے پائے۔ اسی لئے سب سے پہلے عثمان اور بنی امیہ نے بیعت کی۔ اس کے بعد سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمن بن عوف اور ان کے ساتھی بنی زہرہ نے بیعت کی۔

(الامامۃ والسیاسۃ ص ۱۱)

اور اس انتخاب کی مزید باریکی کا اندازہ کرنا ہے تو یوں سمجھا جائے کہ اگر سارے قریش نے ابوبکر کی بیعت کر لی ہوتی اور انصار نے ساتھ نہ دیا ہوتا تو بھی اس انتخاب کی کوئی قیمت نہیں تھی اور امام کے لئے ممکن تھا کہ قریش کے خلاف دلیل قائم کر کے انصار کے ذریعہ اپنے پلہ کو بھاری بنا لیتے۔ لہٰذا قریش کی حاضری بالکل بے معنی تھی اور ثلاثہ ان کی نمائندگی کے لئے کافی تھے۔ کام صرف

انصار کا تھا لہٰذا انھیں کے مجمع کا انتخاب کیا گیا۔

اور اس طرح پہلی مرتبہ اہلبیتِ رسولؐ اس عظیم طاقت سے محروم ہو گئے، جو انھیں قریش کے قبائل کے مقابلہ میں کامیاب بنا سکتی تھی اور ثلاثہ نے اس طاقت پر قبضہ کر لیا اور خود قریش کے ترجمان بن گئے اور اس طرح بنی ہاشم کو مکمل طور پر خلافت و ولایت و مناصب سے دور کر دیا گیا۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ عمر نے مہاجرین، اہلبیتؑ اور حضرت علیؑ سے بیعت لینے کا معروف طریقہ کیوں اختیار کیا کہ لوگ مسجد میں جمع تھے اور جیسے ہی ابوبکر اور ابوعبیدہ داخل ہوئے اور انصار نے ابوبکر کی بیعت کی۔ عمر نے تقریر شروع کر دی۔ "آخر تم لوگ حلقہ بنائے ہوئے کیوں بیٹھے ہو؟ اٹھو ابوبکر کی بیعت کرو کہ میں نے اور انصار نے ان کی بیعت کر لی ہے اور عثمان و بنو امیہ اور سعد و عبدالرحمٰن و بنو زہرہ سب نے بیعت کر لی ہے" صرف علیؑ، عباس بن عبدالمطلب اور ان کے ہمراہ بنی ہاشم اٹھ کر اپنے گھروں کو چلے گئے، جن میں زبیر بن العوام بھی شامل تھے۔ اور پیچھے پیچھے عمر ایک گروہ کو لے کر پہونچ گئے کہ چلو۔ چل کر ابوبکر کی بیعت کرو۔ ورنہ . . . .

فاروق کا یہ لہجہ اور یہ انداز قابلِ توجہ ہے۔

سقیفہ کے اندر

سقیفہ کے اندر انصار کی صرف ایک جماعت تھی۔ نہ نصف، نہ ربع، نہ عشر۔ مدینہ کی آبادی کی اکثریت انصار کی تھی اور ان میں اکثر خانۂ رسالت میں شریکِ غم تھے اور اس کے گرد مجتمع تھے۔ یہاں تک کہ جن لوگوں نے سعد بن عبادہ اور ان کے گرد و پیش کے حالات دیکھے تھے وہ اصحاب بدر بھی شریک نہیں ہوئے تھے۔ جن کے بروایتے عاصم بن عدی اور اور عدیم بن ساعدہ تھے اور بروایت دیگر عدیم بن ساعدہ اور معن بن عدی تھے۔

اگر یہ اجتماع تمام انصار کا ہوتا تو یہ افراد بھی شریک ہوتے۔ پھر وہ قبیلہ اسلم جس نے مدینہ کی گلیوں کو بھر دیا تھا وہ بھی موجود نہ تھا اور حضرت عمر اس کا انتظار کر رہے تھے اور انھیں یقین تھا کہ اس کی آمد ہی انھیں کامیاب بنائے گی اور یہ لوگ بیعت کے بعد پہونچے ہیں۔ گویا

خلافت صرف تین افراد کا کارنامہ ہے اور بس!

اس لئے کہ جو شخص انصار کے اجتماع کی خبر لے کر آیا تھا وہ آج تک مجہول ہے اور جس نے مناظرہ کا سلسلہ شروع کیا تھا اس کا نام بھی غائب ہے۔ حالانکہ اصل یہی دو افراد تھے۔ ورنہ مہاجرین نے جب آکر سلام کیا ہوگا تو جواب سلام کے بعد کسی نے کلام کا آغاز کیا ہوگا۔ آخر وہ آغاز کرنے والا کون تھا؟ اور اس کا نام کیوں نہیں بتایا گیا؟ جب کہ اس سے کم اہمیت رکھنے والے افراد کے نام موجود اور مذکور ہیں۔

ان تمام حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے بہت سے اجزا ر کاٹ دئے گئے ہیں اور یہ داستان ناقص نقل کی گئی ہے اور اس کی ترتیب و تنظیم اس انداز سے ہوئی ہے کہ حکام کی شخصیت مجروح نہ ہونے پائے اور مویدین بیزار نہ ہونے پائیں اور ایسا محسوس ہو کہ جیسے بس یہی تین افراد اس پوری داستان کے ہیرو ہیں۔

جس کا اندازہ روایات کے اختلاف اور مضامین کے تضاد سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ روایات بکثرت ہیں اور راوی بھی متعدد ہیں لیکن کسی ایک مضمون پر اتحاد نہیں ہے۔

دونوں اصحاب بدر کے بیان میں بھی واضح تضاد پایا جاتا ہے۔ کبھی انصار کو غیر جانبدار قرار دیتے ہیں اور کبھی امیدوار۔ سعد بن عبادہ کو بھی کبھی ایسا امیدوار خلافت ظاہر کیا جاتا ہے، کہ سارا مجمع بیزار ہو جاتا ہے اور ان کے قتل کا حکم دے دیا جاتا ہے اور کبھی ایسا صلح پسند بتایا جاتا ہے کہ فاروق کے دلائل سنتے ہی مطمئن ہو جاتے ہیں اور بیعت کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ (طبری ۳/۲۰۲)

حباب اور دوسرے افراد کی طرف سے کسی سرکشی کا مظاہرہ بھی دیکھنے میں نہیں آتا ہے کہ سارے امور اپنے ٹھکانے پر پہونچ گئے ہیں۔

عالم انسانیت کا عظیم ترین فکری سرمایہ

اگر مہاجرین ثلاثہ نے آلِ رسولؐ کے ساتھ تجہیز و تکفین رسولؐ میں شرکت کی ہوتی اور سرکار کے دفن کے بعد تمام مشایعت جنازہ کرنے والے مسجد پیغمبرؐ میں جمع ہوئے ہوتے اور

نماز فریضہ کو مولائے کل اور مولائے ثلاثہ کی اقتدا میں ادا کرنے کے بعد سب نے اپنے اپنے دل کی بات کہی ہوتی اور ہر شخص کو اظہار رائے کا موقع دیا گیا ہوتا اور اس کے بعد ولی خدا نے اپنی رائے اور حکم شریعت بیان کر کے تمام موجودہ آرار کا جائزہ لیا ہوتا اور قانون اسلام کے مطابق اختلافات کا فیصلہ کر دیا ہوتا اور سارے مسلمان اس گفتگو کو سنجیدگی کے ساتھ سماعت کر کے فیصلہ کرتے اور اس امام برحق کی بیعت کر لی جاتی جسے غدیر خم میں مولا بنایا گیا تھا تو اس مناظرہ کا ماحصل عالم انسانیت کا عظیم ترین فکری سرمایہ ہوتا اور تاریخ کا رخ مکمل طور سے بدل گیا ہوتا۔ اسلام کا سیاسی نظام منطبق کیا گیا ہوتا جسے مالک کائنات نے اپنے عبد خاص پر نازل کیا تھا اور اس کے ذریعہ سارے عالم انسانیت کو کردار کی بلندی تک پہونچا کر ایک عالمی اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آگیا ہوتا۔

مگر افسوس کہ یہ آرزو پوری نہ ہو سکی اور اس کا سبب صرف یہ تھا کہ ہم نے نص کو چھوڑ کر اجتہاد کا راستہ اختیار کر لیا اور جو امت نصوص کے مقابلہ میں اجتہاد کرے گی اس کا انجام ہلاکت و بربادی کے علاوہ کچھ نہیں ہو گا اور اسے ایک دن اپنے کیے کی سزا بھگتنا پڑے گی۔ اس لئے کہ اس نے نعمت خدا کو تبدیل کر دیا ہے اور پروردگار کے واضح احکام کی من مانی تاویل کی ہے۔ اور قانون الٰہی کو اپنی خواہش کے مطابق چلانا چاہا ہے۔

ارکان سقیفہ کے شرعی دلائل

آج یا کل یہ حقیقت اہل نظر کے سامنے کھل کر آجائے گی کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کا اجتماع سعد بن عبادہ کے ساتھ ایک بالکل سادہ سا اجتماع تھا اور اس کی کوئی سیاسی بنیاد نہیں تھی اور اگر وہاں کوئی سیاسی گفتگو تھی تو صرف اسی انداز سے جیسے نیادار لوگ ایک مقام پر جمع ہوتے ہیں تو مختلف موضوعات زیر بحث آجاتے ہیں۔

اس اجتماع کو سیاسی رنگ مہاجرین ثلاثہ کی آمد نے دیا ہے اور اس کی بنیاد انھیں تینوں افراد نے قائم کی ہے کہ وہاں وارد ہوتے ہی اسے سیاسی رنگ دے دیا اور خلیفہ سازی کا کام شروع کر دیا اور جب اسے سیاسی رنگ دے ہی دیا ہے تو یہ دیکھنا ہے کہ وہاں کن دلائل سے کام

لیا گیا ہے اور کامیاب ہونے والا کس بنیاد پر کامیاب ہوا ہے۔

انصار کی دلیل

یہ طے شدہ بات ہے کہ انصار کا اجتماع خلیفہ سازی کی بنیاد پر نہیں تھا جیسا کہ مورخین اپنے بیانات سے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں یہ خوب معلوم تھا کہ خلافت ان کا حق نہیں ہے اور ان کے بارے میں یہ احتمال بھی نہیں ہے کہ وہ دفن پیغمبرؐ سے پہلے سارے عہدِ خدا و رسولؐ کو تبدیل کر دیں گے۔

انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ رسول اکرمؐ ولی امت کا تقرر کر چکے ہیں اور ان کی زندگی میں سارے مسلمان اسے ولایت کی مبارکباد دے چکے ہیں۔ حد یہ ہے کہ یہ ثلاثہ بھی ہدیۂ تبریک پیش کر چکے ہیں اور اسے ولی اور مولا تسلیم کر چکے ہیں تو ایسی صورت میں خلیفہ سازی اور تعیین ولی امت کا کیا امکان ہے۔

اب چونکہ ان کا اجتماع خلافت کی بنیاد پر نہیں تھا اور انھوں نے ثلاثہ سے پہلے اس موضوع پر گفتگو بھی نہیں کی تھی لہٰذا ان کے پاس کسی معقول دلیل کے ہونے کا امکان بھی نہیں ہے۔ ان کی طرف منسوب دلائل صرف تمثیلیہ کو مکمل کرنے کے لئے تیار کئے گئے ہیں تاکہ ایک فریق کو بحث میں کامیاب قرار دیا جا سکے جیسا کہ تمثیلیہ مکمل کرنے اور اس کے ہیروؤں کو نمایاں کرنے اور ان کے اعمال کی توجیہ و تاویل کے لئے کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد انھیں ابطال تاریخ کی نگرانی میں قصہ دہرایا جاتا رہا اور سرکاری ذرائع ابلاغ اس کا پروپیگنڈہ کرتے رہے اور اس کے مخالف روایات کو نظر انداز کیا جاتا رہا یہاں تک کہ بعد کی نسلوں نے سرکاری شکل ہی کو حقیقی شکل قرار دے دیا اور اعتراض کرنے والوں کو مجرم اور قابلِ نفرت قرار دے دیا کہ انھوں نے اجماع امت کی خلاف ورزی کی ہے۔

مہاجرین ثلاثہ کا مقصد

ان حضرات کا مقصد یہ تھا کہ رسول اکرمؐ کے بعد ایک خلیفہ بنائیں۔ لیکن اس موجودہ

صورت حال میں۔ یعنی آل رسولؐ کی عدم موجودگی میں اور ان کے تجہیز و تکفین میں مشغولیت کے ماحول میں۔ تاکہ حاضرین کی بیعت حاصل ہو جائے اور اوس کی بیعت کے بعد سیاسی ضرورت کی بنا پر خزرج والے بیعت کر لیں تاکہ سارے عہدے اوس کو نہ ملنے پائیں اور بیعت کرنے والوں کے سارے مصالح جدید خلیفہ سے وابستہ ہو جائیں اور جس کی بیعت کیجائے وہ خلیفہ بن کر مجمع سے نکلے اور باقی دو افراد نائب خلیفہ بن کر برآمد ہوں اور ان کے پیچھے بیعت کرنے والوں کا لشکر ہو جو ان کے اشاروں پر چلتا ہو اور مخالفت کرنے والا یا اعتراض کرنے والا ایک عام انسان کا مخالف نہ ہو بلکہ ایک خلیفۃ المسلمین کا مخالف ہو اور ایک ولی امر کا باغی ہو اور یہ سارا لشکر خلیفہ کے اشارہ پر اسے قتل کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے کہ اس نے اجماع کی مخالفت کی ہے اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کی ہے اور اس میں طمع ریاست پائی جاتی ہے اور اسلام کا کھلا ہوا قانون ہے کہ لالچی کو عہدہ سپرد نہیں کیا جاتا ہے۔

ثلاثہ کی شرعی دلیل

اب سوال یہ ہے کہ ان ثلاثہ کے پاس کون سی دلیل تھی جس کے سامنے سارے انصار سر تسلیم خم کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔؟

کیا واقعاً ان کی دلیل شرعی تھی اور اس کا شرع میں کوئی تذکرہ تھا؟

تاریخ کے بیان کے مطابق ابو بکر و عمر کی دلیل صرف یہ تھی کہ ہم پیغمبرؐ کے قرابتدار ہیں اور ان کی حکومت کے زیادہ حقدار ہیں۔

ابو بکر کا کہنا تھا کہ "ہم مہاجر افراد سب سے پہلے اسلام لائے ہیں۔ سارے لوگ ہمارے تابع ہیں۔ ہم عشیرۂ رسولؐ سے ہیں اور عرب میں بہترین نسب کے مالک ہیں۔ عرب میں کوئی قبیلہ ایسا نہیں ہے جس پر قریش کا حق نہ ہو۔"

عمر کی دلیل یہ تھی کہ "خدا کی قسم اے گروہ انصار! جب رسول اکرمؐ تم میں سے نہیں ہیں تو عرب تمہاری حکومت سے ہرگز راضی نہ ہوں گے۔ عرب صرف اسے حکومت دینا چاہتے ہیں جس کے گھر میں نبوت رہی ہو۔ ہمارے پاس عرب کے مقابلہ میں واضح دلیل اور نمایاں برہان

موجود ہے۔ ہم عشیرہ و قرابتدار ہیں۔ ہم سے ان کی حکومت کے بارے میں وہی اختلاف کرے گا جو باطل پرست، گنہگار یا ہلاک ہونے والا ہوگا۔

انصار کا جواب

"ہم صرف علیؑ کی بیعت کریں گے"۔
"ہم علیؑ کے علاوہ کسی کی بیعت نہ کریں گے"۔
(طبری ۳/ ۱۹۸، شرح النہج ۲/ ۲۶۵)

حالانکہ علیؑ اس وقت موجود نہ تھے تو اگر موجود ہوتے تو کیا صورت حال ہوتی۔ خدا بہتر جانتا ہے۔

آرزوئے مسلم

اے کاش ثلاثہ نے اس بات کو قبول کر لیا ہوتا تو کسی طرح کا کوئی ہنگامہ نہ ہوتا اور اسلام کا سیاسی نظام اپنے فطری راستہ پر چلتا رہتا۔ لیکن ان کے لئے یہ ناممکن تھا کہ یہ خلافت و نبوت کو ایک گھر میں برداشت نہیں کر سکتے تھے اور بنی ہاشم بلا شرکت غیرے نبوت لے چکے تھے۔ اب خلافت دوسرے قبائل کو ملنی چاہیئے تاکہ وہ آپس میں دست گرداں کرتے رہیں اور بنی ہاشم کو کوئی حصہ نہ ملنے پائے۔

تین میں سے ایک

مہاجرین ثلاثہ نے انصار کے نعرہ کو یکسر نظرانداز کر دیا اور ابوبکر نے فرمایا کہ میں تمھیں ان دو میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کی نصیحت کرتا ہوں اور عمر نے فوراً بات کاٹ دی کہ معاذاللہ آپ کے ہوتے ہوئے ہم لوگ؟ ہاتھ بڑھائیے بیعت کریں۔! اور کام مکمل ہوگیا۔

پہلا بیعت کرنے والا

سب سے پہلے ابوبکر کی بیعت بشیر بن سعد انصاری نے کی۔ انھوں نے دیکھ لیا

کہ یہ ثلاثہ علیؑ کا نام برداشت نہیں کر رہے ہیں اور خلافت انہیں کے درمیان رہنے والی ہے تو کم سے کم اولیت کا شرف حاصل کر لیا جائے لہٰذا فوراً بیان دیدیا کہ رسول اکرمؐ قریش میں سے تھے اور ان کی قوم ان کی میراث اور حکومت کی زیادہ حقدار ہے اور کہہ کر دوڑ کر ابو بکر کی بیعت کر لی۔ (الامامۃ والسیاسۃ ص ۸-۹)

واضح رہے کہ یہ بشیر بن سعد اُن دو انصار میں شامل ہے جنھوں نے تمام قوم انصار سے الگ ہو کر صفین میں معاویہ کے ساتھ علیؑ سے مقابلہ کیا ہے۔

تقرر خلیفہ اور بیعت

قبیلہ اوس والوں نے رئیس خزرج سعد بن عبادہ کا انداز دیکھ لیا اور مہاجرین ثلاثہ کے موقف اور اس کے انجام کا بھی اندازہ کر لیا تو اسید بن حضیر نے فیصلہ کیا کہ خلیفہ بہر حال ابو بکر ہی ہونے والے ہیں لہٰذا اپنی قوم کو حکم دیا کہ فوراً ابو بکر کی بیعت کر لیں اور اسطرح قبیلہ اوس نے بیعت کر لی۔ اب خزرج والوں کو خیال پیدا ہوا کہ اس طرح سارا شرف اور سارے عہدے اوس میں چلے جائیں گے اور ہمیں کچھ نہ ملے گا لہٰذا انھوں نے بھی فوراً بیعت کا اعلان کر دیا۔

معاوضہ

اس طرز عمل کا فائدہ یہ ہوا کہ بشیر بن سعد ابو بکر کے مشیروں اور نائبوں میں شمار ہونے لگا اور اس نے ابو بکر و عمر کو یہ مشورہ دیا کہ سعد بن عبادہ کو قتل نہ کیا جائے اُدھر اُسید بن حضیر داخلی فوج کا کمانڈر ہو گیا اور اسی نے عمر کے اشارہ پر اس فوج کی قیادت کی تھی جسے بنی ہاشم سے بیعت لینے کے لئے تیار کیا گیا تھا اور اسی مہم میں سلمہ بن اسلم بھی شامل تھا۔

(الامامۃ والسیاسۃ ص ۹)

خبر پھیل گئی

ابو بکر اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ سقیفہ سے نکل کر مسجد میں آئے تو مسلمان

مسجد میں جمع تھے۔ عمر نے مجمع دیکھتے ہی اعلان شروع کر دیا۔ آخر تم لوگ حلقوں میں کیا بیٹھے ہو۔ اٹھو ابو بکر کی بیعت کر و کہ میں نے اور انصار نے ان کی بیعت کر لی ہے۔

چنانچہ عثمان اور بنی امیہ نے فوراً بیعت کر لی۔

اس کے بعد سعد بن ابی وقاص، عبد الرحمن بن عوف، اور دیگر بنی زہرہ نے بیعت کی اور انصار کے حاضرین نے باقی انصار کی بیعت کا ذکر سُن کر بیعت کر لی جب کہ بشیر بن سعد اُسید بن حضیر اور سلمہ بن اسلم کو شریک کار و بار دیکھ بھی لیا ہے۔

صرف علیؑ، عباس، زبیر بن العوام اُٹھ کر چلے گئے اور نائب الخلیفہ نے انھیں طلب کرنے کے لئے لشکر روانہ کر دیا جس کو ہدایت تھی کہ سب کو گھر سے نکالا جائے چاہے گھر میں آگ لگانی پڑے۔

چنانچہ صورت حال دیکھ کر تمام حضرات باہر نکل آئے اور دربار خلافت میں حاضر کر دئے گئے۔ اس حادثہ کا بار بار ذکر کیا جا چکا ہے اور اس میں کوئی حیرت بھی نہیں ہے کہ جو شخص پیغمبرؐ کو تحریر سے روک سکتا ہے۔ انھیں ہذیان گو بنا سکتا ہے۔ وہ ان کی بیٹی کے گھر میں آگ بھی لگا سکتا ہے اور ان کے داماد کو قتل بھی کر سکتا ہے۔

ولیِ خدا اور حکومتِ وقت کے درمیان غیر عادلانہ مقابلہ

پیغمبر اسلامؐ کے بعد ولی خدا کو تمام شعبہ ہائے اقتدار سے الگ کر دیا گیا اور ابو بکر کے پاس کھینچ کر لایا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں خدا کا بندہ اور رسول اللہ کا بھائی ہوں۔ میرے ساتھ یہ برتاؤ کیسا ہے۔؟

جواب ملا کہ ابو بکر کی بیعت کرنا ہے۔

فرمایا کہ میں زیادہ حقدار ہوں۔ تمھارا فرض ہے کہ میری بیعت کر و۔ تم نے انصار سے اس امر کو اس دلیل پر لیا ہے کہ تم پیغمبرؐ کے قرابتدار ہو اور اب ہم اہلبیت پیغمبرؐ سے غصب کرنا چاہتے ہو۔

کیا تم نے انصار سے یہ نہیں کہا کہ تم اس بنیاد پر اولیٰ ہو کہ پیغمبرؐ تم میں سے تھے

لہٰذا قیادت و حکومت تمھیں ملنی چاہیئے تو اب یہی بات میں تم سے کہتا ہوں کہ ہم زندگی اور موت میں رسول اکرمؐ سے قریب تر ہیں۔ لہٰذا اگر تمھارا ایمان اللہ و رسول پر ہے تو میرے حق میں انصاف کرو ورنہ جان بوجھ کر ظالموں میں شمار ہو جاؤ۔

ولی خدا کا یہ کلام کسی قیمت پر رد نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن عمر نے فوراً فیصلہ کر دیا کہ جب تک بیعت نہ کرو گے تمھیں چھوڑا نہ جائے گا۔

فرمایا کہ ہاں ہاں خوب دودھ دوہو تمھیں بھی حصہ ملے گا اور آج اس حکومت کو مضبوط بناؤ کل پلٹ کر تمھارے ہی پاس آنے والی ہے۔ عمر! یاد رکھو کہ نہ میں تمھاری بات قبول کروں گا اور نہ بیعت کروں گا۔

جس پر ابو عبیدہ نے مداخلت کی اور کہا کہ یا علیؑ! آپ نوجوان ہیں اور یہ سب آپ کی قوم کے بزرگ ہیں آپ کے پاس ان کے جیسے تجربات نہیں ہیں۔ میرے خیال میں ابو بکر آپ سے زیادہ قوی تر ہیں اور زیادہ تجربہ کار ہیں لہٰذا بہتر یہ ہے کہ خلافت کو ان کے حوالہ کر دیں۔ اس کے بعد اگر آپ زندہ رہ گئے تو مستقبل میں یہ عہدہ آپ کو مل جائے گا اور آپ اپنے علم، فضل۔ دین۔ فہم، کارنامے، نسب، قرابت کی بنا پر سب سے زیادہ حقدار ہوں گے۔

آپ نے فرمایا گروہ مہاجرین! اللہ کو یاد کرو۔ پیغمبر اسلامؐ کی حکومت کو ان کے اصلی گھر سے نکال کر اپنے گھروں میں نہ لے جاؤ اور ان کے اہلبیتؑ کو ان کے حق اور مقام سے محروم نہ کرو۔ خدا کی قسم ہم اس امر کے زیادہ حقدار ہیں جب تک ہمارے درمیان کتاب خدا کے قاری، دین خدا کے فقیہ، سنن پیغمبرؐ کے عالم۔ امور رعایا کے ذمہ دار، برائیوں کے دفع کرنے والے، برابر سے تقسیم کرنے والے موجود ہیں اور خدا کی قسم وہ موجود ہیں لہٰذا خواہشات کا اتباع نہ کرو کہ راہ حق سے بہک جاؤ اور گمراہی میں دور تک چلے جاؤ۔

پہلے بیعت کرنے کا فیصلہ

ظاہر ہے کہ حکومت وقت کے پاس اس تقریر کا کوئی جواب نہ تھا۔ لیکن بشیر بن سعد

ابوبکر کا پہلا بیعت کرنے والا پہلو میں موجود تھا اس نے ارکانِ سلطنت کی موجودگی میں یہ فیصلہ سنا دیا کہ اگر انصار نے اس بیان کو بیعت ابوبکر سے پہلے سن لیا ہوتا تو دو آدمی بھی اختلاف نہ کرتے۔ لیکن اب وقت گذر چکا ہے۔ (الامامۃ والسیاسۃ ص ۱۱-۱۲)

ایک نیا اقدام

اس کے بعد حضرت علیؑ نے رات کے وقت بنت پیغمبرؐ کو ساتھ لیا اور انصار کے دروازہ دروازہ جاکر نصرت کا مطالبہ کیا اور سب کا ایک جواب تھا کہ ہم پہلے ابوبکر کی بیعت کر چکے ہیں۔ بنتِ رسولؐ! اگر آپ کے شوہر پہلے آئے ہوتے تو ہم انھیں ہرگز نظر انداز نہ کرتے۔
جس پر حضرت علیؑ نے فرمایا کہ کیا میں جنازۂ رسولؐ کو چھوڑ کر سلطنت کے جھگڑے میں شامل ہو جاتا۔ اور جناب فاطمہؑ نے فرمایا کہ ابوالحسنؑ نے وہی کیا ہے جو ان کا فرض تھا اور تم لوگوں نے وہ کیا ہے جس کا روز قیامت حساب دینا ہے۔ (الامامۃ والسیاسۃ ص ۱۱-۱۲)

ولی خدا کی توہین اور قتل کی دھمکی

پہلے حکومت نے خانۂ فاطمہؑ کے جلانے کی دھمکی دی کہ اگر لوگ باہر نہ نکلے تو گھر کو آگ لگا دی جائے گی، اور جب یہ کہا گیا کہ اس میں دخترِ پیغمبرؐ فاطمہ زہراؑ بھی ہیں تو جواب ملا کہ ہوا کریں۔!

اصحاب حضرت علیؑ نے اندازہ کر لیا کہ عمر اپنے عزائم میں سنجیدہ ہے اور بعید نہیں کہ گھر کو آگ لگا دی جائے۔ لہٰذا بہت سے لوگ نکل آئے اور جبریہ بیعت کا اظہار کر دیا۔
لیکن حضرت علیؑ نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا اور جناب فاطمہؑ دروازہ پر کھڑے ہو کر فریاد کرنے لگیں کہ میں نے تم سے بدتر قوم نہیں دیکھی ہے کہ تم نے جنازۂ رسولؐ کو چھوڑ دیا اور ہمارے مشورہ کے بغیر جو چاہا فیصلہ کر لیا اور ہمارے کسی حق کا خیال نہیں کیا۔!
ادھر ابوبکر نے کسی کو بھیجا کہ علیؑ کو بلا کر لے آئے۔ آپ نے انکار کر دیا۔ تو عمر اٹھا اور اس کے ساتھ ایک جماعت چلی۔ جنھوں نے درِ زہراؑ پر آکر دق الباب کیا اور جناب فاطمہؑ نے

ان کی آواز سُن کر باآواز بلند فریاد کی " بابا رسول خدا! ذرا دیکھئے کہ آپ کے بعد ہم نے ابن الخطاب اور ابن ابی قحافہ سے کیا کیا مصائب دیکھے ہیں"۔

قوم نے یہ فریاد سنی تو سب واپس چلے آئے اور قریب تھا کہ سب کے دل پھٹ جاتے اور جگر سے خون ٹپکنے لگتا لیکن عمر وہ تند مزاج انسان ہے جس کے یہاں نرمی کا گذر نہیں ہے۔ اس نے بہر حال حضرت علیؑ کو گھر سے باہر نکال لیا اور ابو بکر کے سامنے پیش کر کے بیعت کا تقاضا کیا۔

آپ نے فرمایا کہ اگر نہ کروں تو کیا ہوگا۔؟

کہا خدائے وحدہ لاشریک کی قسم تمھاری گردن کاٹ دی جائے گی۔

فرمایا، یعنی ایک اللہ کے بندہ اور پیغمبرؐ کے بھائی کا قتل ہوگا؟

عمر نے کہا کہ آپ اللہ کے بندہ تو ہیں لیکن ہم پیغمبرؐ کا بھائی نہیں مانتے ہیں۔

اس کے بعد ابو بکر سے کہا کہ آپ اپنا حکم جاری فرمائیں۔

ابو بکر نے کہا کہ میں جبر نہیں کرنا چاہتا جب تک فاطمہؑ ان کے پہلو میں ہیں۔

یہ سُن کر حضرت علیؑ نے قبر پیغمبرؐ کا رُخ کیا اور قبر سے لپٹ کر نالہ و شیون شروع کر دیا۔ "بھائی قوم نے مجھے کمزور بنا دیا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیں"۔

رضائے فاطمہؑ کی فکر

کافی اصرار کے بعد صدیق اور فاروق کو خدمتِ زہراؑ میں حاضری کا موقع ملا تو آپ نے فرمایا کہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر بتاؤ کیا تم نے رسول اکرمؐ سے یہ حدیث نہیں سُنی ہے کہ فاطمہؑ کی رضا میری رضا ہے اور فاطمہؑ کی ناراضگی میری ناراضگی ہے۔ جس نے میری بیٹی فاطمہؑ سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے اسے راضی کیا اس نے مجھے راضی کیا اور جس نے اسے ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا۔

دونوں نے کہا کہ بے شک سُنی ہے۔

فرمایا کہ میں خدا اور ملائکہ کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ تم دونوں نے مجھے ناراض کیا ہے

اور خوش نہیں کیا ہے۔ میں جب بھی پیغمبرؐ سے ملاقات کروں گی تم دونوں کی شکایت کروں گی۔ ابوبکر پر گریہ طاری ہوگیا لیکن آپ نے فرمایا کہ میں ہر نماز میں تم دونوں کے حق میں بددعا کروں گی۔ اور یہ سُن کر ابوبکر روتے ہوئے باہر نکل گئے۔ (الامامۃ والسیاسۃ ص ۱۲۔۱۳)

استعفا کا ارادہ

اس کے بعد لوگ ابوبکر کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے فرمایا کہ ہر شخص رات کو اپنی زوجہ کے ساتھ خوش و خرم آرام کرتا ہے اور تم لوگوں نے مجھے اس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ "مجھے تمھاری بیعت کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے معاف کردو" ظاہر ہے کہ حاضرین کو انکار بھی کرنا چاہیئے تھا اور اس کی شرعی تاویل بھی کرنا چاہیئے تھی۔ (الامامۃ والسیاسۃ ص ۱۱)

ولیِ خدا کا آخری موقف

حکومت کے امور مستقر ہوگئے اور ولیِ خدا کی حیثیت ایک عام رعایا کی ہوگئی جس کا کسی پر کوئی حق نہ ہو اور حکومت چاہے تو اسے قریب بنائے اور چاہے تو دور کردے۔ سارے حقوق اسی کو حاصل ہیں اس لئے کہ غلبہ اسی کے ساتھ ہے۔

ولیِ خدا کی خلافت ہنگاموں میں گم ہوگئی جو خدا و رسولؐ کی طرف سے ان کا خالص حق تھا اور مقابلہ جاری رکھنے کا انجام قتل کے علاوہ کچھ نہیں تھا جب کہ حکومت کے پاس قتل کے بہت سے جواز موجود ہیں۔

مسلمانوں میں تفرقہ کا الزام بھی لگ سکتا ہے۔

حکومت کی بغاوت کا جُرم بھی ثابت کیا جاسکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد دوسری مصیبت یہ ہے کہ اپنے گھر والوں کے علاوہ کوئی ساتھ نہیں ہے جس کی تصویر کشی آپ نے ان لفظوں میں فرمائی ہے کہ "میں نے دیکھا کہ میرے ساتھ صرف گھر والے رہ گئے ہیں لہٰذا ان کو موت سے بچانے کی فکر کی اور آنکھوں میں کھٹک کے باوجود آنکھ بند کی اور گلے میں اچھو کے باوجود پانی پیا اور گرفتاریوں پر صبر کیا اور حنظل سے زیادہ تلخ

ذائقہ کو برداشت کیا۔"

"خدا قریش کو اس کے کئے کا بدلہ دے کہ ان لوگوں نے قطع رحم کیا اور مجھ سے میرے بھائی کی حکومت کو چھین لیا اور اس امر پر جھگڑا کیا جو میرا اپنا تھا۔"

کسی نے کہا کہ آپ حکومت کے حریص معلوم ہوتے ہیں؟

فرمایا کہ خدا کی قسم تم زیادہ حریص ہو۔ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں اور تم اس کے درمیان حائل ہو رہے ہو۔ خدا کی قسم میں رسول اکرمؐ کے انتقال کے دن سے آج تک اپنے حق سے برابر محروم کیا جا رہا ہوں۔ (شرح النہج ۲/۶۷)

اب آپ کے سامنے صرف ایک راستہ تھا کہ اپنے حق کو محفوظ رکھیں اور اس طرح احتجاج جاری رکھیں کہ مسلمانوں میں تفرقہ اندازی کا الزام بھی نہ لگنے پائے اور دشمن کسی موقع سے فائدہ بھی نہ اٹھانے پائے۔ چنانچہ آپ نے خانہ نشینی اختیار کر لی اور جبراً ہی گھر سے نکالے گئے ورنہ از خود نکل آتے تو اتمام حجت بھی نہ ہو سکتا اور چاہنے والوں کے پاس کوئی دلیل بھی نہ رہ جاتی۔

آپ نے حفاظت دین اور استحقاق خلافت مسلمین کے درمیان سے ایک راستہ نکالا اور جب بھی اسلام کو خطرہ میں دیکھا اور دشمنوں کے خطرہ کو دفع کرنے کے لئے مدد کی ضرورت محسوس کی حکومت وقت کے ساتھ مسالمت آمیز رویہ اختیار کیا اور اس کی مشکل کشائی کرتے رہے تا کہ امت محفوظ رہے۔ دین تباہ نہ ہونے پائے، واجب شرعی و عقلی ادا ہو جائے اور دنیا آخرت پر مقدم نہ ہونے پائے۔

(المراجعات للسید شرف الدین العاملی ص ۳۳۲-۳۳۴)

قریش کی نفرت کا راز

درحقیقت یہ راز اس سیاسی تربیت میں پوشیدہ تھا جس کی بنیاد قبائل میں مساویانہ طور پر تقسیم شرف و منصب پر تھی اور ہر قبیلہ کو ایک حصہ حاصل تھا اور جس نظام کو ہاشمی نبوت نے تباہ و برباد کر دیا تھا اور اسے تمام کوششوں کے ناکام ہو جانے کے بعد بطور تقدیر کائنات

قبول کرنا پڑا تھا اور اس طرح بنی ہاشم ایک مخصوص شرف کے مالک ہو گئے تھے اور پھر رسول اکرمؐ نے اپنی زندگی میں علیؑ کو مولا اور خلیفہ بنا دیا تھا کہ وہی اعلم، افہم، افضل اور انسب ہیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ذریعہ قریش اپنے تمام موروثی حقوق سے محروم ہو جائیں گے اور ان کا قدیم سیاسی نظام ایک مرتبہ پھر ہوا میں اڑ جائے گا۔

خطرہ کا خوف

اگر پیغمبرؐ کے بعد علیؑ کو خلیفہ مان لیا گیا اور ان کی بیعت کر لی گئی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بنی ہاشم نے نبوت اور خلافت دونوں پر قبضہ کر لیا اور قریش کے سارے قبائل ہر شرف سے محروم ہو گئے۔ جو بات ناقابل برداشت ہے اور اسے کسی قیمت پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا ہے کہ قریش اسلام میں داخل ہو گئے ہیں اور اسلام مساوات کا مذہب ہے اور اس نے پرانے معاملات کی معافی کا وعدہ کیا ہے لہٰذا اب کوئی وجہ نہیں ہے کہ سارا امتیاز بنی ہاشم کے ہاتھ میں رہے اور وہی انفرادی طور پر ہر منصب شرف کے مالک رہیں۔

عادلانہ تقسیم

قریش میں عادلانہ تقسیم یہ ہے کہ بنی ہاشم نے بلاشرکت غیرے نبوت پر قبضہ کر لیا ہے اور قریش کو کوئی حصہ نہیں دیا ہے اور آئندہ بھی کوئی حصہ ملنے والا نہیں ہے جب کہ دیگر قبائل بھی بنی ہاشم کی برادری ہی میں شامل ہیں تو اب تقاضائے انصاف یہ ہے کہ خلافت کا منصب صرف دیگر قبائل کو دے دیا جائے اور بنی ہاشم کو شریک نہ کیا جائے۔ یہی مسئلہ کا حل ہے اور یہی انصاف کا تقاضا ہے کہ نبوت بنی ہاشم کی رہے اور خلافت غیر بنی ہاشم کے ساتھ مخصوص ہو جائے (اگر ان معاملات میں پروردگار کا کوئی دخل نہ ہو)۔

قبائل قریش کا اتحاد

اسی بنیاد پر سارے قبائل قریش ایک فریق کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور

آپس میں کوئی اختلاف نہیں کیا کہ سب کا ہدف ایک تھا اور سب کا مدعا یہ تھا کہ نبوت اور خلافت ایک خاندان میں جمع نہ ہونے پائیں۔

چنانچہ ابو بکر نے بھی سقیفہ میں انصار سے خطاب کر کے یہی کہا تھا کہ "میں ابو عبیدہ اور عمر کے بارے میں نصیحت کرتا ہوں کہ کسی ایک کی بیعت کر لو"۔

اور عمر نے کہا تھا کہ معاذ اللہ آپ کے ہوتے ہوئے ہم لوگ کون ہوتے ہیں۔؟"

اور ابو عبیدہ کا بھی تقریباً یہی موقف تھا اور تینوں ایک برادری کی طرح ایک فریق کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور جب انصار نے کہہ دیا کہ ہم صرف علیؑ کی بیعت کریں گے، تو سب نے مل کر انکار کر دیا۔

اور پھر جب ابو بکر نے استعفا دینا چاہا تو سارے قریش آڑے آگئے اور سب نے اجتماعی طور پر انھیں روک دیا جس کے بارے میں حضرت علیؑ نے فریاد کی ہے کہ "قریش کو ان کے اعمال کا بدلہ دیا جائے کہ انھوں نے قطع رحم کیا اور مجھ سے میرے بھائی کی حکومت کو چھین لیا۔ مجھے حقیر شمار کیا اور میرے مقابلہ میں سب متحد ہو گئے"۔

اس کے بعد جب ابو بکر نے وصیت نامہ لکھوانا چاہا اور عثمان کو بلا کر لکھوانا شروع کیا اور بیہوش ہو گئے تو عثمان نے از خود مکمل کر دیا اور انھوں نے دعائے خیر بھی دے دی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ابو بکر۔ عمر۔ عثمان۔ ابو عبیدہ میں کوئی فرق نہیں ہے اور سب ایک برادری کے ہیں اور اسی لئے عمر نے کہا تھا کہ ابو عبیدہ زندہ ہوتے تو انھیں کو بنا دیتا۔ معاذ بن جبل زندہ ہوتے۔ خالد بن ولید زندہ ہوتے۔ سالم زندہ ہوتے۔۔۔۔۔ گویا یہ سب ایک برادری کے لوگ تھے اور ان میں آپس میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ معاذ بن جبل انصار میں ہو کر بھی خلیفہ ہو سکتے تھے۔ سالم موالی میں ہو کر بھی خلیفہ ہو سکتے تھے۔ صرف حضرت علیؑ نہیں ہو سکتے تھے۔

پھر جس دن شوریٰ کا کام ہو رہا تھا اس دن طلحہ موجود نہیں تھا اس لئے دیر لگی ورنہ اگر علیؑ کا نام نہ ہوتا تو فوراً عثمان کی بیعت ہو جاتی اس لئے کہ انھوں نے سب سے پہلے ابو بکر کی بیعت کی تھی اور عمر کے بارے میں وصیت نامہ لکھتے وقت انھوں نے از خود

عمر کو خلیفہ نامزد کر دیا تھا اور انھیں عمر کے ساتھ ردیف کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا جو مستقبل کا بہترین اشاریہ تھا اور عمر کی وصیت کا انداز بھی اس امر کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ عثمان کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں۔

پھر طلحہ کی واپسی کے بعد عثمان ان کے حق میں دستبردار ہونے کے لئے تیار ہو گئے اگر طلحہ خلیفہ بننا چاہیں اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب سب ایک ہی برادری کے تھے اور ایک فریق کی حیثیت سے ایک غرض کے تحت کام کر رہے تھے کہ بنی ہاشم کے گھر میں نبوت اور خلافت جمع نہ ہونے پائیں۔

بعض لوگوں نے تو فاروق کو ان کے فرزند عبداللہ کی خلافت کا بھی مشورہ دیدیا تھا کہ وہ بھی خلیفہ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ بھی اسی فریق میں شامل ہیں اور ان کی خلافت بھی بنی ہاشم کو محروم بنا سکتی ہے۔

فصل یازدھم

بنی ہاشم کی تمام سیاسی حقوق سے علیحدگی

قریش کے قبائل نے فقط حضرت علیؑ کو منصب ریاست وخلافت سے محروم نہیں کیا بلکہ تمام بنی ہاشم کو تمام سرکاری عہدوں سے الگ کر دیا نہ ابو بکر نے کسی ہاشمی کو کوئی عہدہ دیا نہ عمر نے اور نہ عثمان نے۔ (الامامۃ والسیاسۃ ص ۲۴)

عبد الرحمٰن بن عوف نے تو حضرت علیؑ سے کہہ دیا تھا کہ میں اس شرط سے بیعت کروں گا کہ بنی ہاشم میں سے کوئی شخص لوگوں کی گردنوں پر مسلط نہ ہونے پائے یعنی اسے کوئی عہدہ نہ دیا جائے جس کا جواب حضرت علیؑ نے یہ دیا تھا کہ تجھے ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر تو نے خلافت میرے حوالے کر دی ہے تو میں امت پیغمبرؐ کے مصالح پر غور کروں گا اور جس شخص میں بھی طاقت اور امانتداری دیکھوں گا اس سے مدد لوں گا چاہے وہ بنی ہاشم میں ہو یا غیر بنی ہاشم میں۔

عبد الرحمٰن نے کہا کہ نہیں۔ جب تک آپ یہ وعدہ نہ کریں گے خلافت نہ دیجائیگی۔

آپ نے فرمایا کہ یہ وعدہ تو قیامت تک نہیں کر سکتا۔ (الامامۃ والسیاسۃ ص ۲۶-۲۷)

اس کے معنی یہ ہیں کہ خلیفہ کو خلافت پانے کے بعد بھی بنی ہاشم سے کام لینے کا حق نہیں ہے چاہے وہ طاقتور اور ایمان دار ہی کیوں نہ ہوں۔

یہ ہے صراحت و وضاحت کی آخری حد۔

اور اب یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ عبد الرحمٰن نے اُسی دقتِ نظر کیساتھ عمر کی وصیت پر عمل کیا ہے جس باریک بینی سے انھوں نے وصیت کی تھی۔

بنی ہاشم کی علیحدگی کا مقصد

اس کا جواب حضرت فاروق کے پاس موجود ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ ابن عباس کو عہدہ دینے کا ارادہ کیا تھا لیکن پھر تردّد پیدا ہوگیا اور اس تردّد کی اطلاع ابن عباس کو مل گئی تو انھوں نے سبب پوچھ لیا جس کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ " ابن عباس! مجھے خوف ہے کہ مجھے موت آجائے اور تم اس وقت تک اس عہدہ پر برقرار رہو اور پھر اپنے والوں کے حوالے کر دو حالانکہ یہ صرف تمھارے لئے ہے۔ (مروج الذہب ۲/۳۵۳-۳۵۴)

گویا حضرت فاروق کو مرنے کے بعد تک کی فکر ہے کہ میرے مرنے کے بعد بھی علیؑ یا کسی ہاشمی کو کوئی عہدہ نہ ملنے پائے اور یہ "نظریۂ عدم اجتماع نبوت و خلافت" سے وفاداری کی آخری منزل ہے۔

پردہ ہٹا اور راز کھلا

قبائل قریش نے شرافتوں کو تقسیم کرلیا۔ نبوت بنی ہاشم کے حصہ میں چلی گئی جس میں ان کا کوئی شریک نہیں تھا اور خلافت دیگر قبائل کا حصہ ہوگئی جس میں بنی ہاشم کا کوئی حصہ نہیں تھا اور اس کی نگاہ میں یہ انتہائی عادلانہ تقسیم تھی جس کی بنیاد وہ اجماع ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ بنی ہاشم میں نبوت اور خلافت جمع نہ ہونے پائیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ عملاً کیا طریقۂ کار اختیار کیا جائے اور اس تقسیم کو کس طرح لازم قرار دیا جائے اور اس فیصلہ پر کس طرح عملدرآمد کیا جائے؟

ابھی یہ تحیر و تردّد ختم نہ ہوا تھا کہ قریش کا ایک فرزند رشید عمر سامنے آگیا اور اس نے ان کے جذبات و احساسات کی مکمل ترجمانی کرتے ہوئے اس کی تنفیذ کا ذمہ لے لیا بلکہ اسے قانون کی شکل دینا بھی انھیں کی ذمہ داری ہوگیا جس صورت حال نے انھیں قریش کا فرزند ارجمند بنا دیا۔

انھوں نے پہلے رسول اکرمؐ کو وصیت نامہ کی کتابت سے روکا اور بیماری کی دلیل قائم کر دی اور طے کر دیا کہ ہمارے لئے کتاب خدا کافی ہے اور ان کے اعوان و انصار نے بھی ان کی تائید

کر دی بلکہ شدّت تائید میں رسولِ اکرمؐ کے ہذیان گو ہونے کا نعرہ بھی لگا دیا اور ایسا اختلاف پیدا کیا کہ ایک فریق رسول اکرمؐ کے ساتھ ہوگیا اور ایک اُن کے ساتھ اور ان کے مویدین کے پاس کچھ نہ تھا سوائے اُس اعتماد مطلق کے جو اُن کی ذات پر تھا اور اِس علم ویقین کے کہ رسول اکرمؐ کیا لکھنے والے ہیں۔

حضرت عمر نے اپنی ذکاوت و ذہانت سے سمجھ لیا تھا کہ رسول اکرمؐ عہد ولایت کی تجدید کرنا چاہتے ہیں لہٰذا انھوں نے آپ کو تحریر کرنے سے روک دیا اور شدت مرض کو بہانہ بنا دیا گویا کہ شدّت مرض میں حضور کو وصیت کرنے کا حق نہیں ہے۔ صرف یہ کام حضرت صدیق کر سکتے ہیں جب ان کے حق میں وصیت نامہ لکھنا چاہیں یا وہ خود کر سکتے ہیں اگر نظام شوریٰ مرتب کرنا چاہیں۔

حضرت عمر کا رسول اکرمؐ کو تحریر لکھنے سے روک دینا ایسا واقعہ ہے جس کا منکر ابھی تک نہیں پیدا ہوا ہے اور نہ کسی میں اس کی تاویل کی ہمّت ہے۔ اور اسی طرح شدت مرض میں ابو بکر و عمر کا وصیت نامہ لکھوانا بھی ایسا واقعہ ہے جو مشرق میں طلوع شمس کی طرح واضح ہے اور انھیں دونوں واقعات پر نظام خلافت کی بنیادوں کا دار و مدار ہے۔

فاروق کی وضاحت

فاروق نے ایک دن ابن عباس سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ تم نے اپنے ابن عم کو کس حال میں چھوڑا ہے؟

ابن عباس نے سمجھا کہ عبداللہ بن جعفر کے بارے میں پوچھ رہے ہیں تو فرمایا کہ ان کے ساتھیوں کے درمیان چھوڑا ہے۔

کہا میری مراد وہ نہیں ہیں۔ تمھارے گھرانے کی عظیم ترین شخصیت مراد ہے۔

فرمایا کہ حالتِ قراءت قرآن میں چھوڑا ہے۔

کہا خدارا چھپانا نہیں۔ سچ سچ بتاؤ کیا ابھی علیؑ کے دل میں خلافت کا خیال باقی ہے؟

فرمایا بے شک۔!

کہا کیا ان کا خیال ہے کہ رسول اکرمؐ نے ان کے بارے میں نص فرمائی ہے؟

فرمایا میں ایک بات اور بتاتا ہوں کہ میں نے اس نص کے بارے میں اپنے والد سے پوچھا تھا تو انھوں نے فرمایا تھا کہ بالکل صحیح ہے۔

عمر نے کہا کہ ان کے بارے میں رسول اکرمؐ بہت اونچی اونچی باتیں فرمایا کرتے تھے اور ان کے معاملات کا امتحان کرتے رہتے تھے اور پھر مرض الموت میں بھی یہی بات صراحتاً لکھنا چاہتے تھے لیکن میں نے منع کر دیا۔ (شرح النہج ۱۵۵/۳)

نظریہ عدم اجتماع نبوت وخلافت میں فاروق کی رائے

ایک دن عمر نے ابن عباس سے ایک طویل گفتگو کے دوران کہا کہ تمھیں معلوم ہے تمھاری قوم نے تمھیں کیوں نظر انداز کر دیا ہے؟

ابن عباس کہتے ہیں کہ میں جواب نہیں دینا چاہتا تھا لہذا یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اگر میں نہیں جانتا ہوں تو آپ تو بخوبی واقف ہیں۔

عمر نے کہا کہ لوگ نبوت وخلافت کا اجتماع ایک گھرانے میں پسند نہیں کرتے تھے لہذا قریش نے خلافت کو اپنے لئے رکھ لیا اور اس میں کامیاب بھی ہو گئے۔

ابن عباس نے کہا کہ اچھا پھر اجازت ہو تو میں بھی کچھ کہوں؟

عمر نے اجازت دے دی تو فرمایا کہ آپ کا یہ کہنا کہ قریش نے اپنے لئے اختیار کیا اور کامیاب بھی رہے تو اگر قریش نے خدائی راستہ سے اختیار کیا ہوتا تو یقیناً کوئی رد نہ کر سکتا اور نہ حسد کی گنجائش ہوتی لیکن اگر اس نظریہ کی بنا پر ہمیں ناپسند کیا ہے کہ نبوت وخلافت کا اجتماع نہیں ہو سکتا ہے تو پروردگار نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ "یہ لوگ تنزیل خدا سے ناراض ہوتے ہیں اور اسے ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں لہذا ان کے سارے اعمال برباد کر دئے گئے۔

عمر نے کہا کہ افسوس ابن عباس تمھارے بارے میں بہت سی خبریں ملا کرتی تھیں لیکن میں یقین نہیں کرتا تھا کہ تمھاری منزلت ختم ہو جائے گی۔

فرمایا کہ اگر وہ باتیں صحیح تھیں تو آپ کا فیصلہ غلط تھا اور اگر غلط تھیں تو مجھ جیسا انسان

اپنی ذات سے باطل کا دفاع کر سکتا ہے۔

عمر نے کہا کہ میں نے سُنا ہے کہ تم یہ کہتے ہو کہ خلافت پر بربنائے حسد وظلم وبغاوت قبضہ کیا گیا ہے۔؟

فرمایا کہ ظلم تو جاہل و عالم سب پر واضح ہے۔ رہ گیا حسد تو ہم اولادِ آدم ہیں اور جب وہ محسود تھے تو ہم بھی محسود ہیں۔

عمر نے کہا کہ واللہ بنی ہاشم کے دلوں سے حسد نہیں نکل سکتا ہے۔

فرمایا، عمر! اس قوم کے بارے میں ایسی باتیں مت کہو جسے اللہ نے ہر رجس سے دور رکھا ہے اور حق طہارت کی منزل پر فائز کیا ہے۔

شعار عدم اجتماع سے آخری وفاداری

فاروق نے فقط اس بات پر اکتفا نہیں کی کہ "عدم اجتماع نبوت وخلافت" کے نعرہ کو حالات پر منطبق کر دیا جائے اور اسے عملاً برتری عطا کر دی جائے بلکہ اپنے بعد کے لئے بھی اس نعرہ کی برتری کا بندوبست کر دیا اور انھیں ساری فکر اسی بات کی تھی کہ حضرت علیؑ یا بنی ہاشم کا کوئی شخص کسی دور میں کسی سرکاری عہدہ تک نہ جانے پائے۔ چاہے وہ کسی قدر صاحب صلاحیت وامانت کیوں نہ ہو۔

حضرت علیؑ سے عبدالرحمٰن بن عوف کا یہ مطالبہ کہ کسی ہاشمی کو کوئی عہدہ نہ دیا جائے چاہے کسی قدر قوی اور امین کیوں نہ ہو"۔ ایجاد بندہ نہیں ہے بلکہ وصیت فاروق کا نفاذ ہے جو انھوں نے بستر مرگ سے ارشاد فرمائی تھی۔ مسعودی نے اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے جس کے بعض حصے یہ ہیں:

"حمص کے عامل کے مرنے کے بعد عمر نے ابن عباس کو طلب کیا اور انھیں ولایت دینا چاہی مگر پھر رائے بدل دی اور اس کا سبب خود فاروق کے الفاظ میں یہ تھا:

"ابن عباس! مجھے خطرہ ہے کہ مجھے موت آجائے اور تم عہدہ پر برقرار رہو اور پھر دوسروں کو بھی عہدہ دے دو جب کہ یہ صرف تمھارے لئے ہے"۔ (مروج الذہب ۲/۳۵۳-۳۵۴)

فاروق کا منشا یہ تھا کہ وہ دنیا سے مطمئن جائیں کہ کوئی بھی والی بنی ہاشم کو مدعو نہیں کرے گا اور نہ ان کی دعوتِ ریاست کی حمایت کرے گا۔ اسی لئے یہ قانون عام نافذ کر دیا کہ ہاشمی عہدہ دار نہیں ہو سکتا ہے چاہے وہ قوی اور امین ہی کیوں نہ ہو۔

درحقیقت یہ مذکورہ بالا نعرہ سے وفاداری کی انتہا ہے جہانتک قریش کا کوئی قبیلہ نہیں پہونچ سکتا تھا اور اس قسم کی پابندی دنیا کے کسی مسلمان پر عائد نہیں کی گئی ہے جو بنی ہاشم پر عائد کی گئی ہے۔ (صرف اس جرم میں کہ نبوت ان کے گھرانے میں آگئی تھی اور اس سے دوسرے قبائل محروم تھے۔ جوادی)

شعار اور امرِ الٰہی

ہم بار بار اظہار کر چکے ہیں کہ یہ نعرہ عہد جاہلیت کی صدائے بازگشت ہے اور نہ خدا و رسولؐ نے اس کا حکم دیا ہے اور نہ عقیدۂ اسلامی دور و نزدیک سے اسے قبول کرتا ہے۔ یہ سو فیصدی نصوص شرعیہ (قول و فعل و تقریر پیغمبرؐ) سے متصادم ہے اور ان تمام ارشادات کی ضد ہے جن میں حضرت علیؑ کو ولی اور مولا بنایا گیا ہے یا عترت و اہلبیتؑ سے تمسک کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور انھیں ثقلین میں قرار دیا گیا ہے۔ یا انھیں سفینۃ النجاۃ، حزب اللہ، امانِ امت کا درجہ دیا گیا ہے یا آلِ محمدؐ کے شرف ریاست کا تذکرہ کیا گیا ہے بلکہ ان پر صلوات کو نماز کا ایک فرضِ واجب قرار دیا گیا ہے۔

فاروق کے تمسکِ شعار کا سبب

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس نعرہ کی کوئی اسلامی حیثیت نہیں ہے تو حضرت فاروق اس سے کیوں چپکے ہوئے تھے؟

بات صرف یہ ہے کہ انھوں نے اس تقسیم کو بنی ہاشم اور دیگر قبائل کے درمیان ایک عادلانہ تقسیم فرض کر لیا تھا اور قریش کو اس تقسیم میں موفق قرار دے دیا تھا اور ان کا خیال تھا کہ بنی ہاشم نے خلافت میں ہاتھ لگا دیا تو گویا دوسروں کے حق میں ظلم کیا اور ظلم اسلام

میں روا نہیں ہے۔

پھر حضرت علیؑ کمسن بھی ہیں اور ان میں ولایتِ مسلمین کی صلاحیت نہیں ہے۔
لہٰذا اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کی خاطر وہ اس نعرہ سے چپک گئے اور اسی کو آگے بڑھاتے رہے چاہے ان کا یہ اجتہاد نصوص شریعت سے کسی قدر متصادم کیوں نہ ہو جائے۔
فاروق کا عمل آیات و روایات پر نہیں ہے ان کا عمل اپنی فکر اور اپنے اجتہاد پر ہے اور وہ اپنے اجتہاد کے آگے براہ راست قول پیغمبرؐ کو بھی ہذیان قرار دے سکتے ہیں۔
(مسلمان ہو تو ایسا ہو اور ہمت ہو تو ایسی ہو ورنہ انسان فاروق اعظم بننے کی فکر نہ کرے۔ جوادی)

فاروق کا موقف ولی خدا کے ساتھ

فاروق کو اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کا درد اس قدر کھائے جا رہا تھا کہ انھوں نے "دورِ رعیت" میں جب رسول اکرمؐ نے وصیت لکھنے کا ارادہ کیا اور دیکھا کہ یہ وصیت اسلام اور مسلمانوں کے لئے خطرہ ہے اور رسول اکرمؐ کچھ نہیں سمجھ رہے ہیں تو انھیں وصیت لکھنے سے روک دیا اور اپنے گرد مخالفین رسالت کا ایک گروہ جمع کر لیا جو مخالفتِ رسالت میں اس قدر آگے بڑھ گیا کہ حضور کے ہذیان گو ہونے کا نعرہ لگا دیا۔
پھر انھوں نے ہی خلافت کا سارا انتظام مرتب کیا اور حالات پر لمحہ بہ لمحہ نگاہ رکھے رہے۔ یہاں تک کہ تمام قریش اور تمام آل رسولؐ کی عدم موجودگی میں خلیفہ نامزد کر لیا اور یہ سب مسلمانوں کے مفادات کے تحت تھا کہ بنی ہاشم میں نبوت و خلافت جمع نہ ہونے پائے اور یہ "خدائی ظلم" قابلِ برداشت نہیں ہے۔ (علیؑ کو ولی خدا ہی نے بنایا ہے۔
"انما ولیکم اللہ و رسولہ والذین آمنوا . . . . . جوادی)
فاروق کسی ایسے کام میں تساہلی سے کام نہیں لیتے ہیں جس سے حکومت کا امن یا امت کا اتحاد خطرہ میں پڑ جائے۔ ان کی نظر میں یہ دونوں چیزیں ہر شے (بشمول قرآن و حدیث، خدا اور رسولؐ) سے بالاتر ہیں۔ وہ اگر یہ طے کر لیں کہ حکومت کا امن و امان یا امت کا اتحاد خانۂ رسالت سے خطرہ میں ہے تو وہ خانۂ رسالت کو بھی آگ لگا سکتے ہیں،

اس لئے کہ سرکاری قانون کی نگاہ میں سب یکساں ہیں اور دختر پیغمبرؐ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔
یہ اور بات ہے کہ انھوں نے ہی ابوبکر کو مشورہ دیا تھا کہ چل کر دختر پیغمبرؐ سے
معافی طلب کریں (اس لئے کہ دنیا کا کام نکل چکا ہے۔ اب چل کر عاقبت کی فکر کریں۔
اب وہاں کا امن وامان خطرہ میں ہے۔ جوادی)

فاروق بیعت سے انکار کرنے والوں کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں کر سکتے ہیں
چاہے وہ ولی خدا اور نفس پیغمبرؐ ہی کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی علیؑ نے بیعت سے
انکار کیا انھیں قتل کی دھمکی دے دی ــــ اور ساتھ ساتھ دوسروں کے مقابلہ میں یہ بھی
کہتے رہے کہ "علیؑ میرا، تمھارا اور ہر مومن ومومنہ کا ولی اور مولا ہے اور ان سے مشورہ
بھی کرتے رہے اور یہ اعلان بھی فرماتے رہے کہ خدا اس مشکل سے محفوظ رکھے جس کے
حل کرنے کے لئے ابوالحسنؑ موجود نہ ہوں"۔

فاروق نے ہی بنی ہاشم کے عہدہ نہ پانے کی شرط ایجاد کی ہے چاہے وہ قوی
اور امین ہی کیوں نہ ہوں اور اس کا نام قانون "سدّ ذرائع" رکھا ہے کہ اس طرح کہیں
نبوت وخلافت ایک خاندان میں نہ جمع ہو جائیں اور قریش پر یہ ظلم نہ ہو جائے ــــ یہ
اور بات ہے کہ آلِ محمدؐ کے وظیفہ کا سلسلہ بھی جاری رہا اور انھیں۔ بروایت بلاذری ــ
اولاد ابوبکر پر بھی مقدم رکھا جاتا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ فاروق کا "دین فہمی" کا اپنا ایک انداز اور اسلوب تھا اور وہ
اس کے اعلان میں کوئی تکلف نہیں فرماتے تھے اور اس راہ میں رسول اکرمؐ سے بھی
مقابلہ کر سکتے تھے" اور نفس رسولؐ کو بھی قتل کر سکتے تھے"۔

بلکہ کبھی کبھی تو نص قرآنی سے بھی ٹکرا جایا کرتے تھے کہ رب العالمین صدقات میں
آٹھ اقسام کو حصہ دار قرار دیتا ہے مگر وہ مولفۃ القلوب کے حصہ کو ساقط کر دیتے ہیں اور
اسے مال خدا کی بربادی قرار دیتے ہیں (گویا خدائی علم وعقل کو بھی چیلنج کر دیتے ہیں) کہ اب
اسلام باعزت ہو چکا ہے۔ نصرت نازل ہو چکی ہے اور مال کے ذریعہ تالیف قلوب کی کوئی
ضرورت نہیں ہے اور اس طرح ان کا حصہ ساقط کر دیا جاتا ہے اور انھیں خدائی حق سے

محروم کر دیا جاتا ہے اور ان کے اس اقدام کو عمل رسولؐ بھی روک نہیں سکتا ہے کہ سرکارؐ نے فتح و نصرت کے آجانے کے بعد بھی انھیں حصہ دیا ہے اور آیت قرآنی پر عمل کیا ہے۔

اسی طرح موصوف نے خمس آل محمدؐ کو ساقط کر دیا اور حج تمتع کے قانون کو بھی تبدیل کر دیا اور قانون طلاق جو رسول اکرمؐ اور ابوبکر کے دور میں الگ الگ تین طلاق کا تھا اسے بھی منسوخ کر دیا اور ایک ہی موقع پر تین طلاق کو تین بنا دیا تاکہ مسلمان ان کے خیال کے مطابق طلاق کو تماشا نہ بنا پائیں (اور حلالہ حضرات کی بن آئے)۔

فاروق ہمیشہ ایک آندھی کی طرح اُٹھتے تھے کہ ان کی راہ میں کوئی شے مانع نہیں ہو سکتی تھی اور وہ اپنے خیالی حق کا برملا اعلان کر دیتے تھے۔ زمانہ صدیق میں ہمیشہ ان کا کلام بالا ہوتا تھا اور وہ "احسان خلافت" کو مسلسل برداشت کرتے رہتے تھے۔

پھر اپنے دور میں بھی یہی شان برقرار رہی اور قریش بھی ان کے گوش بر آواز رہا کرتے تھے کہ انھیں بھی یہ احساس رہا کرتا تھا کہ بنی ہاشم میں نبوت و خلافت کے عدم اجتماع کا سارا کاروبار انھیں کا پھیلایا ہوا ہے ورنہ وہ نہ ہوتے تو کسی وقت بھی دونوں کا اجتماع ہو سکتا تھا۔

بنی امیہ میں بھی ہمیشہ ان کا قول مسموع رہا کہ انھوں نے یزید بن ابی سفیان کو قائد لشکر شام بنایا تھا اور معاویہ کو شام کی حکومت عطا کی تھی اور عملی طور پر عثمان کے حق میں وصیت کر دی تھی اگرچہ اس کا نام شوریٰ تھا۔

ان کی محبت قریش کے دلوں میں سمائی ہوئی تھی اور اسی وسیلہ سے سارے سماج میں سرایت کر گئی تھی اور اس کا سب سے بڑا سبب یہ قرار دیا گیا تھا کہ وہ خواہش پرست نہیں تھے۔

تباہی کا چوراہہ

صاحبانِ ایمان کے پیروں سے زمین نکل گئی جب یہ دیکھا کہ حضورؐ ابھی بستر مرگ پر ہیں اور تباہیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے اور ایک تباہی کے بعد دوسری تباہی سامنے آرہی

ہے اور اب یہ سلسلہ کہاں ختم ہوگا؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

شروع اس وقت ہوا جب حضورؐ کو وصیت نامہ لکھنے سے روک دیا گیا اور پھر انتقال کے فوراً بعد اس مقصد کے خلاف جو حضورؐ لکھنا چاہتے تھے اپنا کام مستحکم کر لیا گیا اور سارے قریش اور بنی ہاشم کی عدم موجودگی میں خلیفہ بنا لیا گیا اور پھر قوم کو ایک حکومت کا سامنا کرنا پڑا۔ جو قانون کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھی اور اس کے امور مکمل اور مستحکم ہو چکے تھے۔

حکومت اور حزب اختلاف

سقیفہ میں اقتدار سنبھالنے والے واقعی حکام کی شکل میں برآمد ہوئے کہ ان کے ہاتھ میں تمام طاقتوں کی کلید تھی اور ان کے امور مستحکم ہو چکے تھے۔ لوگ ان کی بیعت کر چکے تھے اور قوم انھیں مرجعیت اور امارت سپرد کر چکی تھی اور وہ ایک واقعی سلطنت اور حقیقی حکومت کا روپ دھار چکے تھے۔

ایسے وقت میں ولی خدا نے دیکھا کہ اب اپنے ساتھ قرآن[1] اور حق[2] کے علاوہ کوئی نہیں ہے کہ یہی دونوں اس کے ساتھ برابر چل رہے ہیں یا پھر ایک خدائی تقرر ہے کہ اس نے اسے ہادی[3] بنایا ہے اور اسے اختلافات میں بیان[4] واقع کا حق دیا ہے اور روز قیامت پیغمبرؐ کیساتھ حجت[5] کا درجہ دیا ہے اور انھیں وہ تمام منازل حاصل ہیں جو ہارون کو موسیٰ کے ساتھ حاصل

---

[1] مناقب خوارزمی ص ۱۱۰، معجم صغیر طبرانی ۱/ ۵۵، جامع صغیر ۲/ ۵۶، تاریخ الخلفاء ۲/ ۵۶۔

[2] تاریخ بغداد ۱۴/ ۳۲۱، ابن عساکر ۳/ ۱۱۹ حدیث نمبر ۱۱۶۲، غایۃ المرام ص ۵۳۹، منتخب کنز العمال ۵/ ۳۰ برحاشیہ مسند احمد۔

[3] تاریخ ابن عساکر ۲/ ۴۱۷ حاشیہ مسند احمد ۵/ ۴۳، تفسیر طبری ۱۳/ ۱۰۸، ابن کثیر ۲/ ۵۰۲، شوکانی ۳/ ۷۰، تفسیر رازی ۵/ ۲۷۱، مستدرک ۳/ ۱۲۹-۱۳۰، در منثور ۴/ ۴۵۔

[4] مناقب خوارزمی ص ۲۳۶، منتخب کنز العمال ۵/ ۳۳ برحاشیہ مسند احمد، تاریخ ابن عساکر ۲/ ۸۸ حدیث نمبر ۱۰۰۸-۱۰۰۹۔

[5] تاریخ ابن عساکر ۲/ ۲۷۳ حدیث نمبر ۷۹۳-۷۹۵، مسند احمد ۵/ ۹۴، مناقب ابن مغازلی، میزان ذہبی ۴/ ۱۲۸۔

تھے۔ صرف نبوت میں کوئی حصہ دار نہیں ہے۔

اس تنہائی کے عالم میں۔ کہ ساری طاقتیں چھن چکی ہیں۔ کوئی بات سننے والا نہیں ہے۔ ایک عام باشندہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دی جا رہی ہے۔ اپنے اہل خانہ اور بنی ہاشم کے علاوہ کوئی مددگار نہیں ہے اور انھیں بھی عرب کے مقابلہ نے توڑ کر رکھدیا ہے۔ زندگی گذارنا ولی خدا کی زندگی کا ایک معجزہ ہے۔

جس کے پیش کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اکثریت اسے قبول کر لے گی بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ حقیقی دین کے پہچاننے کا راستہ کھلا ہے اور حق و باطل واضح ہوتے رہیں۔

حزب اختلاف کے دو راستے

اب حزب اختلاف کے پاس دو ہی راستے تھے۔ یا کھل کر مقابلہ کریں یا مصالحت آمیز رویہ اختیار کریں۔

ظاہر ہے کہ مذکورہ حالات میں مقابلہ خودکشی کے مرادف تھا جس کے بعد دین بھی خطرہ میں پڑ سکتا ہے۔ زندگی تو بہر حال خطرہ میں ہے اور ذریت طیبہ کی ہلاکت کا بھی خطرہ ہے۔

لہذا ولی خدا نے مصالحت کا راستہ اختیار کیا اور خود ہی پہل بھی کی کہ نصیحت اور بیان احکام میں کسی طرح کا بخل نہیں فرمایا۔

امت کے دو راستے

خدا جانتا ہے کہ امت خواب غفلت میں پڑی ہوئی تھی اور اچانک آنکھ وفات پیغمبرؐ کے بعد ایک دہشت زدہ ماحول میں کھلی اور دو راستے نظر آئے۔۔

ایک طرف ایک مکمل حکومت ہے اور اس کے سربراہ پرانے پرانے صحابۂ کبار ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ وہ حق بجانب ہیں۔

اور دوسری طرف ایک محدود مقابلہ ہے جس کی قیادت ولی خدا کے ہاتھوں میں ہے لیکن اس کے پاس عترت پیغمبرؐ اور ان بنی ہاشم کے علاوہ کوئی نہیں ہے جنھوں نے

۲۳ سال عرب کا مقابلہ کیا ہے اور وہ بھی اپنے برحق ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔

● ۔ ایک گروہ نے سلامتی کو مقدم رکھا اور یہ دیکھ لیا کہ مقابلہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے تو حکومت کے ساتھ چل پڑا۔ اسے ولی نعمت تصور کیا اور ساری قوت و طاقت اس کے ہاتھ میں دے دی۔ اسے وحدت امت کا رمز قرار دیا اور جب معاویہ علیؑ کے مقابلہ میں کامیاب ہو گیا اور قانون طاقت سے شکست کھا گیا تو اس سال کا نام عام الجماعہ رکھدیا گیا اور اقتدار پرستوں کا لقب اہلسنت قرار پا گیا۔

اس گروہ کے مختلف حصے تھے لیکن ان کی تقسیم حکومت سے محبت اور وفاداری کی بنیاد پر تھی اور حزب اختلاف کے ساتھ ان کے تعلقات کے درجات بھی مختلف تھے۔ لیکن اکثریت کا موقف یہ تھا کہ سب صحابہ ہیں۔ سب جنتی ہیں۔ سب مجتہد ہیں اور مجتہد کو بہر حال اجر ملتا ہے چاہے صحیح کہے یا غلط۔

اس گروہ کو اس تصور نے مطمئن کر دیا تھا اور اس نے اپنے مقدر کو حکام کیساتھ وابستہ کر دیا تھا حکام سے ہر طرح کی ملامت کا دفاع کیا لیکن نہ ان کی محبت کی بنیاد پر بلکہ اپنے نفس کی سلامتی کی بنیاد پر۔ ورنہ حکام کا عیب عوام تک بھی سرایت کر جائے گا کہ انھوں نے ایسے حکام کی اطاعت کیوں کی ہے۔

ریاست حکومت کے بارے میں اس گروہ کا نظریہ یہ تھا کہ یہ غلبہ حاصل کر لینے والے کا حق ہے۔ لہٰذا یہ صرف اقتدار پرست ہیں اور ان کی دلیل حضرت عبد اللہ بن عمر کا ارشاد ہے جو انھوں نے بیعت یزید کے جواز میں پیش کیا تھا اور اب ریاست میں سوائے غلبہ کے کوئی شرط نہیں ہے۔

● ۔ دوسرا گروہ شیعہ حضرات کا تھا جنھوں نے رسول اکرمؐ کے بعد ولی خدا سے محبت کی اور اس بات پر ایمان لائے کہ حق ولی خدا کے ساتھ ہے اور اسی کے ساتھ گردش کرتا ہے۔ وہ قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن اس کے ساتھ ہے۔ اور اس ایمان کے ساتھ ولی خدا اور عترت رسولؐ کے ساتھ محبت کی اور رسول اکرمؐ کے اس ارشاد کی تصدیق کی کہ قرآن ثقل اکبر ہے اور عترت اہلبیتؑ

ثقل اصغر ہے اور ہدایت دونوں سے تمسک کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔

اہلبیت کا سربراہ ہی ہر دور کا امام ہوتا ہے اور اسی کو ولایت کا حق حاصل ہے۔
شیعہ اسی کے دوست کو دوست رکھتے ہیں اور اسی کے دشمن سے دشمنی رکھتے ہیں۔

ان سربراہانِ اہلبیتؑ کی تعداد بارہ[۱۲] ہے۔ شیعہ اس سلسلہ میں مکمل طور پر قانون الٰہی کے پابند ہیں اور ایک لمحہ کے لئے اس دائرہ سے نکلنا نہیں چاہتے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ امت امامِ اہلبیتؑ کی قیادت میں متحد ہو جس کا کام عقیدہ الٰہیہ کے احکام کا بیان کرنا اور اسے منطبق کرنا ہے اور جو اسلام کے اس پاکیزہ پیغام کی حامل ہے جس کے ذریعہ عالم انسانیت کو ظلمات سے نکال کر نور کی منزل تک لایا جائے گا۔

شیعوں کا راستہ انتہائی مصائب و آلام کا راستہ ہے اور انھیں رضائے الٰہی کے حصول کے لئے یہ ٹیکس بہرحال ادا کرنا ہے تاکہ اس خلعت ایمانی کے حقدار ہو جائیں جو سرکار دو عالمؐ نے انھیں اس وقت عنایت فرمایا ہے جب آیت کریمہ نازل ہوئی " ان الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت اولٰئك ھم خیر البریّة "۔ (فتح القدیر شوکانی ۵/ ۷۷ ۴، روح المعانی آلوسی ۳۰/ ۲۰۷، غایۃ المرام باب ۲۸ ص ۳۲۸، فرائد السمطین ۱/ ۱۵۶، مناقب خوارزمی ص ۶۲، ۱۸۷، فصول مہمہ ص ۱۰۷، ملحق المراجعات ص ۶۲)

اب چونکہ شیعہ حزب اختلاف میں شمار ہوتے ہیں لہٰذا وہ ہر دور میں اس حکومت کی شرعی حیثیت کو مشکوک قرار دیتے ہیں جس کا سربراہ اہلبیت نبوت سے تعلق نہ رکھتا ہو اور اسی بنیاد پر ہمیشہ حکومتوں کے سوء ظن کا مرکز رہے ہیں اور یہ کیفیت ایک دن عداوت کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس کا نتیجہ کینہ و حسد ہوتا ہے جو قوم اور حکومت کے درمیان چلتا رہتا ہے۔

شیعوں نے ہمیشہ یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ حکومت ظالم ہے اور اس نے حقدار سے اس کا حق چھین لیا ہے اور اپنے کو بزور طاقت قوم کے سر پر مسلط کر دیا ہے اور مسلمانوں کو واقعی احکام الٰہی کے استفادہ سے محروم کر دیا ہے۔ صرف اس لئے کہ اس کے دل میں جاہ پرستی اور طمع حکومت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ شیعوں کے وسائل انفرادی اور مخفی ہوتے ہیں عمومی وسائل ابلاغ

پر ہر دَور میں حکومتوں کا قبضہ رہا ہے اور انھوں نے ہمیشہ انھیں ان وسائل سے دور رکھا ہے اور تنگیوں اور سختیوں میں گرفتار کر رکھا ہے۔

اس کے مقابلہ میں حکومت نے سارے وسائل کو اپنی مٹھی میں بند کر رکھا ہے اور شیعوں کو اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی بھی اجازت نہیں دی ہے بلکہ جماعت سے خارج، مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے والا اور رافض، زندیق جیسے خطابات سے نوازا ہے۔

شیعوں کے بارے میں حکومت کا نظریہ ہر ایک کے لئے عام ہے اور اس کا اشتہار تمام ذرائع ابلاغ کر رہے ہیں اور اس کی ترویج وہ سارے "علماء کرام" کر رہے ہیں جنھیں حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اور اس طرح تشیع کو بدترین صورت میں پیش کیا جا رہا ہے اور امت اور شیعہ کے درمیان وسیع ترین خلیج قائم کی جا رہی ہے اور نسلیں اسی انداز سے چل رہی ہیں کہ ہر آنے والی نسل یہ تصوّر کرتی ہے کہ یہ سارے الزامات اور تصوّرات صحیح ہیں اور شیعہ واقعاً ایسے ہیں اور پھر اسی تصوّر کو وہ بھی آگے بڑھا دیتی ہے اور اسی تار پر اس کا بھی رقص شروع ہو جاتا ہے۔

شیعہ ان تمام حالات میں صابر، مصیبت زدہ اور اپنے معاملات کو پروردگار کے حوالہ کرنے والے رہے ہیں اور اس امید پر جیتے رہے کہ وہ دن دور نہیں ہے جب حقائق کا انکشاف ہو جائے اور دنیا کی آنکھیں کھُل جائیں۔

قریب ہے یار و روزِ محشر چھُپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا